دار الاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن ۹۱

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی

شرکاء

سید محمد ایم اے
عمر یافعی

مجلۂ مکتبہ

...REGD. 195

یہ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی وادبی رسالہ ہے جس میں علم وادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ۱ر) فی پرچہ ٦ر

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کیلئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ۱۲ر ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے ۵۰ فیصدی تک کمی ہوسکے گی۔

ترسیل زر ومضامین اور جملہ خط وکتابت بنام منتظم مجلۂ مکتبہ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجیے۔

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلیشیہ
(۰۰۰۰۰۰)

۱
۴۸۶
۴۹۲

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ
(۶۵)

مجلہ مکتبہ

جلد (۴) بابتہ ماہ آذر ۱۳۳۹ف م اکتوبر ۱۹۲۹ع نمبر (۱)

تصاویر

(۱) علی عادل شاہ ثانی (۲) قطعہ (۳) سید مظفر علی خان آسیر (۴) احمد نواز جنگ بہادر فانی مرحوم

فہرست مضامین

شذرات

چوتھی جلد کے آغاز سے مجلہ مکتبہ میں جو صوری اور معنوی تبدیلیاں کی گئی ہیں وہ امید ہے کہ ناظرین کی پسندیدگی حاصل کریں گی۔ شکر ہے کہ مجلہ مکتبہ اپنی زندگی کی تین منزلیں ختم کر کے چوتھی منزل میں قدم رکھنے کے قابل ہوا ہے اور اگرچہ عامیانہ مذاق کی اس میں کوئی چیز نہیں تاہم موجودہ عامیانہ مذاق کے طوفان بے تمیزی کے باوجود مجلہ مکتبہ خاص و عام میں ایک خاص مقبولیت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہم منفعل ہیں کہ اپنے ارادوں کے موافق کام نہ کر سکے لیکن گذشتہ جلد کے مضامین کی فہرست پر جو اس نمبر کے ساتھ منسلک ہے ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ باوجود کئی طرح کی دشواریوں کے مجلہ مکتبہ نے پچھلے چھ مہینے میں جو مواد پیش کیا ہے اور جس قسم کی خدمت اردو ادب کی انجام دی ہے وہ اگر ستائش کی مستحق نہیں نہ سہی! توفیق ایزدی شامل حال رہے تو چوتھی ششماہی کا کام سابق سے زیادہ قابل قدر ہو سکے گا۔

بادۂ دکن کے عنوان۔۔ دکن کے مشاہیر شعرائے قدیم کے جواہر ریزوں کو جو ہماری غفلت سے طاق نسیاں کی زینت بنے ہوئے تھے اجاگر کرنے کی جو سعی کی جا رہی ہے اس کو اہل ذوق نے بے حد پسند کیا اور اگرچہ بعض سہل پسند قارئین نے اس کا خیر مقدم کرنے میں کوتاہی کی اور بعضوں نے اس کو طرح طرح کے مخالفانہ رنگوں میں پیش کیا لیکن سنجیدہ مذاق اور صاحب ذوق حضرات سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ دکن کے قدیم ادبی دوروں میں کوئی عہد بھی اعلیٰ پیداوار سے خالی نہیں اور نہ صرف قطب شاہی اور عادل شاہی زمانے کی شعر و شاعری اس قابل ہے کہ اس کی تحقیق و تلاش کی جائے بلکہ آصف جاہی عہد کے آغاز سے لیکر موجودہ زمانے تک کے دکنی شاعروں کے کارنامے ہر طرح کی قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔۔ نہ صرف ادب بلکہ ہر شعبہ زندگی میں ہم اپنے ماضی کو سرے سے فراموش کر کے ترقی کرنے کی امید نہیں کر سکتے۔ ہر دور اپنے سابق دور کا براہ راست نتیجہ اور پیداوار ہوتا ہے۔ ماضی سے ہماری غفلت ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ ہمارا موجودہ ادبی دور ترقی و تعالی کے رجحانات سے دور اور پست درجہ کا ہے۔ اگر ہم اپنے ماضی سے وابستہ ہوتے اور اس کو آئینہ فردا بناتے تو ہمارے متاخر ادیبوں کے کارنامے زیادہ رفیع اور مستحکم بالشان ہوتے ہم صاف طور پر اس کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ بادۂ دکن کے عنوان سے محض یہ مقصد ہے کہ دکن کے قدیم شاعروں میں جو اعلیٰ پایہ ہستیاں گزری ہیں ان کے صحیح حالات اور کارنامے ارباب ذوق کے آگے پیش کریں اور ان اوراق پارینہ سے جو بیش بہا دولت ادب برآمد کی جا سکتی ہے اس کو منظر عام پر لے آئیں۔ اس نمبر سے یہ اہتمام کیا جا رہا ہے کہ جس شاعر کو پیش کیا جائے اس کے متعلق تمام مواد ایک ہی نمبر میں ختم ہو جائے تا کہ ایک ہی وقت میں اس کا بیان مکمل ہو۔

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور باوجود پیرانہ سالی اور خرابی صحت کے ادب کی خدمت گزاری میں نوجوانوں کی مستعدی رکھتے ہیں ایک عرصے سے آپ کی صحت اس کی اجازت نہیں دے رہی ہے کہ آپ بیرون ہند جا کر اپنے گراں بہا لکچروں سے یورپ کو مستفید کریں تاہم آپ نے اس کا ارادہ فسخ نہیں کیا۔ آئندہ موسم بہار میں یورپ جانے والے ہیں۔ فرانس جرمنی اور انگلستان کی جامعات اور علمی مجلسوں کی دعوت پر مسلسل کئی تقاریر کریں گے۔ آج کل آپ کلکتے میں مقیم ہیں مگر یہاں بھی ایک ایسی تصنیف میں مشغول ہیں جو اگر جلد مکمل ہو جائے تو یقین ہے

کہ اس سال کے شہ کاروں میں بیش قیمت اضافہ ہوگی یہ ایک تاریخی ڈرامہ ہے اور ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ اس کے پایہ تکمیل کو پہنچنے کے بعد اپنی نگرانی میں اسٹیج بھی کریں۔ آپ سے بنگال کی ادبی کانفرنس کی صدارت کرنے کی بھی استدعا کی گئی ہے۔ حکومت بڑودہ نے بھی ایک سلسلہ تقاریر کے لئے مدعو کیا ہے۔ جوان ہمت بوڑھے ڈاکٹر نے ان کاموں کی تکمیل کا ارادہ کر لیا ہے۔ خدا کرے کہ ان کے ارادے پورے ہوں اور ہندوستان کے اس مشہور عالم ادیب کے فیوض سے صاحبان ادب خاطر خواہ استفادہ کریں۔

یورپ اور امریکہ اپنی روزافزوں ترقی اور شائستگی سے تعلیم میں جو نئی نئی تحریکیں اور تجربے کر رہے ہیں وہ ہندوستان جیسے دور دست اور غیر ترقی یافتہ ملک میں بڑے تعجب کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سینما فلم کے ذریعے تعلیم و تربیت کے انصرام کی ایک عرصے سے کوشش کی جا رہی ہے اب یورپ کے تعلیمی اور علمی صحایف میں یہ اطلاع شایع ہوی ہے کہ مسٹر ولیم فاکس جو امریکہ میں فلموں کے مالک التجار ہیں تعلیم میں ایک انقلاب عظیم کی سعی کر رہے ہیں۔ وہ اٹھارہ لاکھ پونڈ کے سرمایہ سے آیندہ پچیس برس میں بولنے والی فلموں کے ذریعہ زبانی تعلیم جاری کرانے کا کام کریں گے انھوں نے کئی ماہرین تعلیم کو ترسیمی اسباق دینے کے لئے مامور کر رکھا ہے اور وہ باور کرتے ہیں کہ اس طریقہ سے مدرسہ کا آدھا وقت بچ سکتا ہے۔ جغرافیہ کی تعلیم کیلئے ان کا مجوزہ طریقہ خاص طور پر موزوں ہے کیونکہ زبانی تعلیم کے ساتھ زیر مطالعہ ممالک کی حقیقی تصویریں بھی دکھائی جائنگی۔ ابھی اُن کے تجربات کو برطانوی ماہرین تعلیم نے قبول نہیں کیا بلکہ ان کا تو یہ خیال ہے کہ یہ بولنے والی فلمیں ہمارے ملک میں تعلیمی گراموفون ریکارڈوں سے زیادہ مقبولیت حاصل نہ کریں گی۔ بعض دیہات میں سینما کے ذریعہ تعلیم دینے کی کوششیں کی گئی تھیں مگر ناکام ثابت ہوئیں۔ برطانوی ماہرین تعلیم کو اس طریقہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ بولنے والی فلم کی تعلیم کے مصارف کثیر کے علاوہ یہ طریقہ انفرادیت کو تباہ کر دیگا اور بچوں کو احدی بنا کر اندھیرے میں بٹھا رکھے گا حالانکہ تعلیم جدید کا تمام تر رجحان جہاں تک ہو سکے دھوپ اور کھلی ہوا مہیا کرنے کی طرف ہے۔

کچھ روز قبل دہلی میں بین الجامعاتی کانفرنس کی دوسری میقات منعقد ہوی تھی۔ ہز اکسلنسی لارڈ ارون نے اس کا افتتاح کرتے ہوے جو شاندار خطبہ دیا اور جامعات ہند کو جو مفید مشورے اور اعلیٰ ہدایتیں کی ہیں وہ امید کرنی چاہیے کہ ارباب جامعات ہند کے گوش گزار ہو کر نہایت عمدہ نتایج پیدا کریں گی۔ ہندوستان کی جامعات کے باہمی تعلقات جو مجلس بین الجامعات کی صورت میں متشکل ہوے ہیں یہ اسی کے پسندیدہ ثمرات ہیں کہ اب ہماری جامعات ایسے متعدد مسائل پر جو سب پر یکساں یا کم و بیش اثر انداز ہوتے ہیں باہمی غور و خوض اور حل کرنے کی کوشش کرنے لگی ہیں۔ اس وقت اس مجلس کی (۱۸) ہندوستانی یونیورسٹیاں رکن ہیں۔ دوسری کانفرنس میں جو مجلس کے زیر اہتمام منعقد ہوی بہت سے ایسے مسایل پیش ہوے جن کا تعلق تقریباً تمام یونیورسٹیوں سے ہے ایسے مسایل میں خاص طور پر قابل ذکر بے روزگاری اور جامعات، بین الجامعاتی تعلیم میں ورزش جسمانی اور فوجی نصاب کی شرکت، ہندوستانی جامعات کی طبی اسناد اور انکی قدر شناسی اور جامعاتی اور ثانوی تعلیم کا تعلق ہیں۔ کانفرنس کے اراکین نے ان ضروری اور اہم مباحث پر غور کیا اور متعدد قراردادیں پاس کیں۔ اگر متعلقہ جماعتیں اور خود جامعات ان قراردادوں کو عملی جامہ پہنائیں تو بہت جلد ہماری رفتار ترقی دگنی ہو جائیگی۔ مسئلہ بے روزگاری اور جامعات کے نسبت کانفرنس نے یہ سفارش کی ہے کہ ہر ایک جامعہ اپنے طیلسانیوں

اور تعلیم یافتوں میں ملازم اور غیر ملازم افراد کی تعداد انکی ملازمتوں اور پیشوں کی نوعیت وغیرہ کے اعداد و شمار فراہم کرکے مجلس بین الجامعات میں ارسال کرے جہاں اس پر غور و خوض کے بعد کوئی مناسب تجویز نکالی جائیگی یہ مسئلہ آج کل جیسا اہم ہوتا جارہا ہے اسکے مدنظر اس کی تعمیل فوری چاہئے تاکہ موصولہ مواد پر غور کرکے ایسی تجویزیں نکالی جائیں کہ ہماری یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ مختلف شعبہ جات زندگی کے اہل ثابت ہوں اور حکومت ملک اور اپنے لئے بار نہ بنیں۔

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر اس کانفرنس میں جامعہ عثمانیہ کی طرف سے نمایندہ تھے۔ آپ نے اپنی تقریر میں ملکی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی پرزور حمایت کی اور اس سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ کی شاندار کامیابی اور اردو کے ذریعہ علوم و فنون جدید کی تعلیم دینے کی عملی مثال پیش کی۔ اس سلسلے میں جامعہ عثمانیہ کی تیار کرائی ہوئی کتابوں اور انکے ساتھ دائرۃ المعارف کی مطبوعات کی نمائش بھی کی گئی دہلی کے قدیم دفتر معتمدین کے پاس ایک شاندار شامیانہ میں یہ علمی فتوحات رکھی گئی تھیں۔ مولوی عبدالرحمن خانصاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ جو اس کانفرنس میں نمایندہ جامعہ عثمانیہ کی حیثیت سے شریک تھے اور مولوی عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ اور خود نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے لارڈ اروان وایسرائے ہند اور کانفرنس کے تمام ممتاز ارکان کو ان کتابوں کی سیر کرائی۔

اس نمبر میں چار تصاویر شایع کی جارہی ہیں۔ پہلی سلطان علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ کی ہے یہ عادل شاہی بادشاہان بیجاپور میں اردو شاعری کا سب سے زیادہ سرپرست بادشاہ گزرا ہے اسکے عہد حکومت میں اردو شاعری نے بڑی ترقی کی سب سے پہلے اسی نے اردو گو شاعر نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا وہ خود بھی اردو کا شاعر تھا اور شاہی تخلص کرتا تھا۔ معاصر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ابوالمعالی نام ایک شخص اس کا کلام جمع کرنے پر مامور تھا اس وقت تک اس کا کلام کہیں دریافت نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے پی ایچ ڈی (لندن) کو اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں ایک بیاض میں دو مرثیے ملے ہیں جنکا مصنف شاہی ہے ممکن ہے کہ یہ اسی کے افکار طبع سے ہوں۔ اس بیاض میں دوسرے عادل شاہی شاعروں کے مراثی بھی ہیں اس کے عہد کے دکھنی شاعروں میں نصرتی کے علاوہ جو قصیدہ غزل اور رزم و بزم کی مثنویاں لکھنے میں بڑا مسلم الثبوت استاد تھا شاہ ملک امین ہاشمی مرزا اور ایاغی مشہور ہیں۔

دوسری تصویر قطب شاہی عہد کے مشہور خطاط زین الدین علی کے خفی و جلی نسخ خط کی ایک وصلی ہے۔ خطاط نے بادشاہ کی کہی غزل لکھی ہے اور ایسی دیدہ زیب ہے کہ باوجود کہنگی کے نظر کو طراوت بخشتی ہے اسکے اصل کیلئے ہم مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ کے ممنون ہیں۔

تیسری تصویر منشی مظفر علی خاں اسیر مرحوم کی ہے جس کے ساتھ تفصیلی مضمون بھی ہے چوتھی تصویر مولوی محمد احمد صاحب (نواب احمد نواز جنگ بہادر) فانی مرحوم کی ہے یہ حیدرآباد کے ایک مشہور شاعر اور معزز کمیٹی صرف خاص مبارک کے معتمد تھے انکی متعدد غزلیں شمالی ہند اور دکن کے علمی رسالوں اور گلدستوں میں شایع ہوئی ہیں۔ مجلہ مکتبہ میں ان کا کلام اکثر ان کے فرزند مولوی عبدالباقی صاحب ام اے سے لیکر شایع کیا گیا ہے۔ مرحوم کے لایق فرزند ان کا کلام ترتیب دے رہے ہیں اور قریب میں یہ ادبی تحفہ اہل ذوق حضرات کے آگے پیش کیا جائے گا۔

چاند کی سیر

چاند میں کس قسم کی زندگی پائی جاتی ہے

(از جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی۔ اے)

قدیم زمانہ ہی سے انسان کو چاند سورج اور دیگر سیاروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق رہا ہے بالخصوص ازمنۂ ماضیہ کے عرب اس فن میں کمال رکھتے تھے اور ان کی سادہ آنکھ وہ سب کچھ دیکھتی تھی جس کو آج دوربین سے دیکھا جاتا ہے تاہم خالی آنکھ اور دوربین میں بہت بڑا فرق ہے! بہرحال پہلے زمانہ کے لوگوں کو علم ہیئت سے خاص شغف تھا چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے بے شمار اعلیٰ تحقیقات کا سنگ بنیاد رکھا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے یہاں یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ قدیم زمانہ کے لوگ بہت زیادہ توہم پرست واقع ہوے تھے، چاند اور سورج کے فواید سے مرعوب ہو کر انھوں نے پہلے پہل انھیں پوجنا شروع کر دیا۔ ان کی توہم پرستی کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص اُن کے مذہبی عقاید (خواہ وہ کس قدر بوسیدہ ہی کیوں نہ ہوں) کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالتا تو لوگ اُسے موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے چنانچہ مثال کی طور پر یونان کے فلسفی انگزیگورس کا واقعہ سن لیجئے۔ ایک دفعہ جب اس نے یہ بیان کیا کہ چاند فی الحقیقت کوئی دیوتا نہیں ہے بلکہ سورج اور دیگر اجرام سماوی کی طرح وہ بھی ایک سیارہ ہے تو یونان کی دنیا اس کے خلاف ہو گئی اور اس جرم کی سزا میں اس کے لئے موت کا فتویٰ صادر ہوا اگرچہ اس کے دوست پرکلیس نے اس کی حد درجہ طرفداری کی تاہم اُسے بھاگتے ہی بنی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ چاند سورج کے حالات معلوم کرنے میں حد درجہ دلچسپی لیتے تھے مگر اعتقاد کی کمزوری نے انھیں اپنی معلومات میں اضافہ کرنے سے محروم کر دیا اسی وجہ سے اس علم میں نمایاں ترقی نہ ہو سکی۔ بعد میں چل کر لوگوں نے اپنے اعتقادات کی کمزوریوں کو محسوس کیا اور رفتہ رفتہ چاند اور سورج کے متعلق مفید معلومات حاصل کیجانے لگیں اور آج ہم اپنی تحقیقات کی بنا پر چاند اور سورج کا ایک سرسری خاکہ کھینچ سکتے ہیں۔

چاند کے متعلق مختلف دور کے لوگوں کے مختلف خیالات ہیں، انگزیگورس کا خیال تھا کہ چاند نہ صرف ایک جرم سماوی ہی ہے بلکہ ایک ایسی دنیا بھی ہے جہاں ہم جیسے انسان بود و باش کیا کرتے ہیں، یہ غلط ہے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ "چاند ایک مردہ دنیا ہے" بلکہ وہاں ایک دوسرے قسم کی زندگی پائی جاتی ہے اسکے بہت زمانہ بعد جان ولکن (۱۶۱۴ تا ۱۶۷۲ء) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چاند مردہ دنیا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی زندگی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس زمانہ میں ہوائی جہاز یا غبارہ وغیرہ کا سان و گمان بھی نہ تھا تاہم اس نے

یہ پیشین گوئی کی تھی کہ انسان نہ صرف جہازوں میں بیٹھ کر سمندروں کو پار کریں گے بلکہ وہ دن قریب آنے والا ہے جبکہ لوگ ہوائی سواریوں میں بیٹھ کر فضا میں چکر لگایا کریں گے اور چاند کا بھی سفر کیا کریں گے۔ جرمنی کے ماہر علم ہیت نے ایک صدی قبل اپنے خیال کو اس طرح پر ظاہر کیا تھا کہ چاند میں ہم جیسے ذی روح آباد ہیں ان میں اور ہم میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے فی الوقت نہ تو ہم اس خیال کو غلط ٹھیراتے ہیں اور نہ اس کو بالکلیہ صحیح تصور کرتے ہیں، اس کی تو ہم آگے چل کر تصدیق کریں گے مگر شیرو ٹر کے متعلق تو اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی معمولی اور بھدی دوربین سے مدد لیکر چند بیش بہا اور کار آمد نتائج اخذ کئے ہیں اور بعض صورتوں میں تو وہ ہماری رہبری کرتے ہیں۔ مختلف علما نے اس قسم کے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن جب تک کہ ہم خود اس کی تحقیق نہ کرلیں کوئی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تحقیق کس اصول کی تحت کرنی چاہیئے۔ چاند کے متعلق وہاں جاکر ہم راست طور پر تو کوئی معلومات حاصل نہیں کرسکتے نہ ہماری موجودہ قوتیں اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان مہم کو سر کرسکیں ہم جو کچھ کرسکتے ہیں وہ یہ کہ موجودہ ذرائع علم کی مدد سے چاند کے طبعی حالات کا مطالعہ کرکے نتائج مستنبط کریں اور پھر دیکھیں کہ یہ حالات کہاں تک حیات انسانی کے ممد یا منافی ہیں اس سے ہم بخوبی اندازہ لگاسکیں گے کہ آیا چاند میں حیات انسانی یا کسی اور قسم کی زندگی کا امکان ہے بھی کہ نہیں!

چاند کے طبعی حالات

خالی آنکھ سے بھی اگر ہم چاند کا مشاہدہ کریں تو ہمیں اس پر چند سیاہ دھبّے دکھائی دیتے ہیں۔ گلیلیو اور کیپلر دونوں نے ان کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں سے بعض دھبّے سمندروں اور بعض پہاڑوں کو تعبیر کرتے ہیں اگرچہ چاند ہمارے کرۂ ارض کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے لیکن اس پر ایسے بلند اور عظیم الشان پہاڑ واقع ہیں کہ کرۂ ارض کا بلند سے بلند پہاڑ بھی ان کی ہمسری کا دعوےٰ نہیں کرسکتا۔ چاند کے پہاڑوں کی چوٹیاں ہندوستان کے سر بفلک پہاڑ ہمالیہ اور امریکہ کے سب سے اونچے پہاڑ ناک کنلے کی چوٹیوں سے کہیں زیادہ بلند ہیں، اگر ایورسٹ کی چوٹی تیس ہزار فٹ بلند ہے تو چاند کے پہاڑوں کی چوٹیوں کی بلندی ۳۶ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ چاند میں ایسے تقریباً چالیس سے زیادہ پہاڑ موجود ہیں ان پہاڑوں کے متعلق فلیمورین لکھتا ہے کہ "یہ ابدی روشنی کے پہاڑ ہیں" کیونکہ ان کی چوٹیاں اس قدر بلند ہیں کہ ان پر ہمیشہ روشنی رہا کرتی ہے۔ پہاڑی سلسلہ چاند گہن کے موقع پر نہایت درجہ وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے یہ کوہستانی زنجیرے دور دور تک پھیلے ہوے ہیں اور اکثر صورتوں میں ایک وسیع میدان کو گھیرتے ہیں ایسے میدانوں کو فصیل دار میدان کہا جاتا ہے۔ ان ہی فصیل دار میدانوں میں سے ایک میدان کلے ویس ہے جس کا طول ۱۴۳ میل اور رقبہ ۱۶ ہزار مربع میل ہے۔ بلندی سترہ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ کلے ویس سے ہٹ کر ایک دوسرا فصیلدار میدان ہے جس کا نام ٹائیکو ہے اس کا قطر ۵۴ میل اور بلندی، ا ہزار فٹ ہے

اس سے منور شعاعیں نکلتی ہیں جو بدر کے وقت دکھائی دیتی ہیں ان دو کے علاوہ کئی اور فصیلدار میدان ہیں مثلاً گسنڈی۔ کوپرنیکس۔ افلاطون، ہیرو ڈوٹس اور ارسطو وغیرہ پروفیسر پکرنگ کے بیان کے مطابق نظر آنے والے پہاڑوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہے۔

یہ چاند کے ایک رُخ کا حال تھا۔ دوسرے رُخ کے متعلق ہم کچھ ایسا زیادہ نہیں جانتے اس لئے کہ ہم چاند کے صرف ایک ہی حصہ کو دیکھ سکتے ہیں کیونکہ چاند کا صرف ایک ہی رُخ زمین کی جانب رہتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ جتنی مدت میں چاند اپنے محور کے گرد گھومتا ہے اتنی ہی مدت میں وہ زمین کی اطراف گردش لگا لیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا صرف ایک ہی حصہ ہماری جانب رہتا ہے اور دوسرے حصے کا ۱۸ فی صدی حصہ کبھی کبھی ہمارے سامنے آجاتا ہے بنا بریں چاند کے دوسرے رُخ کے متعلق ہم تفصیلی معلومات پیش نہیں کر سکتے۔

چاند سے نکلنے والی جُوالا مکھی شعاعیں

طاقتور دوربین سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ چاند کی سطح سے مختلف قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں ان شعاعوں کو جوالا مکھی شعاعیں کہا جاتا ہے پروفیسر پکرنگ نے یہ بتلایا کہ ٹائیچو سے نکلنے والی شعاعیں سفید ہوتی ہیں ان کو معمولی دوربین سے بھی دیکھا جا سکتا ہے بدر کے روز تو خالی آنکھ سے بھی وہ شعاعیں نظر آتی ہیں۔ کوپرنیکس سے نکلنے والی شعاعیں زرد ہوتی ہیں ٹائیچو کی اطراف ایک ہالہ ہوتا ہے اور کوپرنیکس کی اطراف کچھ بھی نہیں۔ یہ اختلاف آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہے۔

بحر کرائسس کے مغرب میں ایک منور کاس (crater) پراکلس نظر آتا ہے یہ بہت آب و تاب سے چمکتا ہے اور اس میں انعکاسی طاقت بھی بہت زیادہ ہے۔ انعکاس برف یا کہر کی وجہ سے ہوتا ہے پروفیسر پکرنگ نے کاسِ تھیافلس کے ڈھلوان پر چند سفید دھبے مشاہدہ کئے جو قمری مہینے کے پہلے ۹ دن تک نظر آتے ہیں۔ ان کے متعلق وہ کہتا ہے "چاند کی احتیاط کے ساتھ تحقیق کرنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تقریباً چاند کے اندر کے نصف سے زیادہ کئوس کے اندرونی ڈھلوان پر سفید دھبے دکھائی دیتے ہیں ان کی اصل وجہ برف کی موجودگی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ چاند پر آبی بخارات ہوں گے جس کی وجہ سے زراعت کا امکان درست معلوم ہوتا ہے"۔

لیکن دیگر ماہرین علم ہیئت اس بات کو غلط ٹھیراتے ہیں چنانچہ پروفیسر ایچ اسپنسر جونز نے اپنے ایک مضمون "عام فہم علم ہیئت" میں اس خیال کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے نیز ایک دوسرا ماہر علم ہیئت جس کی شخصیت مسلم ہے کسی قدر خود رائی کے طور پر بیان کرتا ہے کہ "ہم تمام (؟) ماہرین علم ہیئت اس بات پر متفق ہیں کہ چاند میں لازمی طور پر کوئی زندگی نہیں پائی جاتی، وہ ایک ایسی دنیا ہے کہ جس میں نہ تو زراعت ہی ہو سکتی ہے اور نہ ہوا ہی کا وہاں وجود ہے۔ بقول ایک عالم کے چاند ایک ایسی دنیا ہے جہاں نہ تو کوئی موسم ہے اور نہ کسی جاندار شئے کا وجود" برخلاف اس کے

پروفیسر پکرنگ جن کی زندگی کا بیشتر حصہ چاند کی تحقیقات میں گزرا ہے اس خیال کے خلاف ہیں اور اپنی تحقیقات کی بناء پر اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ چاند میں زندگی پائی جاتی ہے۔ پروفیسر کیمیلی فلیموریِن مشہور ماہر علم ہئیت پروفیسر موصوف کا ہم نوا ہے وہ لکھتا ہے کہ "پروفیسر پکرنگ کا خیال درست ہے کہ علم المناظر کی ارتقائی صورت ماہرین علم ہئیت کو آگاہ کردیگی کہ آیا چاند میں زندگی موجود ہے یا وہ ایک مردہ دُنیا ہے، چاند کو اب تک ایک برفانی دُنیا خیال کیا جاتا تھا..... پروفیسر پکرنگ کی طرح میں نے بھی کئی ایک تجربے کئے اور چاند کی بے شمار تصویریں لیں جن کے گہرے مطالعہ سے نباتات کی موجودگی کا پتہ چلا اس کی سطح پر بے شمار سیاہ دھبے دکھائی دیتے ہیں جن سے ہم اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ چاند میں بڑے زبردست جنگل ہوں گے ..... یہ ممکن ہے کہ وہاں حیوانی زندگی کا وجود نہ ہو تاہم ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو حیوانی زندگی کا منافی ہو"

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ طبعی حالات کو معلوم کرکے کس طرح قیاسات قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم اور دیگر طبعی حالات بیان کرکے کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کریں گے۔

جہاں حیات انسانی کیلئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ پانی ۲۔ تپش ۳۔ کرۂ ہوائیہ

اب ہم طبعی حالات کی تحت اس امر کا اندازہ لگائیں گے کہ آیا یہ لوازمات زندگی وہاں دستیاب ہوتے بھی ہیں کہ نہیں اگر ہوتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم چاند کو ایک مردہ دنیا تصور کریں۔

چاند پر کے منور دھبے

یوں تو چاند پر بے شمار سفید اور منور دھبے دکھائی دیتے ہیں لیکن سب سے زیادہ منور دھبہ ارسطارکس ہے جو طوفانی سمندر کے بازو واقع ہے اس کا قطرہ ۲۱ میل ہے وہ کھریا کی مانند سفید اور بے حد منور ہے۔ اس کی روشنی آنکھوں کو چکا چوند کردیتی ہے اس کے منور ہونے کے دو وجوہات ہو سکتے ہیں (۱) یا تو اس حصہ میں برف ہے (۲) یا اس حصہ میں زبردست انعکاسی طاقت کا گار پتھر موجود ہے لیکن پروفیسر آر ڈبلیو وُوڈ نے اس کا [illegible] حاصل کرکے یہ معلوم کیا ہے کہ نہ تو اس میں برف ہے اور نہ گار پتھر بلکہ گندھک ہے۔

اب رہا یہ سوال باقی کہ اگر ارسطارکس میں گندھک ہے تو آخر وہاں برف بھی موجود ہے کہ نہیں؟ اکثر ہئیت داں اس بات پر اتفاق نہیں کرتے کہ چاند میں پانی موجود ہے اس لئے کہ چاند کی سطح پر بادل کی علامات مفقود ہیں۔ یہ سچ ہے لیکن بعض کنوئں کے مخروطات پر سفید کُہر نظر آتا ہے یہ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کی سطح سے آبی بخارات تو نکلتے ہیں لیکن کچھ تو دھوپ کی شدت اور کچھ دن کے لانبا ہونے کے باعث اُڑ جاتے ہیں۔

یا رات کے لمبے ہونے کی وجہ سے جم جاتے ہیں اس میں تو کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ چاند کی سطح پر برف موجود ہے کیونکہ اس کے اکثر حصے نہایت ہی آب و تاب سے چمکتے ہیں۔ کپلر نے پہلی مرتبہ یہ بتایا کہ چاند کی سطح پر پانی برف کی صورت میں موجود ہوتا ہے جو ۳۵۴ یوم کی قمری رات کے دوران میں جم جاتا ہے۔ ایم ڈی نان وائلی کا خیال ہے کہ نہ صرف پانی بلکہ ہوا بھی جم جاتی ہے پروفیسر پکرنگ نے چاند پر برفانی طوفان کے مظاہر مشاہدہ کیے ہیں اس کا بیان ہے کہ زمین کی طرح وہاں برف گرتی نہیں بلکہ برف فشانی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض کنوئیں سے جو گیاسیں نکلتی ہیں برف کے ننھے ننھے قلموں کی شکل میں جم جاتی ہیں اور کنوئیں کی اطراف گردش کرنے لگتی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ اب برفانی رقبہ کچھ ایسا زیادہ وسیع نہیں ہے بلکہ چاند کے قطبی منطقوں میں برف کے نشان پائے جاتے ہیں جہاں پر زراعت نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ ان بیانات کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ چاند کی سطح پر برف کا وجود ضرور ہے۔

قمری نباتات

فلاطون اور دیگر فصیل وار میدانوں کے اندر برف کی مانند سفید دھاریاں دکھائی دیتی ہیں جن کے بازو سیاہ رقبے ہیں یہ سیاہ رقبے کبھی دکھائی دیتے ہیں اور کبھی نہیں اسی بنیاد پر پروفیسر پکرنگ نے اپنا خیال اس طور پر ظاہر کیا تھا کہ یہ بہت ممکن ہے کہ فصیل دار میدان فلاطون پر اس قسم کی دوسری تبدیلی جو ہر مہینہ احتیاط کے ساتھ مشاہدہ کرنے والے کو نظر آتی ہے نباتات کے اگنے کی وجہ ہو" یعنی یہ کہ جب زراعت ہوتی ہے تو سیاہ دھبے دکھائی دیتے ہیں اور بعد میں کچھ نہیں اس قبیل کے واقعات اٹلس، ارسطارکس، گرے مالڈی اور انفالنس پر بھی مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

ماہر علم ہئیت کلین نے بجائے سیاہ دھبوں کے سبز دھبے مشاہدہ کیے ہیں۔ پروفیسر پکرنگ نے بھی گریمالڈی کی سطح پر سبز رنگ کی علامات مشاہدہ کیں اور انفالنس پر بھی اس قسم کے سبز دھبے پائے گئے، ان تمام باتوں سے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ چاند میں نباتات اگتی ہیں۔

قمری نباتات کے متعلق متعدد ماہرین علم ہئیت مثلاً فلیموریَن، کارنیگی انسٹیٹوٹ کے جیا فزیکل لابوریٹری کے مشہور و معروف ڈاکٹر سی این فنر، پروفیسر نتوغے ناگینی اور کاسمو پالیٹن نیوز سروس" کے نمائندہ مسٹر ولیم پار کرنے تحقیقات کی ہیں، ان سب کو ہم اس مختصر مضمون میں بیان نہیں کر سکتے ہیں البتہ چند کے خیالات درج کرتے ہیں۔

پروفیسر ناگینی کا خیال ہے کہ چاند میں بڑی بڑی نہریں ہیں جن کے بازو زراعت ہوتی ہے چنانچہ اس کا بیان ہے کہ ارسطلیس کے اندرونی حصہ کا رنگ خارجی حصوں سے زیادہ نہ دھبے' وغیرہ

کرتا ہے کہ یہ نہر کی وجہ ہے۔ علاوہ ازیں اسی سلسلہ میں اس نے ایک مثلث نما سیاہ حصہ بھی شاہدہ کیا ہے جو زرعی حصہ کو تعبیر کرتا ہے۔

مسٹر ولیم پارکر نے مونٹ لوئی کی رصدگاہ میں مذکورہ بالا مشاہدات کی تصدیق کر کے پروفیسر پکرنگ کے مشاہدات کا ثبوت دیا ہے بہرحال بہت سے لوگوں نے پروفیسر موصوف کی مخالفت بھی کی ہے لیکن اس نے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اپنی تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور آئے دن اُنکی تحقیقات کی تصدیق ہوتی جا رہی ہے۔

چاند کا کرۂ ہوائی

پروفیسر پکرنگ نے چاند کا ایک فوٹو گراف لیکر یہ ثابت کیا ہے کہ چاند کا کرہ ہوائی ہے اگرچہ کہ چاند کے کرۂ ہوائیہ کی کثافت کرۂ ارض کے کرۂ ہوائیہ کی کثافت کا آٹھ ہزارواں حصہ ہے تاہم کسی صورت میں بھی اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چاند کے کرۂ ہوائی کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جب چاند جیسا کہ اکثر ماہرین علم ہیئت کا خیال ہے زمین کا ایک حصہ تھا جو ۶ کروڑ سال قبل اس سے جدا ہو گیا تو یہ تسلیم کرنے میں کون امر مانع ہے کہ جس وقت چاند زمین سے جدا ہوا ہے اس کے ساتھ کرۂ ہوائیہ کا ایک حصہ بھی چلا گیا ہوگا۔ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ چاند کی کمیت چونکہ بہت کم ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی قوت جاذبہ بھی کم ہوگی۔ ایسی حالت میں کرۂ ہوائیہ کے سالمات کس طرح برقرار رہ سکتے ہیں؟ ان کی رفتار کو قوت جاذبہ روک نہیں سکتی، یہ سچ ہے لیکن بعض بھاری گیاسیں مثلاً آرگن، کرپٹن اور زنن وغیرہ سطح چاند پر رہتی ہیں۔ البتہ ہائڈروجن اور آکسیجن کا آزاد حالت میں پایا جانا ناممکن ہے ان دونوں کا آمیزہ یعنے پانی بھی اس حالت میں نہیں رہ سکتا۔ مگر منجمد شکل میں رہ سکتا ہے لیکن اگر یہ گیاسیں خارج بھی ہوتی ہیں تو کنوئیں سے نکلنے والی گیسوں سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے کرۂ ہوائی برقرار رہتا ہے۔

چاند کی تپش

چاند کی سطح پر کی تپش کے متعلق مختلف لوگ مختلف الخیال ہیں۔ لیکن ان سب میں پروفیسر وری کا خیال مستند ہے اس کے بیان کے مطابق تپش ۲۰۰ م سے لیکر ۱۰۰ مئی تک بڑھتی گھٹتی رہتی ہے (۱۰۰ م پر پانی جوش کھانے لگتا ہے اور ۰ م پر جم کر برف بن جاتا ہے) و نیز چاند جو کچھ حرارت آفتاب سے حاصل کرتا ہے اس کا ۱۷ فی صدی منعکس کر دیتا ہے اور بقیہ ۸۳ فی صدی جذب کر لیتا ہے ان حدود کے اندر زندہ عضویات رہ سکتے ہیں اس لحاظ سے چاند میں زندگی کا پایا جانا قرین قیاس ہے۔

ان تمام باتوں کے معلوم کر لینے کے بعد ہم اب قیاس لگا سکتے ہیں کہ آیا چاند ایک مردہ دنیا ہے یا اس میں کسی قسم کی زندگی پائی جاتی ہے۔ واقعات کی تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چاند میں ادنیٰ قسم کی نباتات اگتی ہیں اور ادنیٰ قسم کی حیوانی زندگی پائی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ دنیا جس کو ہم روحانی طور پر مردہ سمجھتے ہیں طبعی طور پر مردہ نہیں ہے۔ چاند کو مردہ دنیا ہرگز نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ جو آفتاب ہماری زمین پر چمکتا ہے وہ اس پر بھی ضوفشاں ہے۔ یہ ہماری معلومات اور ذرائع علم کا قصور ہے کہ ہم اس کے حالات کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن آئے دن کی نت نئی تحقیقات سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور ہر طریقہ سے ہمیں اس بات کا ثبوت مل رہا ہے کہ چاند مردہ دنیا نہیں بلکہ اس میں ایک قسم کی ادنیٰ زندگی پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب اس میں پانی ہوا اور تپش موجود ہے تو پھر وہاں زندگی کے وجود کو ماننے میں کون امر مانع ہے؟

کلام بیگم

(از جناب عابد مرزا صاحب بیگم)

سونا مرا۔ آباد سدا سوت کا گھر تھا — میں نے جو تمھیں دل دیا یہ اس کا ثمر تھا

پہونچے نہ جہاں وہم وہاں تیر اگزر تھا — واری گئی تجھ پر تو ملک تھا کہ بشر تھا

اک قطرہ تھا انسان پڑا پیٹ میں جب وقت — روتا ہوا جب گود میں آیا تو بشر تھا

صدقے گئی اللہ نے پروان چڑھایا — سچ پوچھو تو یہ میری دعاؤں کا اثر تھا

برسات میں سمدھن بڑی تکلیف اٹھائی — تم کیوں نہیں آئیں اجی خالی مرا گھر تھا

میں جاتی ہوں میکے نہ رہی ہوں نہ رہونگی — اب تک جو دیا ساتھ یہ میرا ہی جگر تھا

کرتی تھی ادھر کام ادھر دیکھ رہی تھی — اے چھوکری اس وقت ترا دھیان کدھر تھا!

جھانک مار کے پھر کیوں مجھے تم بیاہ کے لائے — رہنا ہی تمھیں گھر میں نہ منظور اگر تھا

معراج کی شب سنتی ہوں اعد میں احد میں — تھا میم کا پردہ یہ ادھر تھے وہ ادھر تھا

ملنے کے لیے کل مرے گھر آئیں جو بیگم — کچھ نفع تمھارا تھا نہ کچھ میرا ضرر تھا

قبرستان کا شیطان

(از جناب ناصر)

اُتار پر ہماری سیکلیں خاصی رفتار سے چل رہی تھیں۔ اور پوڈر لیمپ کی تیز روشنی میں فاصلہ ہی سے سڑک پر کا مجمع ہمیں نظر آگیا میں سمجھ گیا کہ رات کے بارہ بجے کے بعد شہر کے باہر فتح دروازہ سے اس قدر دور قبرستان کے کنارے اتنے آدمیوں کا پایا جانا ایک غیر معمولی بات ضرور ہے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔

حیدر ”دیکھنا میرے بریک ٹھیک طور پر کام نہیں دیتے ذرا تم یہیں سے اپنی گھنٹی زور سے بجانی شروع کردو“ ارے میاں تم بڑے سست ہوتے جارہے ہو سیکل کیا ہے ایک کھٹارا بن گئی ہے نہ بریک برابر نہ گھنٹی درست اور اگر رام لال لیمپ نہ لگادیتے تو نہ معلوم کیسے اتنی اندھیری رات میں جہاں نما سے ترپ باز ار پہنچ سکتے۔ اگر تم میرے یہاں دعوت میں آتے اور قندیل ساتھ نہ ہوتی تو سمجھتے ہو میں بھی اسی طرح مروت سے کام لیتا“

میں حیدر کی وقت بے وقت کی نصیحتوں کا عادی ہو گیا تھا اور اکثر اس کی باتیں ہوا پر اڑا دیتا اس وقت مجھے اس کی پرواہ بھی نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں بالکل قریب میں کوئی کلال خانہ بھی نہیں کہ یہ سمجھوں کہ یہ وہیں سے اٹھ آیا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ تمام لوگ خاموش نظر آتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ یہ لوگ نشہ کی حالت میں ہوں، ساتھ ہی یہ بھی نظر آتا کہ کسی میت کو دفن کرنے آئے ہوں۔ آخر اگر بجلی کا گولہ نہ منگا سکتے تو کم از کم کوئی قندیل تو ساتھ ہوتی۔

میں اسی سوچ میں تھا۔ حیدر اپنی فلسفانہ گفتگو کے غالباً خود ہی مزے لے رہا تھا اور اس کی گھنٹی ہمارے دو جانب کے قبرستانوں کے گہرے سکوت میں خلل ڈالتی جارہی تھی کہ ہماری سیکلیں اس خاموش اور عجیب و غریب مجمع کے قریب پہنچ گئیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ بچکر بازو سے نکل جاؤں۔ مگر بھلا حیدر سے اتنی ہمت ہو سکتی تھی۔ خدا کا بندہ کئی گز کے فاصلہ ہی پر سیکل سے اتر گیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا پست ہمت اور مولویانہ طبیعت رکھنے والوں سے میں اسی لیے جلتا ہوں اگر حیدر میرا بچپن سے ہم جماعت اور مجھ سے زیادہ محنتی اور سبقوں کے پورے نوٹ جمع کر لینے والا نہ ہوتا

تو شاید ہی میں اس کا دوست رہتا اور اس کے ساتھ سیکل پر نکلنا گوارا کرتا اب جو ذات بزرگ سیکل سے اترے تو لگے مجھے بھی پکارنے کہ غنی تمھیں میت کا بھی لحاظ نہیں۔ ٹھرو سیکل سے اُترو۔"

مگر پہلے آدمی کو اتنا خیال نہیں رہا کہ میرے بریک درست نہیں اور سیکلیں اتار پر چل رہی ہیں بھلا میں اس کی طرح کیسے فوراً اتر سکتا تھا۔ میرے لیے مجمع کے پیچھے سے بچکر نکل جانا ہی آسان تھا اور اسی خیال میں بڑھ رہا تھا کہ حیدر نے لپک کر میرا پچھلا مڈگارڈ پکڑ لیا۔ اس کا ادھر لپکنا تھا۔ لگانا تھا کہ ادھر میرا بیالنس بگڑ گیا۔ اور میری سیکل کا اگلا چاک مجمع کے کسی شخص سے جا ٹکرایا۔ اب میری گاڑی بغیر کسی کوشش کے ٹھہر گئی۔ مگر کس طرح؟ میرے جسم کا ایک طرف کا حصہ بالکل زمین سے ہم آغوش تھا اور سیکل میرے پاؤں پر۔

جب ذرا سنبھلا تو پہلے ہی لمحہ میں ان مولوی صاحب سے معافی چاہی جنھیں میرے اگلے چاک نے ضرر پہنچایا تھا اور پھر حیدر کی طرف جو اس وقت میری سیکل زمین سے اٹھا رہا تھا غصے سے دیکھ کر کہا۔" تمھاری بکواس تمھیں اتنا موقع تو دے کہ دیکھو آیا میت ہے بھی یا نہیں۔ (پھر مولوی صاحب سے مخاطب ہوکر) کیوں مولوی صاحب آپ فرمائیے یہاں کوئی میت ہے؟ یہ ذات شریف صرف اس خیال سے کہ یہاں کوئی لاش دفن کی جا رہی ہے۔ خود سیکل سے اتر پڑے اور مجھے بھی بچہ کی طرح کھینچنا شروع کیا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو عمداً ٹکر نہیں دی۔"

وہ تو بے چارے بھلے مانس تھے کہ چپ کے ہو گئے۔ میں ان کی صورت شکل ڈیل ڈول سے تو متوقع تھا کہ کچھ نہیں تو کم از کم ایک دو گالیاں بھی مجھے دیدیتے مگر مجھے حیرت ہوی جب میری توقع پوری نہیں ہوی اب میں سمجھا ہوں کہ مولوی نما حضرات کی نسبت میرا جو ایک عام خیال ہے اس میں مجھے کچھ تو تبدیلی کرنی پڑے گی۔ میں حیدر کو اس کی اس حماقت پر اور ڈانٹنا چاہتا تھا مگر میرے مخاطب مولوی صاحب نے نہایت دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"خیر میاں جوانی میں دوست اسی طرح بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔ آپ نے یہ خوب پہچانا کہ یہاں کوئی لاش نہیں ہے۔ واقعی ہم لوگ میت کے ساتھ نہیں آئے ہیں بلکہ ہمارے محلے کے پہلوان میاں رمضانی کی بہادری اور نڈر پن کا امتحان ہو رہا ہے آپ شاید کسی اور محلے کے رہنے والے ہیں اور آپ کو نہیں معلوم کہ اس قبرستان میں ایک کمرہ ہے جہاں ڈولے (مردوں کو لیجانے) رکھے رہتے ہیں اور جہاں دفن کرنے سے پہلے قبر وغیرہ کے تیار ہونے تک لاشوں کو بھی رکھا جاتا ہے اس کمرہ میں سے گزشتہ طاعون کے بعد سے راتوں کو خوفناک آوازیں آنے لگی ہیں۔ ہم لوگ

اس قبرستان کے پیچھے چنگنی پورہ میں رہتے ہیں اور ہمارے محلے کے اکثر آدمیوں نے یہ آوازیں سنیں
کل صبح اکھاڑے میں اس کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں صبح کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آ رہا تھا تو مجھ سے بھی
رمضانی کے شاگردوں اور دوستوں نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ میاں سچ تو یہ ہے کہ میں نے
خود اب تک کوئی آواز نہیں سنی۔ البتہ میرے گھر کی ماما کہتی تھی کہ وہ رات میں کام سے واپس جاتے
وقت کچھ ڈراونی آوازیں ضرور سنی ہے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ
انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ اس کمرے میں شیطان ہے۔ غرض میں نے جو واقعہ تھا ان لوگوں
سے بیان کر دیا مگر رمضانی ہے بڑے دل کا آدمی۔ اکثر محرم کے زمانے میں کئی کئی سو کی ٹکڑیوں سے
ہمارے محلہ کے چند لڑکوں کو لے کر لڑا اور کامیاب واپس آیا اب جو اس شیطان کا قصہ سنا طیش میں
آگیا وہ کہتا ہے کہ اس نے کبھی اس شیطان کی آواز نہیں سنی ہاور اس کو ان قصوں پر یقین نہیں آتا۔
لیکن جب دیکھا کہ محلے والے مانتے نہیں تو بلکہ الٹا اس کو بیوقوف بنا رہے ہیں تو اس نے آج رات
کو بارہ بجے اس کمرے میں جا کر بتانے۔ اور یہ جو لوگ غلط قصہ مشہور کر رہے ہیں ان کی قلعی کھول دینے
کا دعواے کیا چنانچہ اسی دعوے کو پورا کرنے کے لیے وہ دیکھئے ابھی قبرستان میں داخل ہوا ہے:

میں مولوی صاحب کی اس گفتگو کو بے چینی اور حیرت کے ساتھ سن رہا تھا اور ابھی وہ
رُکنے بھی نہ پائے تھے کہ سوال کر بیٹھا کہ لیکن مولوی صاحب آپ لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ رمضانی
کمرے میں داخل ہوا تھا کیا محلے والوں میں سے کوئی اور شخص بھی ساتھ جا رہا ہے؟

اجی جناب کسی میں اتنی ہمت کہاں کہ بیٹھے بٹھلے اپنی آپ ہلاکت کرے ہم لوگوں نے
بہت سوچنے کے بعد تصفیہ کیا کہ رمضانی کو ایک خاص کیلا دیا جائے جسے وہ اکیلا کمرے کے اندر
دیوار وں میں لیجا کر ٹھوکے اور جس کو ہم دوسرے دن صبح کو جا کر۔ ۔ ۔ ۔

گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ کسی شخص نے مولوی صاحب سے کہا کہ دیکھئے دیکھئے رمضانی کمرے
میں پہنچ گیا ہے۔ کیلا ٹھوکنے کی آواز آ رہی ہے۔

اس اثنا میں میرا غصہ پانی ہو گیا تھا اور اب میں نے حیدر سے جو مجھ سے زیادہ محو حیرت تھا
اور ایک بیوقوف کی صورت بنائے ہوئے دونوں ہاتھوں میں دو سیکلیں سنبھالے کھڑا تھا۔ اپنی
سیکل لیتے ہوئے آہستہ سے کہا: "ٹھیرو تو سہی دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ مگر غنی ہم کو چلنا چاہیئے رات
زیادہ ہوتی ہے مجھے سبق کی تیاری۔

حیدر جملہ ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ایک زور کی آواز آئی "کیڑ لیے" اور اس کے سنتے ہی ہماری

اطراف کے مجمع میں سنسنی پیدا ہوگئی لیکن حالت یہ تھی کہ ہر شخص کے ہونٹ کانپ رہے تھے کسی کی زبان سے ایک لفظ تو نکلتا! دو منٹ تک چپکے رہنے کے بعد میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ آواز غالباً اس کمرے ہی سے آئی؟ وہ خاموش کیوں ہوگیا۔ مولوی صاحب تو بت بنے کھڑے ہوگئے حیدر ذرا میرے قریب آکر کہنے لگا میاں یہ تو کوئی اہم اور دلچسپ واقعہ معلوم ہوتا ہے (پھر مولوی صاحب سے) کیوں حضرت آپ اتنے سہمے ہوئے کیوں ہیں؟

اجی جناب بات نازک ہوگئی۔ خداوند کریم اپنا فضل کرے شیطان والا قصہ بالکل صحیح نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضانی کو اپنے غرور اور حماقت کی سزا ملی شیطان نے اس کو اجل کے پھندے میں پھنسا لیا۔ حیدر تو خیر میں سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا مولوی صاحب آپ رمضانی کو آواز تو دیجئے اور پوچھیے کہ کس نے پکڑا ہے اور وہ کیوں نہیں آتا؟ مگر مولوی صاحب تو گئے آیتیں اور وظیفے پڑھتے نہ معلوم کیا کیا پڑھتے تھے۔ قریب کے ایک نوجوان نے جو ڈیل ڈول سے ایک پہلوان بھی معلوم ہوتا تھا رمضانی کی تین چار صدائیں لگائیں مگر جب کوئی جواب نہ آیا تو ہر شخص ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگا اور پھر میری سیکل کی قندیل کے قریب آکر یہ رائے مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد۔

اکثروں کی یہی رائے تھی کہ گھروں کو واپس چلے جانا چاہیئے۔ علی الصباح اٹھ کر سب مل کر کمرے میں جاکر دیکھیں گے کہ آخر رمضانی کو ہوا کیا۔

میں نے جب دیکھا کہ یہ ٹلے یارہا تو خود ہی دخل دینے کی جرات کی اور کہا کہ آپ لوگ اگر اجازت دیں تو میں بھی کچھ کہوں۔ بات یہ ہے کہ ہم اتنے زیادہ آدمی ہیں۔ ہم کو کچھ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے یہاں سیکلوں کی قندیلیں بھی موجود ہیں خصوصاً اس پوڈر لیمپ کی روشنی میں تو ہم کو ہر چیز دکھائی دے گی بہتر یہ ہے کہ سب مل کر اس کمرے میں چلیں اور دیکھیں کہ رمضانی کو ہوا کیا ہے۔ اس نے چیخ کیوں ماری اور پھر خاموش کیوں ہوگیا۔

میں اپنی تقریر اور جاری رکھتا اگر حیدر گھڑی گھڑی میری شیروانی پیچھے سے کھینچ نہ دیتا اور آخر کار بازو آکر کان میں یہ نہ کہتا کہ غنی دیوانے ہوئے ہو؟ یہ شیطان کی کارگزاری معلوم ہوتی ہے۔ کالج میں ذرا فلسفہ کیا لے رکھا ہے کہ بڑی ہمت بھی آگئی۔

مجھے حیدر کی ذہنیت پر ہنسی آئی کہ بی اے کا طالب علم اور اب بھی بھوت پریت کے قصوں کا اس قدر قائل مگر میں جانتا تھا کہ وہ اپنے ماحول کے معتقدات سے اور ہمارے کالجوں کے اکثر طلبہ کی

طرح اپنی ابتدائی تربیت اور بچپن کے اثرات کا شکار ہے۔ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس سے کچھ نہ کہوں بلکہ اپنے جاہل دوستوں ہی کو اکساؤں تاکہ وہ اپنے استاد پہلوان کو بچاویں۔ غرض میری آدھے گھنٹے کی جوشیلی تقریر کے بعد رمضانی کے چند نوجوان شاگردوں کی ہمت بندھی اور وہ یوں اٹھے کچھ ہی ہو چلئے جناب ہم آپ کے ساتھ اس شیطان کے کمرے میں چلیں گے۔

یہ سنتے ہی میری۔۔۔ کھل گئیں اور جھٹ اپنی اور حیدر کی دونوں سیکلوں سے قندیلیں نکال لیں پوڈر لیمپ اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسری قندیل مجمع میں سے ایک نوجوان کو دینا چاہتا تھا جو ذرا پس وپیش نظر آرہا تھا کہ حیدر نے میرے ہاتھ سے چھین لی اور کہا کہ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ غرض آدھے کے قریب آدمی ہمارے ساتھ ہو گئے اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ حیدرآبادی غول اتنے بھی بزدل نہیں ہیں جتنا میں انھیں خیال کرتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہم قبرستان میں چل رہے تھے اور ابھی دس منٹ بھی نہیں چلنے پائے تھے کہ میرے برابر کے پہلوان نے ڈرتے ڈرتے کہا دیکھئے کمرہ نظر آگیا۔ ذرا آہستہ چلیں۔

میں نے اپنے لیمپ کی روشنی اور بھی تیز کر دی اور اس کا رُخ کمرے کی دروازے کی طرف کر کے بڑھنا شروع کیا۔ جب ہم ذرا قریب پہنچے تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک قوی الجثہ آدمی کا دھڑ اور ایک ہاتھ دروازے میں سے باہر نکلا پڑا ہے میں نے پوچھا کیا رمضانی پہلوان یہی ہے۔ جواب کی امید میں جب پیٹھ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو وہ مجمع جو ساتھ تھا اس میں سے اس وقت صرف چند گنتی ہی کے آدمی رہ گئے ہیں اور وہ بھی بھیگی بلیوں کی طرح سمٹے سمٹے پھر رہے ہیں میں نے حیدر کو ڈانٹا کہ تم سے تو اس قدر خوف زدہ ہونے کی توقع نہ تھی۔

غنیمت یہ ہوا کہ حیدر نے جو مرد بنکر ذرا رفتار تیز کی باقیماندہ ہمراہی بھی آگے بڑھنے لگے اور تھوڑی دیر میں میرے ساتھ ہو گئے۔

میں اگر اس وقت تک جرات دکھا رہا تھا لیکن جب کمرہ قریب آگیا اور پہلوان کا جسم دکھائی دیا تو میرے پیر بھی لڑکھڑانے لگے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید میری زندگی کے بھی آخری ہی لمحے ہیں مگر جب دیکھا کہ حیدر اور چند نوجوان میرے برابر آگئے ہیں تو از سرِ نو ہمت بندھی اور دل کر کے جو کمرے کے دروازہ میں بڑھا تو دیکھا کہ پہلوان نے دیوار میں جو کیلا ٹھوکا ہے تو بد اتفاقی سے اس کی شیروانی کا دامن بھی اس میں آگیا اور پھر واپسی کی جلدی میں جب اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کو اندر کی طرف کھینچ رہا ہے تو وہ بدحواس ہو گیا اور پھر اندھیرے کی وجہ سے یہ نہ معلوم کر سکا کہ خود اسی نے اپنا دامن دیوار میں ٹھونک دیا ہے۔

سوانح میر عالم کا ایک باب

(از جناب محمد سراج الدین صاحب طالب یم آر اے یس)

ہمارے کرم فرما مولوی سراج الدین صاحب طالب نے نواب میر عالم مرحوم دیوان دکن کی "سوانح عمری" لکھی ہے جس کے بعض اجزا مجلہ مکتبہ (جلد ۲ نمبر ۵ و جلد ۳ نمبر ۲ و ۳) میں طبع ہو چکے ہیں یہ کتاب "پریس" کو جا چکی تھی اور سو صفحے چھپ بھی گئے تھے لیکن دوران طباعت میں جناب مولف کو میر عالم کا خود نوشت "روزنامچہ" مل گیا تو نظر ثانی کرکے از سر نو "سوانح حیات" مرتب کرنے پڑے۔ "تصنیف و تالیف" کا یہ باب میر عالم کی خالص علمی زندگی سے متعلق ہے امید کہ علم دوست حضرات اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ (مجلہ مکتبہ)

تصنیف و تالیف

میر عالم جہاں اپنی خوبیوں اور بھلائیوں سے متصف ہیں وہاں علمی دنیا میں مولف یا مصنف کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں یوں تو کئی کتابیں اُن کے نام سے موسوم ہیں لیکن ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ نہ میر عالم کی تصنیف ہیں نہ تالیف بلکہ اُن کے اصل مصنفین نے ان کی خوشنودیٔ خاطر کے لیے اُن کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ میر عالم علم سے خود دلچسپی رکھتے تھے اور علم دوست اصحاب کو نیک علمی مشورے دیتے تھے وہ نثر فارسی کے لکھنے میں جس طرح ماہر تھے۔ اُسی طرح فارسی نظم کے لکھنے پر بھی قادر تھے ان کے نثر کے نمونے ان کے منشآت سے ملتے ہیں اور نظم کے بعض نمونے ہم نے قبل ازیں حسب موقع بیان کرئے ہیں۔ اُن کے علاوہ اور جو کچھ ہیں ان کا ذکر اسی باب میں مناسب مقام پر کیا جائے گا۔

میر عالم کی جتنی تصنیفات اب تک دریافت ہوی ہیں ان میں سے صرف تین چار ایسی ہیں جو حقیقتاً ان کی ذاتی محنت کا نتیجہ ہوسکتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) مصباح العارفین نام ایک رسالہ لکھا ہے جو عبادات میں ہے اس میں نماز شب کے طریقے میر عالم نے بیان کیے ہیں اس کتاب کے دیباچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیشتر ایک کتاب نماز شب ہی کے بیان میں انھوں نے تالیف کی تھی لیکن وہ بحریر آداب و ترجمہ اذکار اور

بعض تحقیقاتی مسائل کی وجہ سے کسی قدر طویل ہو گئی تھی اور عام فہم نہیں رہی تھی اس لیے اس کو مختصر کر کے انھوں نے اس رسالے کو لکھا اور اس کے نقش اول کے مثل اس رسالے کو بھی ایک مقدمہ اور تین فصول اور ایک خاتمہ پر مرتب کیا ہے چنانچہ دیباچے کی عبارت ذیل سے واضح ہوگا۔

"اما بعد چوں دریں ایام ساعتے چند از عمر سرمایہ طلب صرف نوشتن سطرے چند شد دربیان نماز شب وہنگام تحریر آداب وتسطیر ترجمہ اذکار عنان اشہب قلم بے اختیار از دست رفتہ بوادی تحقیقاتے او فتاد کہ درخور فہم ہمہ کس نبود لاجرم بخاطر فاتر رسید کہ ثانیاً آں رسالہ را تقسیمے مختصر نساید کہ مشتمل باشد بر بیان آداب درکمال اختصار و ترجمہ ضروری الفاظ ادعیہ واذکار .... وایں مختصر مانند رسالہ اول مرتب است بریک مقدمہ وسہ فصل ویک خاتمہ ۔"

اس رسالہ کی تالیف ۱۲۱۸ھ میں ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ازدواجی زمانہ بیکاری میں جہاں انھوں نے خدا پرستی کے اور کام کیے وہاں مذہبی رسایل بھی تصنیف یا تالیف کر کے سعادت حاصل کی۔

۲۔ زیارت عاشورا۔ ایک مختصر رسالہ اور لکھا ہے جو زیارت عاشورہ کی ترکیب میں ہے۔ اس کی وجہ تالیف تمہیداً یہ بیان کی ہے کہ زیارت حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بڑے فضایل ہیں جن کا اظہار حیطۂ تحریر و تقریر میں ممکن نہیں بعض زیارتوں کے اوقات واحوال لکھنے کا خیال ہوا تاکہ لوگوں کو سفر و حضر میں بھی زیارت کے لیے آسانی ہو اس رسالے کو پانچ فصلوں پر تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں۔

۱۔ فصل اول زیارت عام ۲۔ فصل دوم اوقات زیارت ۳۔ فصل سوم زیارت عاشورہ ۴۔ فصل چہارم زیارت اربعین ۵۔ فصل پنجم زیارت جامعہ صغیرہ۔ عبادات کے ان رسایل کے نسخے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عالم پر مذہبیت غالب تھی اور ان مذہبی رسایل کے مدون کرنے کی مہلت ان کو اس وقت ملی جبکہ وہ گوشۂ عزلت میں بسر کر رہے تھے۔

۳۔ مثنوی میر عالم۔ میر عالم کو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی بعض کتب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ میر عالم کا فارسی دیوان مرتب و مکمل تھا لیکن وہ مفقود ہے ان کی شاعری کا نمونہ جو ہم تک پہنچا ہے فقط ایک مثنوی ہے جو غلام حسین جوہر صاحب تاریخ ماہ نامہ کے بیان کے مطابق ماہ لقا[1] کے سراپا میں انھوں نے نظم کی ہے

---

[1] ماہ لقا بائی راج کنور کی لڑکی تھی جس کی بہن مہتاب جی رکن الدولہ میر موسی خاں کے یہاں تھی۔ اس کا نام چندا بائی تھا اور ماہ لقا خطاب غفراں مآب نے مہم پانگل سے واپس تشریف لانے کے بعد اس کو اس خطاب اور نوبت اور گھڑیال سے سرفراز کیا تھا یہ درباری طوائف سے تھی۔ حضور میں جب اس کا مجرا ہوتا تو سرکار سے ہر مجرے کے ایک ہزار روپے انعام پاتی تھی صاحب کمال شاعرہ اور حاضر جواب تھی اس کا دیوان مدون ہے

سلاست وصفائی کے اعتبار سے مثنوی بہت شستہ ہے اس کی نسبت غلام حسین خاں جوہر اپنی کتاب ماہ نامہ میں لکھتے ہیں۔

"نظم مثنوی در وصف سراپائے آں سرو جویبار دلبری در بحر مخنون[۱] بفصاحت محاورہ تصنیف فرمودہ اند چنانچہ اکثر اشتہار دارد"

اس مثنوی کے جملہ دو سو اٹھائیس شعر ہیں اس میں ماہ لقا کا سراپا ہے اور کچھ داستان حسن عشق اس میں شک نہیں کہ یہ مثنوی اسی زمانہ میں مشہور ہو گئی ہو گی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ زبان سلیس اور شستہ تھی اور کلام میں آمد و بے ساختگی اور موافق مذاق زمانہ تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ میر عالم جیسے شخص کی کہی ہوئی تھی اور پھر ماہ لقا جیسی ہر دلعزیز کے لیے کہی گئی تھی۔ ماہ لقا کو جب یہ مثنوی ملی ہو گی تو خود اس نے اپنی مشیخت کے لیے اس امر کی کوشش کی ہو گی کہ لوگ اس سے واقف ہو کر اس کی قدر کریں کہ یہ بھی ایک ایسے فرد روزگار کی ممدوحہ ہے یہاں ہم یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہیں گے کہ اس مثنوی سے حقیقتاً ماہ لقا کے نام و نمود میں اور چار چاند لگ گئے۔

ماہ لقا اور میر عالم کا تعلق اس امر کے متعلق کہ میر عالم اور ماہ لقا کے تعلقات کیسے تھے اس کے ہوا خواہ غلام حسین خاں جوہر نے ان الفاظ میں خاص روشنی ڈالی ہے۔

(الف) "میر عالم بہادر اکثر می فرمودند کہ تلمیذی برسائی فہم و زکاوت طبع و حدت مزاج در زمرۂ تلامذہ خود مثل ماہ لقا ندیدہ ام با وصف ایں ہمہ متانت و اقتدار و فضیلت بہمدمی و مصاحبت ایں ماہ لقائے زہرہ نوائے اختیار می داشتند و مصاحبت ایں گل گلزار رعنائی تخم انتعاش در مزرعۂ طمانیت می کاشتند"

---

[۱] غلام حسین خاں صاحب تاریخ ماہ نامہ شاعر تھے اور جوہر تخلص کرتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علم عروض سے واقف نہیں تھے اور باوجود عدم واقفیت کے وہ اپنے قارئین کو شاید یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ علم عروض سے بھی واقف ہیں اور اسی غرض سے انھوں نے مثنوی مذکور کے متعلق لکھا ہے کہ "در بحر مخنون بہ فصاحت محاورہ تصنیف فرمودہ اند۔ عروض میں کوئی بحر اس نام کی نہیں ہے البتہ خبن نام ایک زحاف تو ہوتا ہے یہ رکن کے اس تغیر کا نام ہے جو اس کے دوسرے ساکن حرف کو گرانے سے پیدا کیا جاتا ہے جیسے رکن فاعلن سے دوسرا حرف ساکن (الف) گرا کر فعلن بنا لیا جس رکن میں یہ زحاف واقع ہو اس کو رکن مجنون کہتے ہیں مثنوی کو ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بحر ہزج مسدس اخرب یا اخرم مقبوض محذوف میں ہے جس کے اشعار کی تقطیع مفعول مفاعلن فعولن یا مفعولن فاعلن فعولن سے ہوتی ہے جس کی اصل دائرے میں مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے ۱۲

(ب) "چنداباائی (ماہ لقا) اکثر بہ مصاحبت (میر عالم) اختصاص یافت چوں مزاج میر عالم بہادر قدردان اہل کمال بود و در فصاحت و بلاغت و نظم و نثر گوی سبقت از حسان و سحبان می ربود مصاحبت و مجالست ایں لطیفہ گوے حاضر جواب را از جملہ انتعاش و شگفتگی گل خاطر نیز آں در استحضار طریق استبداد می داشت و اکثر صحبت شعر و نظم و نثر درمیان بود۔ میر عالم بہادر بسا کہ بہ زبان فصاحت ترجمان می فرمود کہ جلیس باتمیز و تلمیذی باایں جدت طبع و رسائی فہم مثل ماہ لقا کم دیدہ شد۔"

صاحب ماہ نامہ کے اس کلام سے ایک امر مستنبط ہوتا ہے کہ میر عالم شاعر ہونے کے علاوہ شاعر گر بھی تھے چنانچہ اس جملہ سے "تلمیذی بہ رسائی فہم و ذکاوت طبع و جدت مزاج در زمرۂ تلامذہ خود مثل ماہ لقا ندیدہ ام" یہ معلوم ہوتا ہے کہ فن شعر گوئی میں علاوہ ماہ لقا کے میر عالم کے اور شاگرد بھی تھے لیکن اُن کے نام معلوم نہ ہوسکے اور نہ اصلاح سخن کے طریق روشنی میں آئے اس مثنوی کے آغاز میں ایک رباعی لکھی ہے اور اس سے پیشتر یہ مصرعہ بطور عنوان لکھا ہے (ع)

"افسون جنون عالم است ایں" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (عالم) تخلص کیا کرتے تھے تخلص عالم، خطاب میر عالم کا جزء ہے جو ان کو (سنہ ۱۲۰۳ھ) اس وقت ملا تھا جبکہ ان کی عمر تقریباً (۲۷) سال تھی اور شاعری کا شغل اس سن سے قبل کا ہے اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خطاب سے پہلے کچھ اور تخلص کرتے تھے۔ اور خطاب پانے کے بعد انھوں نے اس کو بدل دیا اور عالم تخلص کرنے لگے۔

اشعار مثنوی یہاں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے آغاز و اختتام کے چند اشعار نقل کیے جائیں تاکہ اُن سے میر عالم کی شاعرانہ طبیعت کا کچھ اندازہ ہوسکے ؎

اے ماہ سپہر روشنائی — سرتا پاے تو دلربائی
اے مردم دیدۂ محبت — سرتا قدمت طلسم الفت
شکل تو بہ کلک دل مصور — جسم تو بہ آب جاں مخمر
تصویر تو از فرنگ حسن است — نقش تو شریک رنگ حسن است
اے حسن تو دلربائی عشق — آئینۂ خودنمائی عشق
تا حسن تو تاختن بدل زد — عشقت رہ عیش متصل زد
از شوق تو شد عیاں نہاں شور — از ہر رگ من عیاں چو طنبور
شد توعیاں نہ بر زبانم — سوز تو نہاں بہ مغز جانم

از شعلۂ حسنت اے دل آرا — در عشق بہ سوختم سراپا
اے جلوہ فروش جاں خریدا — اے غمزہ متاع و عشوہ بازا
تا روے ترا بہ من نمودند — درہاے بلا بہ من کشودند

. . . .

تا راہ سخن بہ من کشودی — راہے بہ خموشیم نمودی
گفتار بخموشیٔ تو باہم — در شعلہ فشانیند باہم
کز شمع زبان زبانہ افروخت — یاقوت لبت بخامشی سوخت

. . . .

اے بادِ صبا توئی وفا سنج آگاہ خبر ز راحت و رنج
یک رہ ز کرم تو اے وفا کوش شرحِ ہجراں کہ کردہ گوش
بیماری تو شفائے جاں ہا غم خواری تو دوائے جاں ہا
رازے کہ بہ گوش دل شنیدی رازے کہ عیاں بہ چشم دیدی
از راہ وفا دلے گرآری بر منزل ماہ من گزاری
پنہاں پنہاں بگوش آں ماہ القصہ بگو و قصہ کوتاہ

۳۔ رقعات میر عالم | میر عالم کے خطوط کا ایک مجموعہ ہے جس میں وہ تمام خطوط جمع ہیں جو میر عالم نے یا تو خود اپنی طرف سے کسی کو لکھے ہیں یا غفراں مآب یا ارسطوجاہ کی طرف سے ان منشآت کو ان کے منشی خاص حسین علی خاں نے جمع و مرتب کرکے "باغ و بہار" ۱۲۱۱ھ تاریخی نام رکھا ہے۔ خطوط کو تین اقسام پر منقسم کیا ہے۔

قسم اول میں وہ خطوط ہیں جو حضرت غفراں مآب کو یا حضرت غفراں مآب کی طرف سے اوامرا، و روسا، کو لکھے گئے ہیں۔

قسم دوم میں وہ خطوط ہیں جو ارسطوجاہ کی طرف سے لکھے گئے یا خود ارسطوجاہ کو لکھے گئے۔

قسم سوم میں وہ خطوط ہیں جو میر عالم نے اپنے اعزہ و احبا کو لکھے۔

اس کا ایک نسخہ خود ہمارے پاس موجود ہے ہشتم رجب ۱۲۲۴ھ اس کی کتابت کی تاریخ ہے۔ اور کاتب میر محمد کاظم ابن میر محمد تقی خاں بہادر ابن میر محمد رضا صاحب ہیں۔ اس نسخے میں کتابت کی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

نواب عماد الملک مرحوم کا خیال ہے کہ میر عالم نے اپنے رقعات و مکتوبات خود جمع اور مدون کیے اور انشاء میر عالم نام رکھا۔ اگر اصل رقعات کا نسخہ ہمارے پاس نہ ہوتا اور ہم عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں اس کو نہ دیکھے ہوتے تو ممکن تھا کہ ہم نواب صاحب مذکور کے اس خیال سے متفق ہو جاتے منشآت میر عالم کا نسخہ ہمارے سامنے موجود ہے ان کے مرتب حسین علی خاں کا لکھا ہوا دیباچہ اس کے شروع میں دو تین صفحات پر مشتمل ہے ان کو یہ امر تسلیم ہے کہ حسب الحکم میر عالم انھوں نے رقعات کے مسودات جمع کیے چنانچہ ان کی عبارت یہ ہے۔

"ہر چند ایں بے سواد دار الانشا و سخن گستری و ابجد خوان دبستان دانشوری حسین علی مخاطب بہ خطاب خوانی قابلیت آں ندارد کہ ایں گوہر ہائے گراں بہا را در سلک ترتیب و ایں جواہر بے ہمتا را بہ کلک تحریر تواند آورد لیکن از انجا کہ بہ مقتضائے پرورش و رعایت خداوندی نہال قامت عقیدت استقامت بہ آبیاری تربیت آں نخل بند ریاض فضیلت نشو و نما یافتہ بامر منشی گری مامور است و بحکم المامور معذور دست جرأت

بہ اجتماعِ سوداتِ سطور کشیدہ برسہ قسم منقسم ساختہ"

اس سے ظاہر ہے کہ خود میر عالم نے ان کی تدوین نہیں کی بلکہ اس کی تدوین و ترتیب کا حکم انھوں نے اپنے منشی حسین علی خاں کو دیا جنھوں نے بہ امتثالِ امر اپنی کوشش سے ان کو جمع کیا اور خود اس پر دیباچہ لکھ کر کتاب کو مکمل کیا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی تدوین میر عالم ہی کے عہد میں اور ان کے ہی حکم سے ہوی۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ خود میر عالم نے ان کو جمع کیا بہر حال رقعات کی زبان فارسی ہے جو اس عہد میں تعلیم یافتہ طبقہ کی اور دفاتر کی اور جملہ کاروبار کی تحریری زبان تھی رقعات پر قدامت کا رنگ ہے۔ استعارات اور تشبیہات گوناگوں سے اور تلازماتِ بدیعی سے اپنے مطالب کو خوشنما لباس میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس سے مضامین گورکھ دھندا بھی نہیں بن گئے ہیں جن کا سمجھنا بوجھنا بہت مشکل ہو۔ باوجود استعمال صنایع و بدایع ان کی زبان میں سلاست ہے۔ صنایع کی پرکاری کے ساتھ اظہارِ مطلب رمز و کنایے میں کرتے ہیں۔ بعض ترکیبیں حسینہ استعمال کرتے ہیں جیسے خاتمہ کا جملہ "ایام عاطفت مدام باد" یا خاتمہ پر دعا کے ساتھ "بالنون والصاد" وغیرہ لغات غریب استعمال نہیں کرتے رقعات میں ایک دو رقعے عربی بھی دیکھے گئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان کے سمجھنے اور پڑھنے کے علاوہ اس کے لکھنے پر بھی قادر تھے ان رقعات کے مطالعہ سے اس زمانے کے بعض تاریخی واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ طرزِ تحریر معلوم کرنے کے لیے ہم یہاں دو تین رقعے نقل کرتے ہیں۔

(۱) رقعہ از طرف غفراں مآب بہ جارج سیوم پادشاہ انگلینڈ۔ کوکب دولت و اقبال و اختر شوکت و اجلال بادشاہ خورشید کلاہ معدلت دستگاہ والا شان فرخندہ دودمان برآرندہ آریکہ رفعت و عظمت فرازندہ الویہ ابہت و حشمت مالک ممالک نام آوری سالک مسالک عدل گستری ممہد قوانین جہانداری مشید قواعد کامگاری ناہج مناہج ارجمندی عارج معارج سربلندی کامگار کشور نامداری شہریار اقلیم عالی تباری شعشعہ افروز افسر و اورنگ رونق آموز دانش و فرہنگ جارج سیوم بادشاہ گریٹ برٹن وغیرہ ولایت فرنگ از وفق حصول امانی و آمال طالع و لامع باد۔ اما بعد نگاشتہ کلک فصاحت می گردد کہ مشاہدہ محاسن اوضاع و اطوار کہ مغناطیس قلوب بالغ نظران کامل عیار است آرزو مخالطت رعایائے ولایت فراست خیز انگریز با اہل ایں دیار و حصول آگہی از اصابت قوانین و متانت

آداب و آیین سلاطین آن سرزمین علی الخصوص انضباط و استحکام و لوازم مصادقت
و وفاق و ثبات و قیام و رسم مخالفت و اتفاق که در نظر دقیقه شناسان مراتب
کمالات به بنی نوع انسان سرآمد فضایل و بهترین خصایل است و به تخصیص تکرار
مکارم صفات و مآثر ملکات آن شهریار کامگار نامدار که در تهذیب ضوابط ریاست
و سروری و ترتیب روابط جهانبانی و معدلت گستری به صفت مزیت از امثال
و اقران بر السنه و افواه جمهور مذکور و در اطراف و اکناف این نه طاق لاجوردی
رواق به سمت امتیاز و رجحان از سائر جهانداران معروف و مشهور است همیشه خاطر
تودد مظاهر را مایل تحریک سلسله محبت و وداد و راغب تاسیس مبانی مودت و اتحاد
است از انجا که هر امرے موقوف بر وقت خویش می باشد درین ولا ایالت و
ایالت مرتبت شهامت و بسالت منزلت منیع الشان سمو المکان مسٹر هیسٹن اعتماد الدوله
بهادر که به حسن معاشرت و نیک ذاتی اهالی اینجا را به مرتبه از خود راضی داشته که اکثر روسا
و حکام بلاد هندوستان از روانگی مشارالیه افسرده خاطر و دل گران اند عزیمت خدمت
آن بادشاه والاجاه نمودند و تشیید ارکان موالات به تاسیس بنیان مراسلات
بوساطت آن رمز شناس و دقایق فطانت آگاهی پرده کشائی غوامض صداقت
و هواخواهی مناسب نمود و بعض امور قرار داد که بمزید تشیید این اساس شهرها
مخصوص بود به معروضه مسٹر مشارالیه حواله نموده تا بنیاد این بنائے عظمت انتما
فواید می قرار گیرد که دست سوانح حدثان از دامان تحلل بنیانش کوتاهی پذیرد
و بحکم (تهادوا و تحابوا) یک حلقه انگشتر الماس موافق رسم این دیار بر سبیل
هدیه ابلاغ یافت ترصد که قبول خاطر تلطف مآثر بود و همواره ابواب مراسلات
طرفین مفتوح و طریقه انیقه اتحاد و یکرنگی از جانبین مرعی و مسلوک باشد زیاده ایام
دولت بکام باد۔

(۲) رقعه از طرف نواب ارسطو جاه بهادر به لارڈ کورنوالس بهادر متضمن کشته شدن عزیز الدین خان۔

درین ایام اختلالے که از نیرنگی های تقدیر بواسطه سوء تدبیر حافظ فرید الدین خان
به ظهور آمد نه فقط به موجب برهمی کار رعایا و گروه کنده شد بلکه این خلل به بعضی جهات
از نزدیک قلعه مذکور بجاهای دور سرایت کرده متعلقات و طرق و شوارع تا ایل

غبار آلودہ تکدر واقعہ طلبان گردید ہرچند از انتہاض رایات فیروزی آیات
مرشدزادہ بلند اقبال جمعیت مقاہیر زیادہ بریکث شبانہ روز فرصت توقف
نیافت معہذا تسکین ایں آشوب کہ بیک ناگاہ پدیدار شدہ و فرونشانیدن
جوش وخروش فرصت جویاں قابو طلب و تصفیہ راہ ہا و اطمینان متردین
امتداد ایامی می خواست لیکن چوں متواتر از نوشتہ میر صاحب جلیل القدر
علیم الالام صاحب میر عالم بہادر معلوم شد کہ آں مہربان بہ مقتضائے اتحاد عزم
سیرنگ پٹن را بہ محض انتظار وصول موکب اجلال مرشدزادہ بلند اقبال و رسیدن
مخلص رہین توقف داشتہ فوق الحد چشم براہ اند لہذا انتظام کارہائے ایں حدود
را بر وفق خاطر خواہ موقوف بر وقت دیگر داشتہ بعد بند وبست ضروری بتاریخ
پانزدہم جمادی الاول از گورم کنڈہ نہضت بعمل آمد و در یک ہفتہ مقام فلاں
بہ نصب خیام نصرت التسام مرشدزادہ بلند اقبال رونق افروز گشت دو سہ روز
توقف ضرور تا منظور والا کمند جاذبہ اشتیاق رسا تر ازاں است کہ بے ضرورت
وقفہ مانع تعذر کوچ تواند گشت انشاء اللہ تعالیٰ المستعان بتاریخ فلاں ازیں جا
نیز ارادہ انتہاض مصمم بفضلہ تعالیٰ عنقریب شاہد اشتیاق پردہ از روے حجاب
می اندازد و سرور مواصلت ہا تلافی امتداد ایام مفارقت ہائے اتفاقی می پرداز د
زیادہ ایام شادمانی مدام باد"

(۳) رقعہ از طرف میر عالم بہادر بہ گورنر جنرل لارڈ کورنوالس بہادر ہنگام سفر بنگالہ
از بندر گنجام پیش از ملاقات بقلم آمدہ۔

ہر چند موافق قانون حفظ مراتب محبت وولا و مطابق قاعدۂ مراعات درجات
مودت وصفا بہ مقتضائے مراسم یگانگت کہ فیما بین سرکار شامخ الارکان کمپنی
والاشان بہ اقصی الغایت استقرار و استمرار دارد وبہی خواہان ہر دو دولت
راکہ فی الحقیقت واحد است می زیبد کہ سر اخلاص از گریبان دعوی اتحاد
بر دارند کہ بہ آب و رنگ ایں رابطہ معنوی و واسطہ عقلی نقش یگانگی و یکرنگی
برلوح اثبات بر نگارند علے الخصوص مخلص از وقتے کہ حسب الحکم حضور پر نور
دخیل مقدمات و واقف معاملات طرفین است نظر بریں کہ مداخلت

مستدعی مخالطت می باشد بحکم مزید اطلاع از محاسن احوال و اوضاع صاحبان عظیم الشان انگلیس عموماً و استماع عظمت قدر و مکارم اخلاق آں یگانہ آفاق خصوصاً بے شائبہ تکلف نہایت مشتاق لقائے گرامی می بود تا آنکہ بفضل الٰہی ذات حضور لامع النور دریں ایام میمنت انجام تشیید و استحکام مبانی خلت و وداد بیش از پیش مصمم و مخطور و ذہن نشین نمودن مراتبے کہ موجب انضباط فواید یکجہتی و یکتا دلی تواند بود با بہ آں والا مناقب مسلم و منظور ۔ لہٰذا مخلص بہ ایں امر از حضور مرخص و مامور شد بعونہ تعالیٰ بتاریخ بست و دوم شہر ربیع الثانی ۱۲۰۳ھ ہجری بہ مقام بندر گنجام مقام دارد و کوچ بہ کوچ عزم استحصال نعمت سامی مواصلت و افی مباہجت دارد اللہ تقدس و تعالیٰ عنقریب بہ منزل مقصود و بہ مقصد محمود فائز گرداند بفضلہ و کرمہ خریطۂ حضور پرنور موسوم اسم سامی کہ دریں ولا شرف ورود ارزانی فرمود ملفوف و آنچہ مخلص ہمراہ خریطہ مذکور بہ گزارش آں ماموراست انشاء اللہ تعالیٰ بالمشافہ التماس خواہد نمود۔ زیادہ بجز اشتیاق چہ نگارد۔

(۴) رقعہ از طرف میر عالم بہادر بہ کرک پیاٹرک (حشمت جنگ) رزیڈنٹ حیدرآباد۔

دریں آوان مسرت اقتران نوید بہجت افزائے عزمیت آں مہربان بہ ایں نواح بہ تقرر اقامت حضور پرنور نہ آں قدر موجب سرور خاطر محبت آثر گردید کہ شرح شمہ ازاں مانند محاسن اخلاق آں مہربان مقدور خامہ طویل اللسان تواند بود و نسایم بہجت شمائم ایں خبر مسرت اثر نہ آنچناں باعث شگفتگی و خرمی دل دوستان گشت کہ عشر عشیر آں رقم تواں نمود چوں مراتب شوق و آرزومندی مواصلت با زیادہ از احاطہ تقریر و مافوق اندازۂ تحریر است ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بہ اسرع اوقات بخوبی و خرمی زمان ملاقات ہا را قریب الوقوع گرداند و گلشن تمنائی دوستاں را بہ آبیاری وصال آب و رنگ تازہ حاصل فرماید زیادہ زیادہ۔

۵) حدیقۃ العالم | اس کتاب کے متعلق تین امور مشہور ہیں (۱) میر عالم کی تصنیف ہے (۲) اس کو میر عالم کے نام پر سید عبداللطیف شوستری نے لکھا ہے (۳) یہ کسی اور کی لکھی ہوئی کتاب ہے ۔ پہلے پہل یہ سراج الملک کے عہد وزارت میں انھیں کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی ہے اور پھر حسب ایمائے عالیجناب نواب فخر الملک بہادر کتاب ۔۔۔ ۱۲۶۶ ہجری ۔۔۔

مطبوعہ نسخوں کے پہلے مقالہ میں ایک مقدمہ اور سات باب ہیں اور دوسرے مقالہ میں چار باب
اس کے متعلق نواب عماد الملک[1] سید حسین بلگرامی کہتے ہیں کہ حدیقۃ العالم کو میر عالم کے نام پر
مرزا عبد اللطیف شوستری نے تصنیف کیا ہے نہیں معلوم کہ نواب صاحب ممدوح نے اس امر کا پتہ
کہاں سے لگایا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرزا عبد اللطیف میر عالم کے ایک گہرے دوست تھے ہماری
تحقیق میں سید عبد اللطیف شوستری میر عالم کے چچیرے بھائی ہیں۔ ان کے دادا شیخ الاسلام سید نور الدین
کے آٹھ لڑکے تھے (۱) سید عبد اللہ (۲) سید نعمت اللہ معروف بہ سید آقائی (۳) سید حسن (۴)
سید محمد (۵) سید فرج اللہ (۶) سید مرتضیٰ (۷) سید طالب (۸) سید رضی سید طالب عبد اللطیف
کے والد تھے اور سید رضی میر عالم کے والد عبد اللطیف شوستری صاحب تصنیف ہیں اور انھوں نے
ایک کتاب تحفۃ العالم بطور سفرنامہ لکھی ہے۔ ممکن ہے کہ تحفۃ العالم اور حدیقۃ العالم کو ایک ہی
کتاب سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو یہ ممکن ہے کہ حدیقۃ العالم عبد اللطیف کی تصنیف باور کرنے میں
اس وجہ سے غلطی ہوئی ہو کہ حدیقۃ العالم کا متداول نسخہ مطبع سیدی (حیدرآباد) میں مالک مطبع
سید عبد اللطیف شیرازی کے اہتمام سے طبع و شایع ہوا اور ممکن ہے کہ نواب صاحب مرحوم کا خیال
انھیں عبد اللطیف کی طرف سبادرت کر گیا ہو۔ لیکن اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سالار جنگ بہادر
کے کتب خانہ میں ہمارے دیکھنے میں آیا جس کے دوسرے مقالہ کی تمہید یہ ہے:۔

"مخفی نماند کہ اضعف عباد اللہ القوی سید محمد مدعو بہ میر ابو تراب ابن سید احمد الرضوی
عاملہا اللہ بلطفہ الخفی والجلی حسب الحکم واجب الانقیاد عالیجناب سید کرم معدن احسان
وکرم وزیر اعظم حضرت خلیفہ دوران سکندر زمان دام ظل رحمتہ علی رؤس العالم میر ابو القاسم
المخاطب بہ نواب میر عالم اعلی اللہ مقامہ، چوں کتاب حدیقۃ العالم متضمن دو مقالہ مقالہ
اولی در ذکر مآثر ملوک قطب شاہیہ نور اللہ مراقدہم و مقالہ ثانیہ در بیان احوال خیر مآل
سلسلہ عالیہ آصفیہ خلد اللہ دولتہم وغیرہ کہ در فہرس ایں مقالہ مرقوم تالیف نمودہ بنام
نامی آں وزارت انتساب منسوب گردانیدہ بیضہ مقالہ اولی آں کہ متداول بین الایدی
ومشتہر بین الناس گردید نجلات بیضہ مقالہ دومیش کہ جز یک دو نسخہ مشہور و مروج
نگردید واکثر اعزہ از اولی الابصار درخواست کنندہ وطلبگار بیضہ ایں مقالہ بودند

---

[1] نواب صاحب مذکور نے مختار الملک سر سالار جنگ کی سوانح عمری انگریزی زبان میں لکھی ہے جس کا ترجمہ مرقع
[illegible] صاحب نے کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے

"تا اینکہ دریں زمان فیض قران سن یکہزار و دو صد و بست و سیوم از سنین ہجریہ و علیٰ صاحبہا افضل الصلوٰۃ والتحیۃ بہ مفحوائے آنکہ بظہور ہر شئے منوط بوقت آنست چوں ہنگام منت مہر ورداجش رسید خاطر فیض مآثر فیض رسان عالمیاں دام ظل فیضہٗ بداں گرائید کہ مبیضہ از مسودہ منتشر الاوراق کہ نزد مولف است منتظم سلک ترقیم گشتہ بغازہ رواج چہرہ افروز گردد"

اس تمہید کی توجیہ سے صاف ظاہر ہے کہ حدیقۃ العالم سید محمد معروف بہ میر ابو تراب کی تصنیف ہے اور چونکہ انھوں نے اس کو حسب الحکم میر عالم تصنیف کیا ہے اس لئے اس کا انتساب انھیں کے نام سے کیا اور اپنی کتاب کے دوسرے مقالہ کے دیباچے میں بالتفصیل اس کا اظہار کر دیا۔ مصنف کے نام کی اسی تبدیل و تحریف کو برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی فہرستوں کے مرتب کرنے والوں نے بھی بتایا ہے چنانچہ چارلس ریو برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات میں یہ لکھتے ہیں کہ حدیقۃ العالم کے قلمی نسخہ (مخزونہ برٹش میوزیم) کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ابو تراب بن سید احمد الرضوی اسکے مصنف ہیں جو دوسرے مقالے کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پہلے مقالے کو جس کی تمہید میر عالم کے نام سے موسوم ہے ختم کرنے کے بعد میں دوسرے مقالہ کو شروع کرتا ہوں اس قلمی نسخہ میں چارلس ریو اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ مطبوعہ نسخہ میں میر عالم جہاں اپنا ذکر کرتے ہیں تو اپنے آپ کو اس خیر خواہ کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں بخلاف اس کے اس قلمی نسخہ میں جہاں میر عالم کا ذکر آیا ہے وہاں اُن کے نام کے لیے ضمائر واحد غائب استعمال ہوتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اس کا لکھنے والا کوئی اور ہے اور گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ مرہٹہ (جلد اول صفحہ ۴۲۸ کے فٹ نوٹ) میں بھی حدیقۃ العالم کے مولف کا نام محمد ابو تراب ہی بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس نے اس کتاب کو میر عالم کے نام پر معنون کیا ہے اور یہ کہ اس کے دو نسخے اس کے پاس تھے جنمیں کا ایک مسٹر ولیم رسکن نے اسے دیا تھا ایتھے نے کتب خانہ انڈیا آفس کی فہرست مخطوطات میں اپنی مزید تحقیق یہ بتائی ہے کہ میر ابو تراب بن سید احمد الرضوی اپنی کتاب کی تمہید میں یہ لکھتے ہیں کہ میر اکبر علیخاں سکندر جاہ کے حکم پر (میر ابو تراب ابن سید احمد) شاہان قطب شاہی کی تاریخ لکھنے پر مامور تھے اور اس نے کتاب تصنیف کی جس کا نام "قطب نمائے عالم" رکھا۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۱ھ م ۱۸۰۲ء ہے اس کتاب میں بھی ایک مقدمہ اور سات باب اور ایک خاتمہ ہے جو حدیقۃ العالم کے جملہ ابواب کے ساتھ مطابق ہے ہر چند ہم نے تلاش کی لیکن ہم اس کا پتہ لگانے میں قاصر

رہے کہ اس کتاب کو میر ابو تراب نے سکندر جاہ کے حکم پر لکھا اور قطب نمائے عالم نام رکھا۔
قلمی نسخہ کو اگر مطبوعہ نسخہ کے مقابل رکھ کر پڑھا جائے تو جزوی لفظی اختلاف کے قطع نظر یہ معلوم ہوگا کہ اکثر مستقل احوال و بیانات کا الحاق ہو گیا ہے۔ لیکن قطعی طور پر یہ معلوم کرنا کہ الحاق کس زمانہ میں ہوا یا کس نے کیا مشکل ہے۔ البتہ بعض الحاقات کے مطالعہ سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ کسی نے منیر الملک کی دیوانی کے زمانہ میں ان کی خوشنودی کے لیے بعض اضافے کر دیے چنانچہ مطبوعہ نسخے میں شیر جنگ اور درگاہ قلی خاں سالار جنگ کا احوال صریحی الحاق ہے۔ قلمی نسخے میں اس کا مذکور نہیں ہے اور چونکہ ان کا ذکر متن کتاب میں بے محل معلوم ہوتا تھا اس لیے الحاق کرنے والے نے یہ تمہید لکھ کر احوال بیان کیا۔

"وچوں دریں مقالہ اکثر جا ذکر نواب حیدر یار خاں بہادر شیر جنگ و نواب درگاہ قلی خاں بہادر سالار جنگ رحمۃ اللہ علیہما تقریباً درمطاوی کلام بزبان قلم آمد لازم شد کہ احوال ایں ہر دو امیر کبیر عالی شان کہ از اعیان دولت آصفیہ بودند بمعرض بیان آید"

خود اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اس کو اصل متن سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے بعد کے احوال فٹ نوٹ کی حیثیت سے داخل کتاب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ احوال مرہٹہ بھی اسی طرح الحاق کیا گیا ہے۔ مطبوعہ کتاب کا دیباچہ نہایت شاندار ہے اور بڑی قابلیت کے ساتھ لکھا گیا ہے مقالہ اول میں شاہان قطب شاہی کی تاریخ ہے۔ تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے تاریخ قطب شاہی کو بہ تبدیل الفاظ نقل کیا ہے بعض مقامات پر اختلافات روایت بھی نقل کئے ہیں لیکن تحقیق واقعہ کی نسبت کوئی بحث نہیں کی۔ مقالہ دوم کے دیباچہ میں اس کے پانچ باب بتائے گئے ہیں۔ لیکن پانچواں باب نہ کتاب مطبوعہ میں موجود ہے نہ قلمی میں اصل کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے جہاں کتاب کی اجمالی تقسیم بتائی ہے وہاں یہ ذکر کیا ہے کہ اس کے دوسرے مقالے میں احوال سلسلہ عالیہ آصفیہ ادام اللہ ایام دولتہم کا ذکر ہوگا اور خاتمہ میں مجمل احوال مولف۔ لیکن نہ مطبوعہ نسخوں میں مولف کا حال ملتا ہے اور نہ قلمی میں بہرحال کتاب میں قطب شاہی زمانے سے ٹیپو سلطان کی آخری جنگ تک کے واقعات ہیں۔
اگر یہ میر عالم کی تصنیف ہوتی تو ان واقعات تاریخی کی جن میں میر عالم کا تعلق رہا ہے بہ نسبت اس عہد کے اور تاریخوں کے کچھ تفصیل زیادہ ہوتی ہم کو اس تاریخ سے میر عالم کے متعلق تزک آصفیہ سے کچھ بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتے ایک بات البتہ یہ پائی جاتی ہے کہ مصنف

ارسطوجاہ سے شکستہ دل نظر آتا ہے ایک دو مقام پر ان کی کفایت شعاری اور آئین پر اجمالی نظر ڈالی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عالم کو خوش کرنے کے خیال سے مصنف نے ارسطوجاہ کے خلاف خامہ فرسائی کی ہے جیسا کہ عبداللطیف شوستری نے بھی اپنی کتاب "تحفۃ العالم" میں کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا مقالہ ٹیپو سلطان کی آخری جنگ پر ختم کیا ہے جس میں ان کی شہادت ہوئی۔ شہادت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے اس جملہ پر کتاب کو ختم کر دیا۔ "قصہ کوتاہ مشیت ایزدی چناں بود چنیں شد"

(۶) دہ مجلس | ایک اور کتاب میر عالم کے نام سے مشہور ہے اور وہ "دہ مجلس" ہے جس میں واقعات کربلا اردو زبان میں نظم کیے گئے ہیں تقریباً ہر مجلس کے خاتمہ کے شعر میں "میر عالم" نام بطور تخلص کسی نہ کسی دُعا کی تحت لایا گیا ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے والے میر عالم ہی ہیں اور ہر مجلس کے آخری شعر میں تخلص رکھا ہے لیکن ہم نے جب اس کو شروع سے آخر تک تفصیل سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ہر مجلس کے ختم سے دو تین شعر قبل ایک شعر میں بالالتزام "محکم" تخلص رکھا گیا ہے چنانچہ دوسری مجلس کی آخر میں (جو خاتون جنت حضرۃ فاطمۃ الزہرا علیہ السلام کی رحلت کے بیان میں ہے) یہ اشعار ہیں:-

اے محکم عرض کر صد التجا سے جناب حضرت خیر النسا سے
کہ روز حشر یا خاتون کونین بچا لینا مجھے تم بہر حسین
جناب کبریا میں عرض ہے اب سخن سرسبز میرا ہوئے یارب
جو کوئی اس غم سے اب کرتے ہیں آہ انھوں کی عفو ہو تقصیر ساری
کرم سے میر عالم پر اے سبحان
حساب حشر کو تو کیجیو آسان

دسویں مجلس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

عزاداروں کو کب محشر کا ہو غم حسین ابن علی ہے شاہ محکم
یہی ہے عرض اے امت کے سردار رہوں دل سے تمہارا تعزیہ دار
یہ ہوئے میر عالم پر عنایت
شفا دنیا میں عقبیٰ میں شفاعت

بہر حال ہر مجلس میں تخلص محکم رکھا گیا ہے اور سب سے آخری شعر میں میر عالم لایا گیا ہے اور جس شعر میں میر عالم ہے اس میں کسی نہ کسی دینی یا دنیوی دُعا کا التزام رکھا گیا ہے۔ محکم کو میر عالم کا تخلص تصور کرنے میں تامل اس وجہ سے ہے کہ جب تخلص بتا دیا گیا تو پھر خطاب میر عالم کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں تھی اگر اس سے یہ مقصود ہوتا کہ لوگ یہ معلوم کر لیں کہ میر عالم ہی کا تخلص محکم ہے تو کسی ایک مجلس میں اس کا صریحی اظہار ممکن تھا۔ ہر مجلس میں دونوں اسما کی تکرار سے یہ پایا جاتا ہے کہ لکھنے والے محکم نے دہ مجلس لکھی ہے۔ اور میر عالم کی خوشنودی کے لیے ان کا نام ہر مجلس کے آخری شعر میں لکھ دیا۔

حرارت کے نظریے

(از جناب محمد عبد الوہاب صاحب متعلم بی اے کلیہ جامعہ عثمانیہ)

نظریۂ حرارت (Theory of Heat) ڈاکٹر پریسٹن کی نہایت مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ امتحان جامعہ کی تیاری کے سلسلہ میں یہ کتاب میرے زیر مطالعہ رہی اس کے دل کش اور انوکھے طریق تفہیم اور بلند پایہ خیالات کی وجہ سے اس کتاب کے ترجمے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے وقتاً فوقتاً اس کے چند باب کا ترجمہ کیا۔ لیکن سال حال یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کے ام، یس، سی، (طبعیات) کے نصاب میں داخل ہو چکی اور دار الترجمہ جامعہ کے زیر نگرانی اس کا ترجمہ بھی شاید شروع ہو چکا ہے اس لیے میں نے ترجمہ تو ملتوی کر دیا لیکن مقدمہ کتاب میں دو ایک جگہ خفیف سی تبدیلی کرکے اور اصل کتاب سے "ابتدائی نظریات" کا اضافہ کرکے ناظرین مکتبہ کے مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہوں اگر اس سے دلچسپی پائی گئی اور مجھے فرصت ملی تو اس کتاب کا غیر اصطلاحی عام فہم اور دلچسپ حصہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ (وہاب)

بہت تھوڑا عرصہ ہوتا ہے کہ لوگ علمی تجسس کو ذاتی مذاق تک ہی محدود سمجھتے تھے لیکن جوں جوں جدید انکشافات کے معاشرتی اثرات مستحکم ہوتے گئے عوام الناس بھی یہی خیال کرنے لگے ہیں کہ علم ایک دولت ہے اور سائنٹفک تعلیم قومی افتخار کا موجب ہے۔

جب ہم سائنس کے مطمح نظر اور اس کے بلند رتبہ پر غور کریں تو ہمیں چاہیئے کہ اس خیال کو دور کردیں جو عام طور پر سائنس کے متعلق کیا جاتا ہے آج کل عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضروریات وقت کی تکمیل کے لیے چند واقعات کا معلوم کرلینا سائنس دانی ہے لیکن ہمیں یہ باور کرنا چاہیئے کہ چند واقعات سے واقفیت حاصل کرلینے کا نام سائنٹفک تعلیم نہیں ہے اور ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص کسی علم کو بلا کسی ذاتی غرض کے یعنی محض تحصیل علم کے لیے نہ سیکھے۔ اُس وقت تک اس کا علم نفع بخش نہیں ثابت ہوگا۔

تاریخ محض اس کا نام نہیں ہے کہ ہم جنگ وجدال کے کارنامے اور حسن وعشق کے چند افسانے پڑھ لیں اور نہ اس کو تاریخ دانی کہا جا سکتا ہے کہ چند سنین ہمارے حافظہ میں بہ حفاظت تمام موجود ہیں لیکن اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو تاریخ ان معلومات کا نام ہے جو ہم واقعات کی تہ کو پہنچنے کے لیے فراہم کریں اور پھر ان واقعات کا اثر معاشرتی ارتقا پر مشاہدہ کریں یہی حال سائنس کا ہے وہ علم جس کو در اصل "طاقت" اور "اصلی قوت" کے نام موسوم کرنا چاہیئے محض واقعات کے حفظ کرلینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اُن واقعات کو سمجھنے اور اُن کا انطباق

مظاہر فطرت پر کرنے کو اصلی معنوں میں سائنس کہتے ہیں۔

ان ہی معلومات کی جستجو سے نظریات سائنس کی ابتدا ہوتی ہے۔ کسی بنیادی نظریئے کے بغیر ہماری معلومات کے متعلق یوں سمجھیے کہ یہ محض مشاہدات کی ایک طویل فہرست ہے۔ سائنس کے ہر نظریہ کے متعلق ہم یوں تصور کر سکتے ہیں کہ وہ دماغ انسانی کی اُن بے شمار کوششوں کا نتیجہ ہے جو صداقت کی تلاش اور اصلیت کی چھان بین میں کی گئی ہوں۔ چونکہ یہ نظریہ واقعات اور حقایق پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے یہ ایک ربط مسلسل ہے جو ان واقعات کو ایک دوسرے سے منسلک کرتا ہے۔

کوئی نظریہ کیسا ہی قابل قبول کیوں نہ ہو ممکن ہے کہ آخر میں چل کر غیر مستحکم ثابت ہو اس لیے یہ لازم آتا ہے کہ اس نظریئے کو ہم ہر وقت تجربوں کے نتائج کے ساتھ منطبق کر لیا کریں۔ اور اس کی وسعت کے ہر پہلو کی تفتیش کر لیں اس لحاظ سے بھی اور علاوہ ازیں تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی سائنٹفک مضامین کے لیے تاریخی اسلوب بیان نہایت مفید ہے جب اس اسلوب بیان کے ساتھ تفہیم کے لیے مضمون کی تشریح و توضیح بھی کی جاے اور ساتھ ہی رائے و تنقید کے ذریعہ پڑھنے والے میں آزادخیالی اور عقلی زندگی پیدا کی جاے تو ظاہر ہے کہ یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم چند واقعات کو اکٹھا فراہم کر کے مطالعہ کے لیے پیش کریں ہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہر علم میں وہی اسلوب بیان زیادہ بہتر ہے جس میں واقعات کو اس طرح پر سمجھایا جاسکے کہ دماغ پر کوئی بار نہ پڑے اور آسانی کے ساتھ ہر شخص سمجھ لے اور بذات خود ان واقعات کے باہمی تعلق پر غور و فکر کر سکے یہی طریقہ توسیع معلومات اور انفرادی طور پر قوت متخیلہ کی ترقی کے لیے نہایت کارآمد ہے۔

نظریات حرارت کے بیان کرنے میں ہم اسی طریقہ کو کام میں لائیں گے تاکہ نظریات کی ترقی میں تسلسل اور منطقی ربط پیدا ہو اور ساتھ ہی ذرا سے غور و فکر کرنے سے ناظرین پر خود بخود ظاہر ہو جائے کہ یہ تبدیلیاں کس طرح رونما ہوئیں اور موجودہ نظریات کے استحکام اور مزید ترقی کے لیے کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

حرارت کی ماہیت اور مادہ پر حرارت کے اثرات کے متعلق غور کرنے میں جو دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے وہ طبیعیات کے کسی دوسرے شعبہ میں ہونا اگر محال نہیں ہے تو اس قدر آسان بھی نہیں ہے۔ حرارت کا تعلق انسان کی روزمرہ زندگی سے اس قدر گہرا ہے کہ بیان سے باہر۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ برق و بجلی کی یہ بوالعجبیاں محیر العقول ضرور معلوم ہو رہی ہیں اور ان کا اثر روزمرہ زندگی پر سرعت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اور بڑھتا چلا جاے گا۔ لیکن ہم ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچے ہیں جو ان تاثرات کو اسی قدر وسعت حاصل ہو سکے جو حرارت کے مظاہر کو عام طور پر حاصل ہو سکتی ہے۔

حرارت کے اثرات اس قدر واضح اور ہمہ گیر ہیں، حیات انسانی اور قوت نمو پر ان کا اثر اس قدر گہرا ہے کہ پہلے پہل جس کسی نے بھی ان مظاہر قدرت پر غور کیا ہو اس کو تو یہی معلوم ہوا ہو گا کہ اس کرۂ ارضی کی ساری نشو و نما اور انسانی زندگی کی اصلی بنیاد صرف حرارت پر قائم ہے۔ موسم بہار میں کلیوں کا چٹکنا۔ نباتات کی تحریک نمو اور بلبلوں کے دلفریب نغمے، پرندوں کے دل خوش کن چہچہے، غرض یہ تمام ایسی چیزیں ہیں جو ایک متفکر کے دماغ کو ضرور اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اگر ذرا وسعت نظر سے کام لیا جائے تو اس دنیا میں جانداروں کی پیدائش کا راز صرف حرارت کے وجود میں مضمر پایا جائے گا لیکن ان سب سے بڑھکر تو وہ اقتدار ہے جو انسان کو حرارت پر خالق عالم نے عطا فرمایا ہے اور یہی اقتدار اس کو دیگر مخلوقات پر ممتاز کر رہا ہے

یہ امر تعجب خیز نہیں ہونا چاہیے کہ ایک ایسی چیز جو اس قدر طاقتور اور ساتھ ہی ساتھ اس قدر کارآمد ہو اور جو بعض اوقات خطرناک ہونے کے باوجود اس قدر فیاض ہو کسی زمانے میں قابل پرستش سمجھی جائے لیکن یہ حقیقت ضرور حیرت انگیز ہے کہ اس کی تحقیق اور تدقیق کو اُسی قدر نظر انداز کیا گیا جس قدر اس کے احترام میں التزام کیا جاتا تھا۔

جن چیزوں کو انسان روزمرہ استعمال کرتا رہتا ہے اور وہ چیزیں جو روزمرہ زندگی پر عام طور سے اثر کرتی رہتی ہیں انھیں چیزوں کے ساتھ عموماً بے توجہی برتی جاتی ہے انسان کی سب سے پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ قوائے فطرت کو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے استعمال کرے۔ نظریہ سازی کا درجہ بعد کو آتا ہے۔ انسان کے عملی معلومات کا پتہ اُن آثار قدیمہ سے چلتا ہے جو آج تک عجائبات دنیا میں شمار کیے جاتے ہیں اور جو تاریخ کے ابتدائی دور میں معرض وجود میں لائے گئے تھے۔ مصر کے سر بفلک مینار یونان و روما کی عظیم الشان عمارتیں اور ہندوستان کے عظیم الشان منادر اس بات کا پتہ دے رہے ہیں کہ ابتدائی تاریخ عہد میں انسان جر ثقیل اور معماری کے اعلیٰ فنون سے کماحقہ واقف تھا۔

ازمنۂ ابتدائیہ اور ایک حد تک قرون وسطیٰ میں علما و حکما اس عام مرض میں مبتلا پائے جاتے ہیں کہ وہ اپنا علم عام طور پر نہیں بلکہ اپنے خاص خاص شاگردوں کو سکھایا کرتے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم کا ایک بیش بہا خزانہ ہمیشہ پردۂ اخفا ہی میں رہا اور عوام کی قابلیت پر ان علوم کا کافی اثر نہ پڑ سکا۔ اس عہد کے علما و حکما نے کبھی اس قسم کا خیال ہی نہیں کیا کہ اپنی ایجادات کی فہرست چھوڑ جاتے یا اُن انکشافات کو قلمبند کرتے جو انھوں نے اس قدر جاں فشانی کے بعد کیے تھے۔ اس کی وجہ سے متاخرین کی علمی جدوجہد میں جو جو رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں محتاج بیان نہیں۔

حرارت کیا ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جو خود سوال کرنے والے کو عرصہ تک اس حقیقت کے انکشاف میں سرگرداں رکھنے کے بعد پیدا ہوا اور بہ مجبوری تمام اس نے دوسروں سے مدد حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان سے نکالا کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ہر روز گرمی اور سردی سے متاثر ہوں اور ہماری اجتماعی زندگی میں حرارت کا اس قدر بڑا حصہ ہو لیکن پھر بھی ہم اس کے متعلق کبھی غور نہ کریں کہ خود یہ عامل کیا ہے جس کی مدد سے ہمارے سیکڑوں کام بن رہے ہیں اور جس پر ہماری حیات و ممات کا دار ومدار ہے یہ غیر ممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ متجسس نظریں صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتیں کہ حقایق فطرت کا مشاہدہ کر لیں اور ان کی اصلیت اور اسباب و علل کی دریافت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سورج کی گرمی زمین پر اثر کرتی ہے اور اس وقت روشنی یا نور بھی پایا جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جو ابتدا میں مفکرین اور فلاسفہ کے لیے غور و فکر کا باعث ہوئی کہ "نور کیا ہے"؟ اور پھر حرارت کیا ہے؟ سب سے بڑھ کر اسی کی عینیت کا آسان سوال یہ ہے کہ آواز کیا ہے؟ موخرالذکر سوال کے حل اور پھر اس کے مفروضات کی مدد سے مقدم الذکر دونوں سوال بڑی حد تک خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ آواز کے مظاہر پر جب ہم بحث کرتے ہیں تو ایک ایسے واسطے کی حد تک محدود ہوتے ہیں جس کو ہم زیر تجربہ لا سکتے ہوں اور جس کے خواص کو ہم بدرجہ اتم معلوم کر سکتے ہوں لیکن جب نور یا حرارت کے مظاہر پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم ایک معلومہ واسطے سے نکل کر بالکل غیر معلوم اور موہوم واسطے کی حدود میں قدم رکھتے ہیں۔ مرئی اور محسوس بالمس فضا سے نکل کر یکایک غیر مرئی اور غیر محسوس فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ معلوم طریقوں کی مدد سے ہمارے خیالات میں تسلسل پیدا ہونے لگتا ہے اور تخیل کی مدد سے توجیہ کرتے ہوئے ہم اپنے خیالات کو حواس کی سرحد کے باہر آسانی سے لیجا سکتے ہیں۔ مشاہدہ اور تجربے کی وجہ سے انسان کا دماغ اشیا کی خاصیتوں اور ان کے باہمی تعلق سے واقف ہوتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان معلومات کی بنا پر توجیہ و استدلال کرتے ہوئے ہم ایسی چیزوں کے لیے بھی وجہ دریافت کر سکتے ہیں جو غیر معلوم اور غیر محسوس ہوں ان سب کا دار و مدار صرف ان خیالات پر ہوتا ہے جو ہم میں محسوسات اور مرئی اشیا کی مدد سے پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس اور کم فلسفیانہ طریقہ، وہ طریقہ ہے جس میں ہم محسوسات کی توجیہ غیر محسوس اشیا کی مدد سے کریں اور یہ وہی طریقہ ہے جو ابتداءً طبیعیوں نے اختیار کیا تھا۔ قدیم یونانیوں میں ذوق لطیف اور عقلی قوی بدرجہ کمال موجود تھے وہ قدرتی طور پر ممتاز اور پاکیزہ چیزوں کا ادراک آسانی سے کر لیتے ان کا مشاہدہ نہایت درجہ گہرا تھا لیکن طبعیات کے میدان میں انھیں بجز ناکامی ہوئی،

ان کی یہ ناکامی اس وجہ سے نہیں تھی کہ ان میں فہم و ادراک کی ابھی کمی باقی تھی بلکہ انکی ناکامی اُس طریقہ میں مضمر ہے جو انھوں نے طبیعی مظاہر کے استدلال کے لیے اختیار کیا۔ وہ فطرت کے ایک موہوم نظام کے متعلق خیال آرائی کرتے اور توجیہات کی طومار باندھتے لیکن واقعات اور صحیح معلومات کی بنا پر انھیں استدلال نہیں آتا تھا اور اس طرح طبیعی مظاہر کی توجیہ تجربہ اور مشاہدے کی مدد سے نہیں بلکہ خیالی اور محض تصوری استدلال کے ذریعہ کرنا چاہیئے مشاہدات اور واقعات پر غور و فکر کرنے کی بجائے معلومہ چیزوں پر معلومہ چیزوں کے ذریعہ استدلال کرنے میں اپنا سارا زور ختم کر دیتے۔ اس طرح حرارت کے عام اثرات کو سمجھانے کے لیے انھوں نے جواہر ناری (Atmos breatumi) کو ایجاد کیا۔ جو اجسام کے مسامات میں نہایت تندی کے ساتھ گزر جائے اور اس طرح ٹھوس کو مایع اور مایع کو گیس میں تبدیل کر دیتے تھے۔

اگر تجرباتی علوم کی ایک اہم شاخ ہونے کی حیثیت سے غور کیا جائے تو حرارت کا باقاعدہ مطالعہ گذشتہ صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے حرارت کی اصلیت اور اس کے اثرات کے متعلق صرف کیمیا دانوں نے کچھ جستجو کی۔ "احتراق" کی اصلیت کو واضح کرنے کے لیے کیمیا دانوں نے پہلے پہل نظریہ سازی شروع کی جس کی وجہ ہمیں اپنے مضمون کی تہ کو پہنچنے کے لیے اولاً کیمیا کا مطالعہ کرنا ہوگا اور بعد ازاں تجرباتی ذوق کی ترقی پر غور کرنا ہوگا۔

اگرچہ کیمیا دانی کا پتہ قدیم مصریوں میں بھی چلتا ہے تاہم تجرباتی ذوق کی ابتدا ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے بین بین معلوم ہوتی ہے اس کی پیدائش کا زمانہ وہی ہے جبکہ تہذیب اور علوم و فنون عربوں کے زیر سایہ میدان ترقی میں گام زن تھے تحصیل دولت کا واہمہ اس بری طرح ان کا دامن گیر تھا کہ جتنے کیمیا ساز (جیسا کہ اس زمانے میں کیمیا دانوں کو کہا جاتا تھا) اُس زمانے میں گزرے ہیں انھوں نے اپنی ساری کوشش اس بات کے حاصل کرنے میں صرف کر دی کہ جس طرح بھی ممکن ہو معمولی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا راز معلوم کرلیں۔ اسی لیے انھیں تجربات اور عملیات کی طرف مائل ہونا پڑا جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ معلومات میں دن بدن وسعت ہونے لگی اور اس طرح یہ تجربے معلومات انسانی کی تجدید کا باعث ہوئے اور قدیم یونانیوں کے توہمات کا قلع قمع ہونا شروع ہوا۔

جس زمانے میں یونان وروما جہالت اور بربریت کے ذخار سمندر میں غوطہ زن تھے مسلمانوں نے جو پہلے ہی سے ذہنی ترقی میں دیگر اقوام سے سبقت حاصل کر چکے تھے۔ علوم و فنون کے چراغوں سے فضائے عالم کو منور کرنا شروع کر دیا تھا انھوں نے مصر میں فلسفۂ ارسطو اور کیمیا کی تحصیل کی اور شمالی

آفریقیہ سے ہوتے ہوئے آتے کی طرف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ بحر روم کو عبور کیا اور اندلس میں داخل ہوئے یہاں پر انکے عہد فرماں روائی میں فنون لطیفہ اور علم و حکمت چمک اٹھے اور اندلس کے مدارس جملہ عیسائی ممالک کے مرجع بن گئے اور تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا تک عربی کیمیا سازی سارے یورپ میں پھیل چکی تھی۔

جب کوئی قوم عیش و عشرت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کی علمی جد و جہد میں انحطاط ہوتا ہے اور وہ اپنے علوم و فنون کو بھی بھلا دیتی ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا بھی ہے وہ جن کی علمی قوت اس قدر زبردست تھی اور جن کے پاس زندگی کی بنیاد عمل جد و جہد پر موقوف ہے جب عیش پرستی میں مبتلا ہوئے تو علوم و فنون میں ترقی تو ایک طرف خود اپنے دریافت کردہ علوم و فنون سے انھیں مغائرت پیدا ہونے لگی۔ پس بجائے اس کے کہ وہ کسی نئی سائنس کی تلاش کرتے، انھوں نے اپنے پہلے علم کو ہی بھلا دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کیمیا کے ابتدائی انکشافات صرف کیمیا سازی کے تجربات تک محدود ہو گئے اور ان سارے تجربوں کا مقصد "سنگ پارس" اور "آب حیات" کی تلاش اور جستجو تھی یہ ایسی تلاش تھی اور اس کا خیال اس قدر زبردست تھا کہ دوسرے علوم کے انکشاف میں اس وہم نے زبردست رکاوٹ پیدا کر دی۔

سنگ پارس اور آب حیات کی جستجو میں جو تجربے کیے گئے اور جو طریقے اختیار کیے گئے انکی تشہیر صلیبی جنگوں کی مدد سے بھی ہوئی کیونکہ وہ عیسائی جو فتح کے خواب دیکھا کرتے تھے مسلح ہو کر جوق جوق فلسطین پہنچتے تاکہ جس طرح بھی ممکن ہو اس ارض مقدس کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیں لیکن جب وہ یہاں سے لوٹتے تھے تو اس کے ساتھ ہی اُن کے دماغ سنگ پارس اور آب حیات جیسی عجیب و غریب چیزوں کے فریب میں آچکے ہوتے اور اس طرح یہ زمانہ محض سنگ پارس اور آب حیات کی تحقیق کے لیے قابل مطالعہ ہے۔

اس زمانہ میں اقوام مغرب کچھ کچھ تصوف کی طرف مائل نظر آتی ہیں تاہم ہر زمانے میں معلومات کی محبت اور قوت علمی کا احساس عام طور پر لوگوں میں موجود رہا اور اسی وجہ سے وہ تاریکی میں روشنی کے خواہاں رہے اور اس کی طرف نہایت جوش کے ساتھ بڑھے اگرچہ وہ محض مغالطہ اور دھوکے ہی میں کیوں نہ پوشیدہ رہی ہو۔

قرون وسطیٰ میں شجاعت اور توہمات کا دور دورہ رہا لیکن ساتھ ہی یہ وہی زمانہ ہے جس کو ہم تجرباتی طبیعیات کا دور کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس زمانہ کے قلمبند بیانات اور محققین وقت کی

تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مختلف دھاتوں کو ایک دوسرے میں تبدیل کیا جاچکا تھا ان ماہران کیمیا کے خیالات کے قلمبند ہو جانے سے آیندہ تلاش کرنے والوں کے لیے ایک خاص راستہ بن گیا۔

ان کیمیا دانوں میں سے کچھ تو ایسے تھے جو بھولے بھالے اور سیدھے سادھے لوگوں کو دھوکا اور فریب دینا اپنا مقصد عمل اور نصب العین بنائے ہوئے تھے لیکن بعض ایسے بھی تھے جو بذات خود فضول امیدوں کے دھوکے میں مبتلا تھے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ سب اس علم کو ایک معمہ سمجھ کر اس کے حل کرنے کی مسلسل کوشش میں لگے ہوئے تھے یہ لوگ اپنے تجربوں کے نتائج اور طریقۂ عمل کو اپنے خاص خاص شاگردوں سے بیان کرتے اور وہ بھی رمز آمیز طور پر۔ اس طرح انکی اہمیت ہمیشہ مشتبہ ہی رہی۔

اس زمانہ میں لوگوں کو دھوکا دینا اسی قدر آسان تھا جس طرح آج کل مشکل ہے بہت سے حقائق کا انکشاف اس زمانہ میں ضرور ہوا لیکن یہ سب جعلی اور غیر حقیقی چیزوں اور نوادر و عجائب میں مخلوط رہیں اور اسی وجہ سے بعد میں اس کے لیے عرصہ دراز کی ضرورت باقی رہی کہ جھوٹ اور سچ کھوٹے کھرے کو جدا جدا کر کے بتلایا جائے۔

علم کیمیا میں اس زمانہ کے کیمیا ساز نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے غیر ممکن اشیاء کی تلاش میں بہت سی پتے کی باتیں دریافت کرلیں جنکو عملیات اور نظریات ہر دو میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس زمانہ میں بھی بہت سارے کیمیا دانوں نے اپنی تحقیق اور تجسس میں سائنٹفک نقطۂ نظر کو پیش پیش رکھنے کی کوشش کی۔ بہت سے حکما ایسے بھی ملیں گے جنھوں نے عوام الناس سے علیحدہ ہو کر مظاہر فطرت کو طبیعی نقطۂ نظر سے جانچنا شروع کر دیا تھا۔ قدیم کیمیادان عناصر کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ ہر عنصر کسی نہ کسی دیو بھوت یا پری کے قبضہ میں ہے اور یہ غیر مادی اجسام انسان کے قبضہ میں آسکتے ہیں نظام فطرت کے یہ غیر مادی کارندے ان کیمیادانوں کے دل و دماغ پر ہر طرح حاوی تھے وہ مافوق الفطرت باتوں پر عقیدہ رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ معلومات کا ایک ذخیرہ ایسا بھی ہے جس کو ہم اپنے حواس کے ذریعہ حاصل نہیں کرسکتے۔ ان کے جو منطقی اصول پائے جاتے ہیں وہ بالعموم الفاظ کی تمثیل پر مبنی ہیں نہ کہ اشیاء کے باہمی ربط پر۔ جس کا اثر یہ ہے کہ ان اصول کی بناء پر بجائے اس کے کہ وہ صداقت کا انکشاف کرسکیں۔ اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو پوشیدہ کرنے میں حد درجہ کامیاب رہے۔

جب ادبیات یورپ میں جان پڑنے لگی تو ساتھ ہی یہ خواہش بھی پیدا ہوی کہ سائنس میں فلسفی استدلال سے کام لیا جاے۔ اشاعت ادب سے عوام الناس فطرت اور صداقت کے معیار سے واقف ہونے لگے۔ تجرباتی علوم میں ناکامیابیوں کی وجہ سے ہر قسم کی احتیاطیں ملحوظ رکھی جانے لگیں اور جب غلطیوں کا متواتر پتہ چلنے لگا تو عقلی ارتیابیت کی ابتدا ہوی۔ سائنس نے ان روحانی ہستیوں کو اپنی حدود سے نکال باہر کیا اور قوانین فطرت پر بالکلیہ بھروسہ کرنے پر زور دیا۔ جب مافوق الفطرت چیزوں سے میدان خالی کردیا گیا تو اس کے بعد فطری مظاہر کو عقلی استحکام پہنچایا جانے لگا اور اس طرح جن چیزوں کو اعلیٰ روحانی ہستیوں سے منسوب کیا جاتا تھا ان کو بالکل عقلی طور پر سمجھنے کی کوشش ہونے لگی۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں روجر بیکن نے خاص قابلیت اور ذہانت کے ساتھ خود کو تجربات اور مشاہدات میں مصروف کردیا تھا۔ اس کا میلان طبع بالکل فلسفیانہ تھا وہ فطرت کے راز ہاے سربستہ کے انکشاف کا متمنی اور سرچشمہ فنون کی وسعت کا خواہاں تھا گو اس کی تلاش و جستجو کی وجہ سے بعض بعض غیر معمولی روابط معلوم ہوے لیکن نہ تو اس کی اور نہ اس کے ہم عصر البرٹ کی کوششیں اسی زمانے میں موثر ثابت ہوئیں۔ تجربوں سے جن چیزوں کا انکشاف ہونے لگا۔ عوام ان کو سحر کاری اور فسوں سازی سے تعبیر کرنے لگے اور چونکہ یہ زمانہ خانقاہوں کی آب و تاب کا زمانہ ہے اس لئے فلسفہ جدیدہ کو یہ خانقاہ نشین حضرات حسد کی نظروں سے دیکھا کرتے۔

لارڈ بیکن کے زمانے سے قبل تجرباتی علوم کے لئے کوئی واضح نقطۂ نظر نہ تھا اس نے میدان عمل میں انسان کی مشکلات کا مطالعہ کیا اور یہ بتلایا کہ مجبور انسان کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں کرسکتا۔ بعد ازاں اس نے آلات سائنس کو استعمال کرنے کی ہدایت کی اور اس طرح مشاہدین کو غیر جاندار چیزوں سے مدد لیکر اپنے کام کو انجام دینے کا مشورہ دیا اس نے یہ بتلایا کہ انسان مظاہر فطرت کی محض توجیہہ کرسکتا ہے اور صداقت کو محض مظاہر فطرت کے گہرے مطالعہ سے پا سکتا ہے۔ معلومات کے صحیح نظام کو قائم کرنے کے لیے قدما کی کتابوں سے مواد حاصل کرنا یا حقائق فطرت کو مابعد الطبیعی نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کرنا یا اُن کی بنیاد بجاے محسوسات اور مشاہدات کے تخیل پر قائم کرنا بالکل لغو ہے۔ پس ہمیں چاہیئے کہ مشاہدات سے قبل ہی انکشافات فطرت کے خیال خام کو اپنے دماغ سے دور کرکے میدان عمل میں قدم رکھیں اور تجربوں کو وسعت دیں۔

حقائق اور واقعات کو مذاق اور وضع طبیعت انسانی سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ان پر کسی قسم کی تنقید و تبصرہ کی گنجایش ہے اگر یہ حقائق ہمارے اصول موضوعہ کے متضاد واقع ہوں تو وہ

ہمارے لیے باعث برکت ہیں کیونکہ ہمارے نظریات اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ حیثیت میں بھی اشیاء کے صحیح
علم کی غیر مکمل تقربات ہیں۔ طبیعی تجسسات میں شک ہی ایک ہی چیز ہے جو عموماً وسعت عمل کی محرک
بنتی ہے اور اس طرح ہم حقیقت اور صداقت سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ شکوک خیالات انسانی
کو مظاہر فطرت کی طرف اور زیادہ متوجہ کرتے ہیں اور اس طرح مظاہر قدرت کے پس پردہ کام کرنے
والی قوت کا مشاہدہ یا مطالعہ وسیع ہونے لگتا ہے۔ بعض اوقات مشاہدات کی حدود سے ہٹ کر ہمیں
نظریات بنانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو ہمارے احاطۂ محسوسات سے بالکل باہر ہوتے ہیں لیکن
یہ نظریات ہمارے لیے تشفی بخش ثابت ہوتے ہیں جبکہ ہم بعض بعض امور فطرت کی بنیاد کو ان نظریات
پر قائم ہوتی ہوی پائیں۔ فلسفۂ فطرت ایک تجرباتی علم ہے نہ کہ وجدانی۔ کسی چیز کے متعلق ہمیں یہ کوشش
کرنی چاہیئے کہ یہ دریافت کریں کہ "وہ کیا چیز ہے"؟ نہ کہ ہم صرف یہ خیال کرلیں کہ "اس کو کیا ہونا چاہیے"
یا "وہ کیا ہوسکتی ہے"؟ مظاہر فطرت کے باہمی ربط اور دیگر علل نے ان معاملات میں انسانی تخیل کو عرصہ دراز
سے بے تعلق کردیا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں ریاضی اور طبیعیات کے مسائل کی جستجو تہذیب یافتہ ممالک میں
اس کثرت سے ہونی شروع ہوی کہ اس سے قبل اس قسم کا مذاق بہ مشکل کسی ملک میں پایا جائے گا۔ واقعات
کی بنا پر معلومات کو وسعت دینے کا طریقہ اس قدر عام ہوگیا کہ بہت سے محققین اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے
اٹھ کھڑے ہوے۔ اُس وقت انھوں نے یہ سمجھ کر تحقیقات شروع کیں کہ ابھی تک فطرت کا کوئی راز منکشف
نہیں ہوا اور معلومہ شعبہ جات حکمت کے علاوہ بہت سے دیگر شعبوں کی دریافت سے اور دلچسپی بڑھ سکتی ہے
انسانی معلومات میں اضافہ اور انسان کی عقل میں زیادتی کا واحد ذریعہ یہی ہوسکتا ہے۔

فرانس۔ انگلستان اور اٹلی میں مجالس علمیہ قائم ہونے لگیں تاکہ تبادلۂ خیالات میں کسی قسم کی
رکاوٹ نہ ہو اور تحقیقات کے لیے جو اخراجات ہوتے ہیں ان کا بوجھ کسی ایک شخص کی ذات پر نہ پڑے
سنہ ۱۶۵۱ء میں ۱۔ -- Acudemy del ciments کا افتتاح زیر سرپرستی Duke of
Tuscany۔ عمل میں آیا۔ سنہ ۱۶۶۰ء میں Royal society of london اور سنہ ۱۶۶۶ء میں Royal
Academy of sciences of paris کی بنیادیں قائم ہوئیں ان اعلیٰ مجالس کے زیر سایہ نامور اور لایق اشخاص نے جو سائنس
کے مختلف شعبوں میں کافی معلومات حاصل کرچکے تھے کام کرنا شروع کیا تبادلہ خیالات کی وجہ سے مذاق علمی
میں کافی تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ اعلیٰ تحقیقات اور انکشافات علمیہ کے لیے انعامات کے اعلانات سے

کیمیا نے ابھی علمی مرتبہ حاصل نہیں کیا تھا کہ محققین کی توجہ ایک دوسری طرف منتقل ہو گئی۔ نیوٹنی فلسفہ Newtonian Philosophy اپنے آغاز کے ساتھ ہی نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے لگا اس کے اثرات کا اندازہ محض اس سے کیا جا سکتا ہے کہ زبردست محققین وقت اپنے لئے یہ امر باعث فخر سمجھنے لگے کہ وہ نظریات نیوٹن کے متعلق تحقیق اور انکی تنقید کریں۔ ان تحقیقات کا پرجوش خیر مقدم ہونے لگا اور زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ یورپ کے بڑے بڑے محققین نے ان ہی نظریات پر غور وخوض کرنے میں نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزار دیا۔

آخر کار سائنٹفک خیالات کی رَو ایک دوسری سمت بہنے لگی اور اٹھارویں صدی کا نصف آخر "حرارت" کی اصلیت کے باقاعدہ مطالعہ میں گزر گیا۔ اس زمانے میں اس مطالعہ کو Black اور Lavoisier وغیرہ نے وسعت دی جن کے بعد Gay Lussac اور Dalton Ramford وغیرہ نے اس کو جاری رکھا اور تحقیقات علمی میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ان مستحکم بنیادوں پر جو شاندار عمارت قائم کی گئی اس کے دوام کی صورتیں انیسویں صدی میں پیدا ہوئیں Joule اور اس کے ہمعصروں کے کارنامے زرین حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

قدما کے خیالات پر نظر ثانی کرنا اور علم طبیعیات کے متعلق اُن کے خیالات پر نقد وتبصرہ کرنا نہایت سبق آموز ہوگا۔ ان کی تحریرات سے مخترعہ خیال آرائی کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے لیکن ہر جگہ تجرباتی تجسس مفقود ہے۔ خیالی اور من گھڑت مفروضات کے ذریعہ قوانین فطرت کی توجیہ کرنا ان کے لیے بالکل آسان تھا اور وہ طبیعی نتائج کو لایعنی دعووں پر قائم کرتے تھے۔ عوام کو یہ سمجھایا جاتا تھا کہ سیارے اس لیے گھومتے ہیں کہ دائری گردش کامل ہوتی ہے۔ اُن کے پاس نظام طبیعی کا دار ومدار اس پر تھا کہ "خلا محال ہے" اور اسباب اور ان کے نتائج مساوی ہوتے ہیں" جب تک ان چیزوں کا وجود رہا علوم طبیعیہ کی ترقی محال رہی۔ ان دعاوی کا سلسلہ نسلاً بعد نسل جاری رہا یہاں تک کہ قرون وسطیٰ میں آزاد خیالی کے آغاز نے ان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

گذشتہ صدیوں میں جو انکشافات ہوئے ان کے متعلق ہم کو یوں خیال کرنا چاہئے کہ جہالت کی تاریکی میں بعض بعض لوگوں نے علم کو ٹٹولنا شروع کیا اور اتفاقی طور پر ان میں سے بعض علمی روشنی میں پہنچ گئے۔ اُن کے نقش قدم پر چلنے والوں کے لیے اب تو رستہ صاف ہو چکا تھا اس کے بعد جتنی ترقی معلومات میں ہوئی وہ محض ان ناکامیوں اور کامیابیوں کا مشاہدہ ہے جو متقدمین کو دیکھنا پڑیں۔ انسان کے ذہن میں پہلے کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں اس کے بعد وہ کوتاہ نظری تعصب اور دیگر اُن تمام چیزوں کو

دور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو جو اس کو دھوکہ دیتی ہیں توہمات اور ابتدائی غلط تعلیمات کا اثر دور ہونے لگتا ہے جذبات عالیہ نوع انسانی کی خمیر میں داخل ہیں اور زبردست عقل و فہم والوں کے لیے بھی یہ امر مشکل ترین ہے کہ وہ ان لوگوں کی تعلیمات کو محو کردیں جن کی وہ تعظیم کرتے ہیں حالانکہ وہ یہ محسوس کیوں نہ کرتے ہوں اور انھیں یہ صریحاً معلوم کیوں نہ ہو کہ یہ تعلیمات ناقص اور محض غلطیوں کا مجموعہ ہیں۔ غرض اس سارے عرصہ میں یعنی ابتدا سے لیکر انیسویں صدی عیسوی تک کا سارا زمانہ اسی جد و جہد میں گزرا کہ انسان میں آزاد خیالی کا جذبہ پیدا ہوا اور توہمات و تصوف کی بیجا قید و بند سے دائمی نجات حاصل ہو۔ اس ساری جد و جہد کا نمایاں نتیجہ یہ ہے کہ سائنٹفک طریقہ کی جڑیں مضبوط ہونا شروع ہوئیں اور صحت عقلیہ کے آغاز سے سائنٹفک ترقی کی ابتدا عمل میں آئی علمی دنیا میں روحانی اثرات کا استیصال کر کے آزاد خیالی اور اعلیٰ دماغی کوششوں کو ان کی جگہ دی گئی۔

ظاہر ہے کہ ایسے عہد کی تاریخی حالت نہ صرف تعجب خیز ہے بلکہ موخرین کے لیے یہ واقعات درس عبرت ہیں تاکہ وہ اپنی ذہنی ترقی اور وسعت عقلی کی طرف مائل ہوں۔ علوم طبیعیہ میں صرف دعوؤں سے کوئی کام نہیں نکل سکتا اور نہ صرف شعور باطنی کی مدد سے ہم نظام فطرت کے مظاہر کی کڑیوں کو ملا سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ہم نہایت ایمانداری اور ثابت قدمی کے ساتھ تجربوں کو انجام دیکر اور مشاہدات کو اخذ کر کے ان ازہائے سربستہ سے حتی الوسع واقفیت حاصل کریں۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ مابعد الطبیعی خیال آرائی ازمنۂ سابقہ ہی تک محدود ہو چکی اور اب علوم طبیعیہ نے اس کا استیصال کر دیا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک ذہنِ انسانی میں شگفتگی باقی ہے خیال آرائی اسی طرح دل لبھانے والی شئے ثابت ہوگی جیسی کہ قدیم یونانیوں کے عہد میں تھی۔ ایک حد تک یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سائنس کی موجودہ فضا خیال آرائی سے بہ نسبت پہلے کے زیادہ مکدر ہوگئی ہے۔ ہر آنے والا دن اپنے ساتھ بے شمار جدید نظریات اور تازہ انکشافات کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جو زیادہ تر یا تو مشکوک ہوتے ہیں یا محض مفروضی۔ اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ عوام میں ذہنی بے ترتیبی پیدا ہو جائے۔ اب بھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو زمین کے چپٹی ہونے یا دوامی حرکت کے ممکن ہونے کو اپنے ذہن سے دور نہیں کر سکتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی شخص کے ماننے یا نہ ماننے سے اصول فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اصول فطرت ہمارے ذاتی مذاق سے بے نیاز ہیں۔

ابتدائی نظریات :۔ طلوع سائنس سے لیکر گزشتہ صدی عیسوی تک دو نظریات ایسے پائے

جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے مدمقابل معلوم ہوتے ہوں اور ہر ایک نظریہ میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ حرارت کی اصلیت واضح ہو جائے مگر ان کی بنیاد کسی مسلمہ اصول پر نہیں رکھی گئی۔ ایک نظریہ کے مطابق جس کو حراری نظریہ caloric theory کہتے ہیں حرارت کو یوں فرض کیا گیا تھا کہ یہ ایک نہایت لچکدار سیال ہے جو اجسام کے مسامات پر اثر کرتا ہے اور مادہ کے فضائے بین السالمات کو پُر کر دیتا ہے۔ دوسرا نظریہ جو قدامت میں قدیم یونانیوں کا ہم پلہ ہے اور جس میں حرارت کے موجودہ نظریئے کی کچھ بو باس پائی جاتی ہے۔ حرارت کی اصلیت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ کسی جسم کے سالمات کے تیز ارتعاش کا نتیجہ حرارت ہے اور اس طرح نتیجہ کے طور پر حرارت کو حرکت سے متعلق کر دیا گیا۔ اس نظریہ کے موئیدین کی تعداد عرصہ دراز تک نہایت قلیل رہی۔

بیکن لارڈ بیکن پہلا حکیم ہے جس نے اس امر کی کوشش کی کہ نظریات کی بنیاد کو مشاہدہ پر قائم کرے اس نے اپنے ایک رسالہ میں جو طریقۂ انکشافات فطرت پر لکھا گیا ہے اُن تمام اصولی واقعات کو جمع کر دیا ہے جو حرارت کی اصلیت اور اس کے پیدا کرنے کے طریقوں سے متعلق اس وقت تک معلوم ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اس نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کی اصلی وجہ پر کوئی صائب رائے قائم کر سکے۔ رگڑ اور تصادم کے ان مختلف طریقوں کے متعلق غور کرنے کے بعد جن سے حرارت پیدا ہوتی ہے وہ صرف اس نتیجہ پر پہنچ سکا کہ "حرارت حرکت ہے۔"

بیکن کا یہ خیال بہت جلد مقبولیت کے درجہ پر پہنچ گیا مگر اس میں مزید دو ترمیمات کی گئیں انگلستان کے مفکرین نے اس کو یوں تصور کیا کہ حرکت خود اس جسم کے باریک ذرات میں ہوتی ہے جو گرمی کا اظہار کرتا ہے لیکن یورپ کے مفکرین کی ایک کثیر تعداد یوں سمجھتی رہی کہ حرکت جو حرارت کی باعث ہے خود جسم کے ذرات میں نہیں ہوتی بلکہ اس لچکدار اور غیر مرئی سیال کے ذرات میں ہوتی ہے جو اس جسم کے مسامات میں بھر جاتا اور فضائے بین السالمات کو پُر کر دیتا ہے اس سیال کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ وہ ساری کائنات میں منتشر ہے اور کثیف ترین اجسام میں بھی بہ آسانی گھس جاتا ہے ان میں سے بعض تو یہ بھی خیال رکھتے تھے کہ بعض بعض حالات کی تحت وہ نور اور برق کے مظاہر بھی پیدا کر سکتا ہے۔

حراری نظریہ (caloric theory) فلسفیوں کا یہ دوسرا گروہ بہر حال ۱۹ویں صدی ع کے آغاز تک برسر اقتدار رہا وہ برابر اسی پر مصر رہے کہ حرارت حرکت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ کسی جسم پر اس سیال کا عمل ہے جو نہایت لچکدار ہے اور جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے پہلے پہل جو خاصیتیں اس سیال کو دی گئیں وہ صرف یہ تھیں کہ یہ نہایت درجہ لچکدار ہے اور اس کے ذرات آپس میں ایک دوسرے کو شدت کے ساتھ دفع

کرتے ہیں اس سیال کا نام بعد میں کیالورک (caloric) یعنے حرارہ رکھا گیا۔ کیالورک کی اس دوسری
خاصیت کی وجہ سے احتراق کے وقت حرارت اور نور پیدا ہوتے ہیں اس کے بعد ڈاکٹر کلے مارن Dr Cleghorn
نے اس سیال کی ایک اور خاصیت یہ بتلائی کہ اس باہمی اندفاع کے باوجود caloric کے ان ذرات کو
مادہ کے ذرات شدت کے ساتھ جذب کرتے یا کھینچتے ہیں اور مادہ کی مختلف قسمیں ان ذرات کو مختلف قوتوں سے
اپنی طرف کھینچتی ہیں بلاک Black نے اس خیال کی تائید کی پس اس نظریہ کے مطابق اگر بہت سے جسم
رکھے ہوں تو وہ مختلف قوتوں کے ساتھ کیالورک کے ذرات کو کھینچیں گے تو اس انجذاب اور خود ان ذرات کے باہمی
اندفاع کی وجہ سے تعادل قائم ہوگا اور اس تعادل کے قائم ہونے تک کیالورک ایک جسم سے دوسرے جسم میں
گذرتے رہیں گے۔

سیال حرارت کی جو اساسی خاصیت بتلائی گئی وہ یہ تھی کہ وہ غیر فانی ہے اور ہم کوئی طریقہ ایسا نہیں
ظاہر کرسکتے جس کے ذریعہ اس سیال کو پیدا کرسکیں۔ جب جسم گرم ہوتے ہیں تو یہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ ان میں کیالورک
داخل ہوجاتے ہیں اور جب ان میں سے کیالورک خارج ہوتے ہیں تو وہ ٹھنڈے ہوجاتے ہیں اس لحاظ سے اس
سیال میں وہی خاصیت پائی جانی چاہیئے جو عام طور پر مادے میں پائی جاتی ہے اور جو توانائی کے ساتھ بھی شریک ہے
جب ہم مادہ کی اس خاصیت پر غور کریں کہ وہ وزن رکھتا ہے تو اس خیال کی شدت کے ساتھ مخالفت
پیدا ہوجاتی ہے بعض فلاسفہ نے یہ کہا کہ کیالورک میں وزن ہوتا ہے اور بعض یہ کہتے تھے کہ یہ بے وزن ہے اس
امر کے تصفیہ کے لیے تجربے کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ جو تجربات بھی کیے گئے وہ نہایت مشکوک تھے اور ان تجربوں سے
جو بھی نتائج مترتب ہوے وہ بالکل ایک دوسرے کے مخالف ہوتے تھے۔ آخر کار اٹھارویں صدی عیسوی کے
ختم ہوتے ہوتے یہ خیال کیا جانے لگا کہ سیال حرارت ایک غیر وزنی شئے ہے اس خاصیت کی وجہ سے وہ معمولی
مادہ سے ممتاز ہے اخیر میں چل کر کونٹ رمفورڈ Count Rumford نے نہایت احتیاط کے ساتھ حساس تجربوں کو انجام دیکر اس نتیجہ کا
اعلان کیا کہ اجسام کے ظاہری وزن پر حرارت کے اثر کے مشاہدے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل ہے۔

کلے مارن Cleghorn کے نظریہ کی بنا پر حرارئیین calorists نے اس امر کی تشریح کہ مختلف اجسام کے
مساوی اوزان میں مساوی وقفہ کے اندر جو اضافہ تپش میں ہوتا ہے اس کے لیے حراروں کی مختلف تعداد درکار ہے
یوں کی کہ مختلف مادے اس سیال کے ذرات کو مختلف قوتوں کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ اس لیے لازماً ایک ہی
اضافہ تپش کے واسطے بعض جسموں کو زیادہ حراروں کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض کو کم۔ اس نظریہ کے موئدین
نے بعض طبعی مظاہر کی توضیح بھی اسی نظریہ کی مدد سے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اجسام کی حرارت کے اثر سے پھیلنا
ایک فطری تقاضہ ہے کیونکہ حرارہ کے ذرات خود آپس میں ایک دوسرے کو دفع کرتے ہیں جب یہ کسی دوسر

جسم میں داخل ہوں گے تو اس باہمی اندفاع کی وجہ سے اس جسم کے حجم میں اضافہ ہونا ضروری ہے بعض اوقات جب حرارت سے کسی جسم میں سکڑاؤ پیدا ہوتا ہے تو نظریہ کی تائید میں کوئی نہ کوئی توجیہ کر لینا کوئی مشکل کام نہیں۔

بلاک نے یہ فرض کیا کہ حرارے محض آزادانہ حالت یعنی محسوس حرارت کی شکل ہی میں پائے جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ مادہ کی ترکیب میں بھی شامل ہیں اس حالت میں مخفی اور غیر عامل ہوتے ہیں اس طرح بلاک نے حرارت مخفی کو ایجاد کیا جب کیا لورک غیر عامل اور مخفی ہوتے ہیں تو ان کا پتہ تپش پیما کی مدد سے نہیں چلتا۔ اس نقطہ نظر کی بنا پر پانی کو یوں سمجھیے کہ وہ برف اور کچھ حراروں کا مجموعہ ہے اور بھاپ پانی اور مزید حراروں کے مجموعہ کا نام "بلاک" کا یہ دعوائے زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ اماعت محض حرارت ہی کا اثر نہیں ہے مثلاً بعض یہ خیال کرتے تھے کہ پانی بذات خود ایک سیال ہے جو اپنے مختلف ذرات کی مفروضہ کروی شکل پر منحصر ہے۔ جب پانی منجمد ہونے لگتا ہے تو اس میں کسی بیرونی شئے کا اضافہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے منجمد ہونے کے بعد اس کا حجم بڑھ جاتا ہے۔

ایصال حرارت یعنے حرارت کے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوجانے یا خود ایک ہی جسم کے مختلف حصوں میں حرارت کے پھیل جانے کے لیے بھی اسی نظریہ کی مدد سے توجیہ کی جاتی تھی کیونکہ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ حرارے زیادہ تپش کے مقام سے کم تپش والے مقامات کی طرف بہتے ہیں جیسے کہ مایعات بلند سطح سے ہمیشہ پست سطح کی طرف مائل رہتے ہیں زیادہ تپش والے مقامات سے کم تپش والے مقامات کی طرف حراروں کا بہاؤ اس باہمی اندفاع کا نتیجہ ہے جو پہلے ہی سے سیال حرارت کے ذرات میں فرض کر لیا گیا تھا۔

اس حد تک حرارین کے استدلال تشفی بخش ہوتے تھے حالانکہ بسا اوقات وہ زیادہ پیچیدہ اور ناقابل استعمال ہو جاتے تھے۔ آگے چل کر ہم کو خود معلوم ہو گا کہ بعض بعض واقعات ایسے فراہم ہوں گے کہ ہم اُن پر حراری نظریہ کے ذریعہ استدلال نہیں کر سکتے جب تک کہ ابتدائی اصول موضوعہ میں بنیادی اور طبیعی تبدیلیاں نہ کی جائیں۔

سپیرا

(از جناب محمد معین الدین صاحب)

"دو آنے تین پائی" بالے نے نفرت سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "گھنٹے بھر سے چیختے چیختے حلق بیٹھ گیا اور اس کا معاوضہ دو آنے تین پائی"۔

بالے کی نواسی رحمت ایک میلی کچیلی ٹوپی میں دو آنے تین پائی لیے ہوئے اس کے سامنے کھڑی تھی یہ ان کی ایک گھنٹہ کی جانفشانی کا صلہ تھا جو انھوں نے گاؤں میں سانپ کا کھیل دکھانے میں کی اس نے چاروں طرف نظر ڈالی سوائے اس کی نواسی کے کسی آدمی کا پتہ نہ تھا ہجوم راجہ ناگ کے پٹارے میں بند ہوتے ہی منتشر ہو گیا تھا اور جب رحمت ٹوپی ہاتھ میں لیے سلام کر کر کے ہر ایک سے سانپ کے دودھ کے نام سے پیسہ مانگنے کھڑی ہوی تو وہاں دو چار لوگوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بالے کو یہ سناٹا اس حقیر معاوضہ سے زیادہ برا معلوم ہوا۔

"بس۔ رحمت! یہ ہمارا آخری تماشا تھا" اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ان میں سے آدھے سے زیادہ کھیل ختم ہونے کے بعد بھی مشتاق نظروں سے دیکھتے کھڑے رہتے تھے مگر اب انھیں اس کھیل میں مزا نہیں ملتا۔ تھیٹر، سینما، گانے کے جلسوں کو چھوڑ کر وہ یہ معمولی اور سستے کھیل کیوں دیکھنے لگے۔ چھوٹے بچوں کے خیالات بھی اب بدل گئے ہیں۔ اب نئی تعلیم کا اثر ہے انگریزی پڑھنے کا۔ بس اب ہم بھی کل سے یہ پیشہ چھوڑ کر انگریزی پڑھنے لگیں گے"

نفرت سے ہنستے ہوئے اس نے فقرہ ختم کیا مگر یہ طنز سے بھری ہوی ہنسی اس کے دلی رنج کو چھپا نہ سکی۔ رحمت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"نانا! کیا تم سچ مچ ایسا ہی کرو گے" اس نے التماسانہ انداز میں پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ دیکھ تو بھی یہ پیسے بھلا کیوں نہ کروں"

"مگر آج تو تماشہ کچھ اچھا ہی رہا"

"دو آنے تین پائی کی آمدنی والے تماشے کو تو اچھا کہتی ہے۔ خوب گویا یہ پیسے نہیں اشرفیاں [illegible] جلد [illegible] منگائی جاتے ہیں" اس نے تلخ طعنہ آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

رحمت کی بسورتی ہوئی صورت کو دیکھ کر وہ کہنے لگا "رحمت تو نہیں سمجھ سکتی ابھی بچی ہے جب میری عمر کو پہنچیگی تو معلوم ہوگا کہ دو آنے تین پائی صرف دو آنے تین پائی ہیں۔ نہ کچھ کم نہ زیادہ ان سے ہرگز یہ امید نہیں ہوسکتی کہ کل کم از کم دو آنے چار پائی ہی مل جائینگے اور پرسوں ایک پائی اور زیادہ مت رو بچی مت رو" اس نے محبت سے رحمت کے گالوں کو تھپکتے ہوئے کہا۔ رحمت اس کے پھٹے ہوئے کوٹ کی آستین پکڑ کر لٹکنے لگی۔ "نہیں نانا راجہ ناگ کو جنگل میں چھوڑ دینا۔ نہیں خدا کے لئے نہیں" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہنا شروع کیا اور ایک ہفتہ تک دیکھئے۔ آج دھوپ سخت تھی۔ ممکن ہے کہ گرمی سے پریشان ہوکر تماشائی نہ ٹھہر سکے" اونھ۔ اس آج بادل بھی دھوپ پڑنی تھی نہیں۔ پھر وہ کیوں شوق سے کھڑے رہے تھے" اور سات روز" وہ بولی مجھے یقین ہے کہ اس مدت کے اندر کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔

"اس کے قبل بھی تو نے یہی کہا تھا اور میں رضامند ہوگیا آخر کب تک"

وہ سوچنے لگی۔ راجہ ناگ سے اس کو ایسی محبت تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لیے اس کی جدائی گوارا نہ کر سکتی تھی مگر کیا ایک جانور کی محبت کی وجہ سے وہ اپنے نانا کو بھوکوں مرنے دے نہیں اس نے مجبور ہوکر کہا "اچھا نانا جو تمہارے جی میں آئے کرو"

بالے کو ایک برقی جھٹکا سا لگا اور وہ مایوسی کے ساتھ اس کی صورت دیکھنے لگا (بیچاری بھولی لڑکی یہ کیا جانے کہ بالے کو راجہ ناگ سے اس سے کئی گنا زیادہ محبت ہے)

"کیا چھوڑ دوں۔ ہاں؟

"جو تمہارے جی میں آئے کرو"

"خیر تیری خاطر میں رعایت کرتا ہوں اور سات روز تک دیکھوں گا" موقع ملتے ہی اس نے جلدی سے کہا "اگر کاروبار اچھا چلا تو پھر کیا کہنے ورنہ ——— اس نے خوفناک عزم کے ساتھ سر ہلایا۔ رحمت کا دل خوشی سے بھر گیا اس نے ایک خوشی کی چیخ کے ساتھ بونگی کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔

بالے سانپ کی ٹوکری کو باندھنے لگا ایک عورت جو دیر سے سڑک کے اس طرف کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی دفعتاً قریب آئی۔ رحمت کی نظروں میں وہ کوئی عمر رسیدہ بوڑھی معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ درحقیقت اس کی عمر تیس پینتیس سال سے زیادہ نہ تھی اور کہا۔

"میں افسوس کرتی ہوں کہ دیر سے آنے کی وجہ سے تمہارا تماشا نہ دیکھ سکی۔ کیا تم جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ اور شاید ہمیشہ کے لئے" دو آنے تین پائی اس کی جیب میں کھیل رہے تھے۔

"یہ چھوٹی بچی تمھاری بیٹی ہے؟"

"نہیں نواسی"

"آج تمھیں کہیں اور تماشہ تو نہیں کرنا ہے" اس نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

بالے نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے دل میں امید کی چنگاری چمکنے لگی۔

"آج میرے گھر پر تماشہ دکھاوگے؟"

"خوشی سے۔ میں بچوں کا دل بہلانے سے کبھی نہیں تھکتا۔ کتنے بچے ہوں گے۔ اس نے پوچھا۔

وہ فکر میں پڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر کہا کہ

"ہاں۔ بچہ ہی کو تماشہ دکھانے کی ضرورت ہے۔ صرف ایک بچہ کو وہ رک رک کر کہنے لگی۔

"اچھا ٹھیک ایک گھنٹے بعد۔ دیسکھ کا مکان تم جانتے ہو نہ؟ گاؤں کے باہر۔ وہاں آنا۔"

"بہت خوب رانی"

"اور دیکھو۔ اگر ہو سکے تو تنہا آؤ۔ اس سے تمھارے کھیل میں تو کوئی حرج واقع نہ ہوگا؟"

"نہیں۔ رحمت صرف ٹوپی لیکر گھومتی ہے کھیل میں اس کا کوئی حصہ نہیں علاوہ بریں اسے گھر جا کر میرے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔"

"ہاں تو پھر ضرور آنا۔ بھول تو نہ جاوگے تمھیں معاوضہ اچھا دیا جائے گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی۔

گھنٹہ بھر کے بعد بالے دیسکھ کے گھر کے قریب تھا ایک بوڑھا نوکر اس کی راہ دیکھ رہا تھا وہ بالے کو پچھواڑے لے گیا جہاں ایک املی کا درخت تھا۔ مکان کی دوسری منزل کی پچھلی دیوار کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

"یہاں۔ یہاں" نوکر نے املی کے درخت کے نیچے ایک جگہ بتا کر کہا "تماشہ شروع کردو" نوکر بھی چلا گیا۔ بالے حیران پریشان کھڑا کا کھڑا رہ گیا وہ راستہ بھر یہ خواب دیکھتا ہوا آیا تھا کہ دیس مکھ کا گھر ہے۔ کئی خوبصورت اور خوش لباس بچے اس کا استقبال تالیوں سے کریں گے۔ دیکھنے والوں کا ایک جمگھٹا ہوگا اور اسے خوب انعام ملے گا۔ مگر یہاں ایک آدمی کا بھی پتہ نہیں۔ نوکر بھی نظر سے غائب ہو چکا تھا۔ گاؤں کے باہر شام کے وقت۔ جنگل قریب۔ سنسان اور خاموش جگہ پر اس کا کھیل کون دیکھے گا۔ دو منٹ تک وہ (وہ حیرت اور تعجب سے کسی کے آنے کا منتظر کھڑا رہا) مگر کوئی نہ آیا۔ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی اسے خوف دلا رہی

تھی اس کے پیشہ ورانہ غرور کو سخت صدمہ پہونچا۔ کیا خوب! ایک بہترین سپیرا جنگل کے درختوں اور مکان کی پچھلی دیواروں کو تماشا دکھائے اور ذی روح کوئی نہ ہو۔ قریب تھا کہ وہ سانپ کی ٹوکری باندھ کر واپس چلا جائے مگر یکایک اسے خیال آیا کہ معاوضہ اچھا دینے کا وعدہ کیا گیا ہے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی چاہے تماشہ دیکھنے والا کوئی ہی نہ ہو۔ وہ خاموشی کے ساتھ ٹوکری کھول اپنی لونگی نکال سانپ کو اپنے راگ پر نچانے لگا۔ کھیل شروع ہوا ہی تھا کہ اُسے پیروں کی چاپ سنائی دی وہی عورت جو اسے بلا لائی تھی سامنے کھڑی تھی۔

کھیل ختم ہوا رانی نے خوشی کا اظہار کیا اور دیر تک کچھ سوچتی ہوئی کھڑی رہی بالے دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ شاید کھیل میں کوئی نقص تھا جس کی شکایت وہ کرنا چاہتی ہے۔ آخر کار اس عورت نے سر اٹھایا "کھیل کے دوران میں کوئی آواز تو تم نے نہیں سنی؟ ایسی جیسے بچے تمھارے کھیل کو دیکھ کر کیا کرتے ہیں مثلاً ہنسی کی"۔ اس سے پوچھا۔

بالے نے تعجب سے دیکھا کہ وہ بڑی بے چینی اور اضطراب سے جواب کی منتظر ہے۔

"نہیں رانی نہیں۔ یہاں تو شہر خاموشاں کی سی خاموشی طاری تھی اس نے جواب دیا۔

"ہائیں کیا۔ کیا کہا؟" وہ حالت کرب میں بڑبڑانے لگی۔

بالے نے اور زیادہ خوف اور تعجب سے دیکھنا شروع کیا اور کہا۔

"قبر کی سی خاموشی۔ جس کا مجھے خود افسوس اور رنج ہے۔ وہ بہت دیر تک مغموم سر جھکائے کھڑی رہی۔

"مجھے چاہیے تھا کہ پہلے ہی کہدیتی۔ تمھاری یہ شرافت ہے کہ تم نے بغیر اعتراض کیے دیکھنے والوں کے موجود نہ ہونے پر بھی کھیل کیا مجھے کہہ دینے پر مجبور کر رہی ہے، وہ رک رک کر کہنے لگی اور پھر تمھیں یہاں آنا بھی پڑے گا۔ بشرطیکہ میری کہانی سننے کے بعد تم یہاں آنا پسند کرو یہ کھلی ہوئی کھڑکی تم دیکھ رہے ہو" اس نے دوسری منزل (کوٹھا) کی ایک ہی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا بالے نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور متوجہ ہو گیا۔ میرا چھوٹا بچا اس وسیع دنیا میں میری تنہا ملک اس کمرے میں تین ہفتہ قبل انتقال کر گیا اس نے رنجیدہ آواز میں سرگوشی کے طور پر کہنا شروع کیا۔ بالے اظہار رنج و ملال کے طور پر تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔

"مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے اسی گھر میں ہے بلکہ میرے قریب بیٹھا ہے اس کا جسم نہیں تو کم از کم روح۔

"بالکل صحیح رانی" بالے نے از راہ ترحم کہا۔

میرا ننھا بچہ سانپ کا کھیل دیکھنا بہت پسند کرتا تھا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے "اماں مجھے سانپ کا تماشہ دکھاؤ۔ آج بازار میں جب میں نے تمھیں دیکھا تو مجھے اس کی آخری وصیت یاد آگئی اور اس وجہ سے یہاں بلایا کہ شاید تمھارے کھیل کے سبب پھر وہ مجھے مل جائے۔" (اس کی کشش نہایت زبردست ہے رانی، اِس شخص کے لیے جو اس کھیل سے سچی محبت رکھتا ہو مجھے خوب یاد ہے کہ اکثر لڑکوں نے میلوں میرا پیچھا کیا ہے۔ ہاں البتہ اتنا فرق ہے کہ وہ زندہ تھے" اور تمھارا بچہ مردہ" وہ یہ کہتے کہتے رک گیا کہ اس سے اس کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔

"آج کل کے لوگوں کا خیال ہے کہ انسان مرتا ہے تو صرف اس کا جسم فنا ہو جاتا ہے اس کی روح تو زندہ رہتی ہے وہ ہمارے پاس آسکتی ہے ملاقات اور بات چیت کر سکتی ہے۔" اب بالے کی سمجھ میں آگیا کہ ہنسی کی نسبت سوال کی کیا وجہ تھی؟

میں تو اب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ کا لڑکا کھیل کے دوران میں یہاں موجود نہ تھا گو اس نے آواز نہ کی ہو۔ روحیں نظر آئے بغیر سب کچھ دیکھ اور سن سکتی ہیں پھر وہ کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اس کھیل کا ایسا ہی شایق تھا جیسا کہ آپ نے کہا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ تین ہفتہ کے سے قلیل عرصہ میں وہ اسے بھول گیا ہو بچے آخر بچے ہیں چاہے اس دنیا میں ہوں یا اُس دنیا میں"

وہ مایوسی سے ہنسنے لگی اور آنکھیں بے اختیار کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں "اوہ۔ اگر مجھے اس کا یقین ہو جائے ——" اس نے کہا "میں تمھیں زیادہ عرصہ تک نہیں روک سکتی۔ تمھاری بچی منتظر ہو گی۔ کیا تم پھر آسکتے ہو۔ کل نہیں۔ پرسوں۔ اسی وقت۔ تمھارا تماشہ مجھے اور اپنے بچے کے درمیان ملاقات کی ایک زنجیر معلوم ہوتا ہے۔ جب میں تمھارا راگ سنتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے بازو کھڑا ہوا ہنس رہا ہے"۔ بالے نے دوسرے روز آنے کا وعدہ کیا۔ رانی نے اس کو دو روپیہ دیئے اور بغیر شکریہ کا انتظار کیئے چلی گئی۔

دوسرے روز بالے اسی وقت املی کے درخت کے تلے پہونچا اب کے رانی شروع سے اس کے ساتھ تھی کل کی گفتگو کا کوئی تذکرہ نہ بالے نے چھیڑا اور نہ رانی نے۔ بالے کی دلی ہمدردی اب رانی کے ساتھ تھی۔ آج وہ اپنا کمال دکھانا چاہتا تھا۔

راگ شروع ہوا آخری حصہ قریب الختم تھا کہ یکایک لڑکوں کے تیز قہقہے کی آواز کان میں آئی۔ بالے کے ہاتھ سے نونگی چھوٹ پڑی۔ رانی دوڑتی ہوئی مکان میں داخل ہوئی اور کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانک کر [illegible] بالے نے تھیلا دینے کے لیے

اسے یقین دلایا کہ وہ کسی ایسے لڑکے کے قہقہے کی آواز ہو گی جو راستہ چلتے چلتے راگ کی آواز سن کر باہر کھڑا ہو گیا تھا مگر بوڑھے نوکر سے جو اسی کی نگرانی کے لیے باہر بٹھایا گیا تھا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کوئی نہ تھا حسب معمول بالے کو دو روپیے ملے اور دوسرے روز آنے کا وعدہ لیا گیا۔

تیسرے روز بالے پھر پہونچا۔ رانی درخت کے نیچے اس کی منتظر کھڑی تھی اس کے پہنچتے ہی اس نے کھیل کے فوری شروع کر دینے پر اصرار کیا آج وہ نہایت بے چین اور مضطرب تھی۔ راگ شروع ہوا۔ آج کے گانے میں خود بالے کو ایک عجیب لطف مل رہا تھا وہ عالم وجد و بے خودی میں بجائے جا رہا تھا اور یہ تک نہ جانتا تھا کہ اس کے منہ سے کونسا راگ نکل رہا ہے۔ رانی کھڑکی کو تکتی کھڑی تھی۔ فضا میں غیر معمولی ارتعاش تھا۔ راگ نصف کے قریب پہنچا تھا کہ کھڑکی والے کمرے میں کچھ روشنی دکھائی دی۔ مگر کل کے تجربے کے بعد رانی نے ہلنے تک کی جرات نہ کی۔

راگ ختم ہوا اور خاتمہ پر کل سے بھی زیادہ صاف اور تیز آواز میں ایک قہقہہ سنائی دیا آواز بالکل ایک بچہ کے مشابہ تھی۔ بار ایک میٹھی اور صاف۔ ابھی اس قہقہہ کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ رونے اور سسکیاں لینے کی آواز کان میں آئی یہ آواز قریب آتی گئی۔ رانی چونک پڑی۔ بوڑھا نوکر ایک بچی کو کان سے پکڑے گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا رانی غصے سے بالے کو دیکھنے لگی۔

"کیوں یہ تمھاری نواسی ہے نا؟ (نوکر سے) کیا واقعہ ہے"

"جی سرکار۔ یہ بچی باڑ کے سرے پر کھڑی ہوئی تماشا دیکھ رہی تھی آپ کے حکم کے مطابق میں لے آیا"

"ہاں بچی۔ مت رو۔ ابھی ابھی میں نے تیری ہنسی کی آواز سنی ہے اور ابھی تو رو رہی ہے۔ اور بالے۔ اب تم جاؤ۔ اگر ضرورت پڑے تو میں بلا لوں گی۔ خدا حافظ" یہ کہتے ہوئے اس نے پانچ روپیہ کا نوٹ نکالا اور زمین پر پھینک کر چل کھڑی ہوئی۔

بالے کچھ دیر تک پریشان کھڑا رہا۔ اس کو رحمت پر بہت غصہ آ رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ شاید رانی نے خیال کیا ہو گا کہ وہ عمداً اس کو دھوکا دینے کے لیے اپنی بچی کو ساتھ لایا تھا اور ہنسی صرف فریب دینے کے لیے اختیار کی گئی تھی وہ رحمت سے کچھ نہ بولا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ سانپ کی ٹوکری سنبھال چلنے لگا۔ رحمت بالے کی خاموشی سے خوف زدہ ہو رہی تھی اس کے نانا کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے گو وجہ کچھ سمجھ میں نہ آسکی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد رحمت چپکی نہ رہ سکی اور پوچھ اٹھی۔

"نانا ابا رانی نے ہنسی کے متعلق کیا کہا۔ میں دو روز سے برابر یہاں آ رہی ہوں کیونکہ تمھارا راگ کو

دیکھیے اور آپ کا راگ سنے میں رہ نہیں سکتی مگر ہنسی کیا میں تو کبھی ہنسی نہیں۔ پھر رانی نے کیا کہا؟"

"تو ہنسی نہیں" بالے نے تعجب اور حیرت سے پوچھا۔

"نہیں" اس کی نواسی نے جواب دیا۔

ہاں یقیناً اس کی نواسی کی آواز موٹی کرخت اور مدھم تھی مگر اس ہنسی کی صاف میٹھی اور تیز۔

(ماخوذ)

عنقا

از نواب نصیر الدین خاں مہجور ایم اے (اڈنبرا)

شاہد نیرنگ عالم جلوہ فہم انقلاب
محرم راز خموشی چشم واکردہ بہ خواب
ذرہ ذرہ یک ہجوم امتزاج کائنات
عالم عالم جوشش پرواز اجزائے حیات
چشم مستغنی گردش سعیٔ ناکردہ قدم
منظر ہستی بہ پائے آشیاں گیر عدم

عالم نایافتہ کا ہے نشیمن گیر تو
خانہ ویرانی تماشا صورت تعمیر تو

طائر ناآفریدہ بادپیمائے ظہور
نقش پرافشانیٔ خاطر بہ تماشائے ظہور
ہے شبیہ عقل انساں نقش بر آب خیال
معرفت یک وہم عکس آئینہ در پیش حال
ہے ترا آثار نظر نگار تار عنکبوت
دانش عالم ہے تیری یک نگس آہنگ قوت

حسن گوش آرائے دل عالم سے یہ پرواہی کیوں
موسیقی آئینہ جوئے خلوت فردا ہے کیوں
وضع نو طرز ترانہ ہے تری آواز سے
پر صدا ہیں کان میرے نغرہ ہائے راز سے

طبع میں جب موج در موج انبساط و خشم ہو
سطح دریائے تلاطم پوش قعر چشم ہو
جب کہ لب ہوں ذائقہ مانوس نہر انگبیں
جذبۂ توام ہو سرِ بوسۂ عیش آفریں
سینۂ عریاں جو رشک گوہر پارینہ ہو
حیرت نظارۂ عشاق کا آئینہ ہو
روح پرور ذوق و تجدید گنہ کی آرزو
دل میں ہو صد عالم نایافتہ کی جستجو
جب کمال حسن کو پہنچے شباب نازست
فرط حیرت سے ہو عکس خود نمائی دل شکست

عقدۂ مشکل سہی آسان ہے اس کی کشود
بے محابہ ہے جبین ہند کی صرف سجود
فطرت موجود ہے تکمیل مقصود وجود
قوت نامیہ کی نشو و نما میں ہے نمود
حلقۂ جاوید ہے گویا کہ سرہستے و بود

شاہد نیرنگ ہستی آشیاں گیر عدم
مرکز احساس میں تیرے نہاں راز قدم
ابتدائے آفرینش انتہائے حسن عنقا
بے خبر ہم ہیں مگر تو تو سراپا ہوش ہے
ذرہ ذرہ صد جہاں گم شدہ بردوش ہے

ادب اور شخصیت

(از جناب بشارت علی صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ)

آرنلڈ ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ادب زندگی کا نقد و تبصرہ ہے"۔ اگر اس قول کی توضیح کی جائے تو اس کا مدعا یہ ہوگا کہ ادب زندگی کا ترجمان ہے اور یہ ترجمانی مصنف اسی اثر کی تحت کرتا ہے کہ جس کا نقش اس کے دل پر زندگی اور قدرت کے مطالعہ سے کندہ ہوا ہو ایک اور فرانسیسی کہاوت ہے کہ "زندگی ایک آرٹ ہے جس کا مطالعہ ذاتی خصائل اور فطرت کے تحت ہو سکتا ہے"۔ جس طرح آئینہ میں اگر کوئی شخص اپنا عکس ڈالے تو اس کو سوائے اپنی صورت کے اور کچھ نظر نہیں آتا اسی طرح ایک مصنف اپنے مصنفات کی تحت خیالات کی ترجمانی کرتا ہے اور ان خیالات کی تہ میں وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی توضیح صاف الفاظ میں یہ ہے کہ تصنیف ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں مصنف اپنی قلبی گہرائیوں کے نظر آجاتا ہے فی الحقیقت یہ ایک رقمی کارنامہ مصنف کی دل و دماغ کی پیداوار ہوتا ہے اس کے انتخاب الفاظ ترتیب محاورات تخیلات کی پرواز، اسلوب بیان جو اس کی کتاب کا جزو لانیفک ہیں اس کی شخصیت کی ترجمان ہوتے ہیں جو اس کی شخصیت، ذاتی وجاہت علمیت نفس کی چوریاں قلبی نفاستیں سب کو پوست کندہ ظاہر کرتی ہیں ادبیات میں بیوگرافی کو اختصاصی شان حاصل ہے کیونکہ اس سے انسانی زندگی کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے مگر شخصیت کے باب میں وہ اس قابل ہیں کہ کسی زندگی کے واقعات کو من وعن پردہ در کرے شرح وبسط کے ساتھ کسی مصنف کی زندگی کے واقعات پر حقیقت میں اگر روشنی پڑ سکتی ہے تو خود اس کے ذاتی منقوشات اور مصنفات ہیں اس میں شائبہ کی کوئی وجہ نہیں اگر ہم کسی کی کتاب کو اس کی زندگی کا صور گیر تصور کریں جس طرح سے عکاس خانہ میں زندگی کے واقعات پر عکس ڈالا جاتا ہے اسی طرح سے مصنف اپنے واقعات پر اپنی تصانیف میں عکس ڈالتا ہے اور یہی عکس صداقت اور اصلیت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ دوسروں کی قلم کاریاں اس کی تصویر کے خط و خال میں رونق پیدا کر دے سکتی ہیں لیکن مافی الضمیر میں رموز اور دلی اسرار اور گہرائیوں کا پتہ سوائے مصنف کے دوسروں کو میسر نہیں آسکتا۔ مولانا حالی کی قوم پرستی، سرسید کا خلوص، غالب کی خودداری شبلی کی علمیت، اور اسلام پرستی ان سب کا بہترین مظاہرہ ان کے تصانیف سے ہو سکتا ہے اسی اعتبار کی تحت قاری کا سب سے اول کام یہ ہے کہ قبل اس کے کہ وہ ایک ژرف نگاہ طالب علم بنے صرف قاری بننے کی کوشش کرے

اور وہ اس وقت تک مصنف کی تصنیف سے متمتع نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ مصنف کے ہم مذاق بن کر اس کے خیالات اور جذبات کا سچا حامی نہ بن جائے۔ شخصی تجارب سے استفادہ حاصل کرنا اور اُن کے خیالات کے شریک بننا حقیقت میں اسی کا نام ادبی تربیت ہے ایک آدمی کا شہ کار اُسی وقت تک صحیح معنوں میں اختراع فائقہ نہیں ہو سکتا جب تک شخصیت میں رفعت اور بلند پائیگی نہ ہو اور یہی شخصیت کتاب کی جان اور حیات جاوید ہے۔

اُپج کے پیارے نام سے جس چیز کو ہم ملقب کرتے ہیں اس کا مطلب صرف فطری تازگی اور مادۂ اختراعی کے سوائے کچھ نہیں۔ اعلیٰ کتاب کی اختصاصی خصوصیت یہ ہے کہ صداقت کے ساتھ ساتھ اس کے مطالعہ سے ہم کوئی نئی چیز حاصل کر سکیں۔ ادب کے مطالعہ کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ ہم میں یہی صداقت اور خلوص کے ساتھ اپج اور ارتقائے ذہنی پیدا ہو یہی چیز ادب کی تربیت میں مرحلہ اولین ہونے کے علاوہ فائض المرام قاری بننے کے لئے زینہ اختتامی ہے۔

اس سلسلہ میں غلطیوں سے مامون و محفوظ رہنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ایسے ادب میں جس میں مصنف کے تجارب خیالات و جذبات مختصر یہ کہ مصنف کی شخصیت اور اپنی قلبی واردات کی ترجمانی ذہنی کیفیات جابجا جھلک دکھا رہے ہوں امتیاز کیا جائے ایسے ادب سے جو دوسروں کے جذبات اور خیالات کا نچوڑ ہوں آخر الذکر کا کوئی مرتبہ ادبیات میں نہیں ہوتا۔ اگرچہ کہ وہ اسلوب بیان اور الفاظی ذخیرہ کی تحت اعلیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو۔

ادب اور صداقت :- افلاطون صداقت کو ادبیات کا جزو لاینفک قرار دیتا ہے اسی کو کارلائل تمام بڑی بہادریوں کی جان قرار دیتا ہے اسی سلسلہ میں جارج ہنری لیوس رقمطراز ہے کہ "ہم اس بات کے مستدعی نہیں کہ ہر شخص کوئی نئی چیز اور اختراع فائقہ پیش کرے بلکہ ہم اس سے اس بات کی التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنے پُر خلوص سچے اور نایاب تحایف سے مطمئن کرے" ڈاکٹر جانسن بھی اس سلسلہ میں یہی کہتا ہے :- "ہر آدمی سے یہ توقع کرنا کہ کوئی نئی چیز پیش کرے اس کے معنی یہ ہیں کہ مصنفین کی جماعت کو کم کر دیا جائے ایک فہیم آدمی کو مجبور کرنا کہ وہ ہر قومی صورت میں کوئی نئی چیز پیش کرے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تصنیف کو چند صفحات پر مختص کر دیں"۔

اسی سلسلہ میں مضمون کے ابتدائی صفحات میں وہ اہل قلم کی تقسیم مندرجہ ذیل اقسام پر کرتا ہے :-

۱۔ وہ شخص جو ہمارے معلومات میں ایسی چیز کا اضافہ کرے جس سے ہم خالی الذہن ہوں فی الحقیقت ایسی ہستی یکتائے دہر ہونے کے علاوہ فن کار (ماسٹر) ہوگا اور وہ قابل احترام ہے۔

۲۔ وہ جو علمیت کو دل خوش کن اور نئے اسلوب میں پیش کرے حقیقت میں اس سے انسیت بہ حیثیت نافع کے کی جا سکتی ہے۔

۳- وہ جو علم کے ذریعہ زندگی کو معصوم محظوظات سے مملو کرتا ہے اس کا شمار ایک بہترین مصعب میں ہو سکتا ہے وہ مصنف تمغہ شہرت حاصل کرتا ہے جو اظہار مافی الضمیر میں لیت ولعل نہیں کرتا حتی کہ صداقت کی خاطر اپنے معائب نفس کی چوریاں اور قلب کی کمزوریوں کو بھی پوست کندہ ظاہر کر دیتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے متعلق بیان کرتا ہے، دوسرے جو اس کے خیالات کو پڑھتے ہیں اس سربستہ راز کے فاش ہونے سے منفعل ہوتے ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنی شخصیت کی تحت خود کے راز کو فاش کر رہا ہے ایسے ہی کردار کے لوگ دنیا میں شہرت دوام اور زندگی جاوید حاصل کرتے ہیں ورنہ وہ ہستیاں جو اپنے معائب کو پردۂ اخفا میں رکھ کر محاسن کو عوام میں لانا چاہتے ہیں۔ کسی نہ کسی صورت سے ان کے طرز بیان سے غلو اور مکر ظاہر ہو جاتا ہے جس کا لابدی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد گمراہی کی مرگ مفاجات سے فنا ہو کر ہمیشہ کے لیے مستور ہو جاتے ہیں کسی خاص زمانے میں یا کسی خاص انفرادی ہستی میں صداقت کی کمی یا فقدان اس عصر کے ادبیات کو مفقود کر دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بجز صداقت کے کوئی زندہ جاوید کارنامہ کا ظہور ناممکنات سے ہے۔

بالخصوص ارباب قلم کو اس بات کا کافی لحاظ رکھنا چاہئے کہ یہ جو کچھ بھی علمی پیداوار پیش کریں وہ ان کے دماغ اور دل کی کاشت کا نتیجہ ہو۔ اس میں کوئی ہرج نہیں کہ وہ تجارب اور شخصی نقطہ نظر سے کتنے ہی گھٹیا اور حقیر کیوں نہ ہوں۔ وہ شخص عام طور پر وقیع اور بلند رتبہ سمجھا جا سکتا ہے جس کو اپنے بل بوتے کا سہارا ہو اسی لحاظ سے وہی علمی پیداوار زیادہ مستم بالشان ہے جس کا متن شخصی تجارب، خیالات، جذبات معلومات، مشاہدات کا سچا مرقع ہو۔ اجمال اس گفتگو کی یہ ہے "ادب کا حقیقی اور آخری مقصد صداقت اور اخلاقیات ہے لیکن عملی نہیں علمی ظاہری نہیں بلکہ معنوی، منطقی اور استدلالی نہیں بلکہ اصولی اور حسیتی"[1]

کتاب میں شخصیت :- جب کوئی اعلیٰ کتاب جو کسی اعلیٰ مصنف کی پیداوار کا نتیجہ ہو ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے تو نظر امعان سے اس کتاب کے ذریعہ مصنف کی شخصی زندگی کا پتہ لگاتے ہیں۔ اس کی عبارت مفہوم طرز تحریر بلکہ لفظ لفظ کو غور و خوض سے مطالعہ کرتے ہیں اس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ مصنف میں اور ہم میں ارتباط قائم ہو جائے تاکہ مصنف کی شخصیت کے مطالعہ میں سہولت ہو اس کی زندگی اور کائنات کے خوشگوار تعلقات انفرادیت، اور ماحول کی کیفیات پر بصیرت سے روشنی ڈالتے ہیں کیونکہ ان ہی اصولوں کی تحت وہ اپنی شخصیت اور ذاتی وجاہت کی ترجمانی کرتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو روح تنقید ص۵۵ ادب کا حقیقی اور آخری مقصد مصنفہ ڈاکٹر زور

فی الحقیقت اگر امعان نظر سے مطالعہ میں کام لیا جائے تو مصنف کی شخصیت کا پتہ لگانا کوئی دقت طلب بات نہیں ہے ذرا محنت کی ضرورت ہے اگر اس مرحلے کو صبر کے ساتھ طے کرلیں تو ہم کو یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوگی۔ کتاب ہی میں مصنف کی ذات کی جھلکیاں ہم پر ظاہر ہو جائینگی۔ اس کے قلبی، روحانی، علمی اخلاقی و تہذیبی ارتقا کا انعکاس اس کی کتاب میں جا بجا ہوگا۔ کتاب ہی کی مدد سے ہم کو اس کی تعلیمی کیفیت فطرت کی تعمیر کے ذرائع ماحول کا مناظرہ جس میں اس کی پرداخت اور نشو و نما ہوی ہے، طرز سخن، دنیوی لوگوں کے ساتھ اس کا تعلق کائنات کے ساتھ اس کی وابستگی قوت تحریر و تقریر، امعان، مشاہدے کی اہلیت، دنیوی تجارب، غامض مردم شناسی، جبلی اور فطری عادات و اطوار۔ حکیمانہ مشارکت اور ہر طبقہ ناس سے معاشرت غرض ان فروعات کا پتہ چلے گا جو کسی شخصیت کے مجسمے کو بے نقاب کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

جوں ہی اصولی اور منظم ادبی مطالعہ کا سوال پیدا ہوتا ہے اس وقت سے ہماری خواہش اور ولولہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ایک سطحی طالب علم بنیں ایک ایسا طالب علم جو تبحر اور ٹھوس معلومات کی تحت طالب علم کے لقب سے صحیح معنوں میں خطاب کیا جاسکے ہمارے مطالعہ کی شان یہ ہونی چاہیے کہ کتاب کی چھان بین میں بال کی کھال نکال دیں۔ قلمی موشگافیاں لفظی سحرکاریاں ہمارا عام اصول ہو کچھ عرصہ تک اگر ہم اسی اصول پر کاربند رہیں گے تو یہ معلوم کر کے ہماری طمانیت کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ ہم ادبی تحسیات کے صراط المستقیم پر ہیں جس کی وساطت سے کتاب کی شخصیت ایسی ہی ظاہر ہوجائے گی جیسی کہ طلوع آفتاب کے ساتھ دن جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی اصول کے اطلاق سے ہم پر کلیتاً ادب اور زندگی کے تعلقات کا سربستہ راز حل ہوجائے گا۔ جارج الیٹ جو خیال آرٹ کے متعلق ظاہر کرتا ہے اس کی تطبیق ادب سے بھی ممکن ہے۔ چنانچہ وہ بیان کرتا ہے کہ "وہ زندگی کے لیے قریب ترین چیز ہے وہ ایک ذریعہ ہے جس کی وساطت سے تجارب اور بنی نوع آدم سے تعلقات کے وسعت دینے میں مدد ملتی ہے۔" خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ ادبیات حقیقی معنوں میں ایک اعلیٰ پیمانے پر زندگی کی مشارکت کا موقع دیتی ہے۔ اس باب میں ہمارے لیے ایک وسیع میدان تجارب اور نئے تخیلات کا کھل جاتا ہے علاوہ ازیں بشریت کے دائرہ کی متجاوز حد سے عبور کر کے روزانہ واقعات سے بڑھ کر ان مہتم بالشان شخصیتوں سے تعارف حاصل کراتا ہے جو کتاب کی خیالی دنیا کے روح رواں اور فرد نایاب ہیں۔

نیرنگِ زبان

(از جناب ابو الضیاء عبد الکریم صاحب گلؔ حیدر آبادی)

زبان وہ ہے کہ جسمیں ہو خوبیِ تقریر زبان وہ ہے کہ ہو جس زبان میں تاثیر
زبان وہ ہے کہ ہو جس سے عظمت و توقیر زبان وہ ہے کہ جس سے نہ ہو کوئی دلگیر

زباں وہ ہے کہ لطف زبان ہے جسمیں
زباں وہ ہے کہ حسن بیاں ہے جسمیں

زباں میں شوخی ہو رنگینی ہو لطافت ہو زباں میں خوبی ہو شیرینی و نزاکت ہو
ہر ایک جملہ میں اک آن ہو فصاحت ہو ہر ایک فقرہ میں اک شان ہو بلاغت ہو

کلام وہ کہ صداقت ٹپک پڑے جس سے
کلام وہ کہ محبت ٹپک پڑے جس سے

ادا نرالی ہو طرز بیاں انوکھی ہو ہر ایک لہجہ میں اک بانکپن ہو شوخی ہو
ملائمت ہو سلاست ہو اور خوبی ہو عدو بھی بول اٹھے بول چال ایسی ہو

ادھر زبان سے نکلی ادھر جمی دل میں
کہ جیسے لیلےٰ محمل نشین ہو محمل میں

اسی سے ہوتی ہے دنیا میں حرمت و وقعت اسی سے ہوتی ہے عالم میں شوکت و عظمت
اسی سے ہوتی ہے حاصل جہان میں عزت اسی سے ہوتی ہے ہر سو زمانہ میں شہرت

زبان پر ہو جو قدرت ادیب ہوتا ہے
بیان میں ہو جو قدرت خطیب ہوتا ہے

یہی زبان ہے ہمدم یہی زباں دمساز یہی زبان ہے مونس یہی زباں ہمراز
یہی زبان ہے مکار اور یہی غماز یہی زبان ہے بد عہد اور یہی دم باز

یہی زبان سے اچھی بری نکلتی ہے
یہی زبان سے آپس میں تیغ چلتی ہے

کسی کو صدق شعاروں میں نامدار کیا کسی کو اس نے اشاروں میں گنہگار کیا
کسی کو دوستوں یاروں میں بے وقار کیا کسی کو اس نے ہزاروں میں شرمسار کیا

بھلائی پر اگر آئی تو لاجواب ہے یہ
برائی پر اگر آئی تو پھر خراب ہے یہ

زباں کی گرم بیانی بڑی حرارت ہے زباں کی سخت کلامی کڑی مصیبت ہے
زباں کی تیزی و طراری ایک آفت ہے زباں کی شوخی و بیباکی اک قیامت ہے

اسی سے ہوتی ہے پیدا ملال کی صورت
یہی دکھاتی ہے ظالم زوال کی صورت

یہ باتوں باتوں میں جھگڑے کبھی بڑھاتی ہے کبھی یہ بگڑی ہوئی بات بھی بناتی ہے
کبھی بڑھاتی ہے عزت کبھی گھٹاتی ہے کبھی ہنساتی ہے ظالم کبھی رلاتی ہے

قسم خدا کی ہر اک فن میں لاجواب ہے یہ
تمام جسم میں انساں کے انتخاب ہے یہ

اسی کی وعدہ خلافی سے ہوتی ہے خفت دروغ گوئی سے اسکی ہے خلق کو نفرت
ہے بے محل کی کبھی گفتگو سے بے وقعت یہ خود ہی کھوتی ہے کمبخت آپ اپنی ہیبت

رہے یہ کہنے میں اپنے تو بات ہے اے گلؔ
نہیں تو پھر یہ بڑی واہیات ہے اے گلؔ

سید مظفر علی خان اسیرؔ

(از سید محمد ام اے)

واجد علی شاہی دور کے باکمال شاعروں اور بزم رامپور کے سربرآوردہ سخن سرایوں میں اسیرؔ مرحوم ایک بلند پایہ مشاق اور پرگو شاعر گزرے ہیں جس عہد میں لکھنؤ میں چمکے وہ اپنے سیمیائی جلوؤں اور نظر فریب بہاروں کے لیے مشہور تو بہت ہے مگر موجودہ زمانے میں بہ اقتضائے وقت وہ جلوے کافور ہو گئے اور اب وہ عہد افسانوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ آج اس زمانہ کے باکمالوں کی اتنی بھی قدر نہیں کی جاتی ہے جتنی کہ انکے شاگردوں اور نام لیواؤں کی کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ اسیرؔ مرحوم نہ صرف شاعر بلکہ شاعر گر عالم اور ماہر فن شعر و عروض ہونے کی وجہ سے شعرائے اردو کی صف میں قابل قدر جگہ کے مستحق ہیں۔ اردو فارسی شاعری کے ضخیم کلیات کے علاوہ صرف و نحو اور عروض و قافیہ میں بھی کئی کتابیں ان سے یادگار رہیں۔

اسیرؔ مضافات لکھنؤ کے ایک قصبہ امیٹھی میں پیدا ہوئے سنہ ولادت سنہ ۱۲۹ھ بتایا جاتا ہے ان کا خاندان دربار لکھنؤ کا ملازم اور اچھی خدمات پر مامور رہا۔ خاندان کے اکثر افراد علم و فضل کے علاوہ شاعری سے بھی جو عام شرفا کا ایک دلچسپ مشغلہ بلکہ ایک ضروری لازمہ شائستگی تھا متصف تھے۔ ان کے والد میر مدد علی بھی بڑے عالم دربار لکھنؤ کے قدیم ملازم اور محمد صالح کروڑی کی اولاد میں تھے وہ بہ سلسلہ ملازمت لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے۔ اسیرؔ بہت کم عمری میں لکھنؤ میں آ گئے تھے انکی نشو و نما اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر ہی میں ہوئی بچپن سے طبیعت میں تیزی اور جودت تھی بہت ہی کم مدت میں باپ اور چچا سے فارسی کی متداولہ کتابوں حدیث و فقہ اور کچھ حکمت و منطق کی تحصیل کی ایک اور عالم مرزا کاظم علی سے بھی استفادہ کیا۔ علم و فضل کے ساتھ گھر میں شاعری کا بھی چرچا تھا یہ بھی عنفوان شباب میں شعر کہنے لگے۔ استاد وقت شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے آگے زانوئے شاگردی طے کیا مصحفی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ ابھی دو تین سال اسیرؔ کو ان کے ہاں تربیت پاتے نہ گزرے تھے کہ استاد نے وفات پائی۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اسیرؔ نے اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ طبیعت کی جولانی اور شعر و شاعری سے قدرتی لگاؤ سے اس فن میں رفتہ رفتہ اتنی مہارت پیدا کر لی کہ اس زمانے کے بہت بڑے استادوں میں شمار ہونے لگے۔

اسیر خاندانی تعلقات اور اعزاز کی وجہ سے کم عمری ہی میں دربار لکھنؤ میں ملازم ہو گئے اور محکمہ صدر امانت میں امینی کی خدمت پر ان کا تقرر کیا گیا۔ ان ایام میں نصیرالدین حیدر شاہ سریر آرائے سلطنت تھے۔ یہ خود بڑے نیک دل اور مخیر تھے مگر حکمرانی کے جھگڑے بکھیڑوں سے گھبراتے تھے۔ سارا وقت عیش و عشرت میں بسر ہوتا۔ وزیر ریاست کا مختار کل تھا۔ کسی بیگم کی سفارش سے ایک فیلبان وزیر ہو گیا۔ اس نے جو چاہا کیا۔ بادشاہ اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ کسی بات پر بادشاہ اس سے ناراض ہوئے تو اس نے کورنگی کر کے رزیڈنٹ سے بادشاہ کی شکایت کر دی اور خود بادشاہ کو بھی دھمکی دی کہ اگر مجھے وزارت سے علیحدہ کیا گیا تو آپ کے تخت کی بھی خیر نہیں۔ ملازم کی اس بے ہودگی اور احسان فراموشانہ بیباکی نے نازک مزاج بادشاہ کی طبیعت برہم کر دی۔ شراب نوشی کی کثرت سے پہلے ہی قوی مضمحل ہو گئے تھے۔ دفعتہً اس صدمے سے بیمار پڑے۔ موت کا خیال سمایا تو تمام منہیات سے توبہ کر لی اور اطباء کے کہنے کے باوجود جان پر کھیل کر شراب کو جس کا استعمال ان کی زندگی کا جزو بن گیا تھا منہ نہ لگایا۔ آخر ۱۲۵۳ھ میں دس برس حکومت کر کے راہی عدم ہوئے۔ ان کے مرتے ہی تخت و تاج کے لیے دعویداروں میں عجب کشمکش شروع ہوئی۔ مرحوم بادشاہ نے کسی بات پر بیٹے سے ناراض ہو کر اس کو پہلے ہی محروم الارث کر دیا تھا اور اس کی باضابطہ اطلاع بھی رزیڈنٹ کو دے دی تھی۔ باپ کے مرنے پر بیٹا اپنے صلاح کاروں کی سعی سے اس کے باوجود تخت نشین ہو گیا مگر عین جشن تاجپوشی میں رزیڈنسی کی فوج کے گوروں نے کمنڈٹ ڈال دی۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ تخت نشین گرفتار ہو کر معہ اہل و عیال کانپور بھیج دیا گیا۔ اس کی جگہ مرحوم بادشاہ کے ایک چچا مرزا محمد علی شاہ جو کوئی ساٹھ برس کے بوڑھے تھے بادشاہ بنائے گئے یہ بھی چار پانچ برس حکومت کر کے تپ محرقہ سے علیل ہو کر فوت ہو گئے۔

اس طوائف الملوکی اور افراتفری کے زمانہ میں اسیر محکمہ صدر امانت کے گوشہ عزلت کے پابند اور اپنے فرائض خدمت کی ادائی میں چست و چوبند تھے ان انقلابوں اور کھر بدلیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا جب مرزا محمد علی شاہ کے انتقال پر امجد علی خاں بادشاہ ہوئے تو ان کا ستارہ اقبال چمکا۔ امینی سے ترقی کر کے سلطانی کچہری کے سررشتہ دار اور جیل خانے کے داروغہ ہوئے۔ امجد علی خاں کے عہد حکومت ۱۲۵۸ھ تا ۱۲۶۳ھ میں امداد حسین کو جو بادشاہی ملازم تھے بڑا عروج نصیب ہوا۔ وہ ذوالفقار جنگ امین الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہو کر پہلے تو بادشاہ کے پیش دست بنے۔ پھر چند ہی دن میں وزارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ یہ بڑے علم دوست اور مدبر تھے۔ اسیر کی ذاتی قابلیت اور عمدہ کارکردگی کی وجہ سے ان کے حال پر بہت مہربان تھے۔ اسیر کو ترقی دیکر میر منشی کے معزز عہدے پر مامور کیا۔ ۱۲۶۲ھ

میں امجد علی خاں فوت ہوئے اور انکی جگہ واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ امین الدولہ کی توجہ خاص اور اپنے ذاتی کمالات سے اسیر کو نئے بادشاہ کے ہاں بہت جلد خاصا رسوخ حاصل ہوگیا۔ واجد علی شاہ جو خود بھی بڑے پُرگو شاعر تھے اور اختر تخلص کرتے تھے، اسیر کے کلام سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ایک روز کوئی نثر کی کتاب دیکر اس کو نظم کر دینے کی فرمایش کی۔ اسیر نے اس کو منظوم کرکے پیش کیا تو بہت پسند فرمایا۔ اپنے کلام کی اصلاح کے اعزاز سے سرفراز کیا اور ساتھ ہی اپنی فیاضانہ خطاب بخشی سے تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کے خطابات عطا کیے۔ بادشاہ کے استاد ہونے سے اسیر کی شہرت و مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔ ہر وقت دربار میں حاضری کا موقع ملا۔ بادشاہ کے مصاحب بلکہ "ہم نوالہ و ہم پیالہ" بن گئے۔ بادشاہ نے مزید عنایت یہ کی کہ دار وغہ کل بنا دیا۔

اسیر کی خوش اقبالی کا زمانہ کچھ زیادہ طویل نہیں ہوا تھا کہ وہ گردش زمانہ کے شکار ہوگئے امین الدولہ وزیر کے خلاف دربار کے دوسرے ارکان اور بالخصوص بادشاہ کے خسر علی نقی خاں نے توڑ جوڑ شروع کیے اور آناً فاناً بادشاہ کو ان سے بدظن کر دیا۔ امین الدولہ وزارت سے معزول کیے گئے۔ اور انکی جگہ علی نقی خاں کو مدار الدولہ کے خطاب کے ساتھ قلمدان وزارت سپرد ہوا۔ علی نقی خاں نے وزیر ہوتے ہی سابق وزیر کے وابستوں اور ہوا خواہوں کی بیخ کنی شروع کی۔ اسیر گو بادشاہ کی نوازش خاص سے ممتاز تھے اور اپنے علم و فضل بے لوثی، اور صاف گوئی کی بدولت بڑے بارسوخ تھے مگر ان ہی اوصاف کی بنا پر علی نقی خاں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے ایک روز انھوں نے کنایتہً امین الدولہ کی معزولی پر جو انھیں کسی طرح گوارا نہ تھی اور جو ان کی رائے میں ریاست کے لیے سخت نقصان پہنچانے والی تھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ علی نقی نے جو پہلے سے اُن کے خلاف بادشاہ کے کان بھر رہا تھا انھیں اس قصور پر خدمات سے معزول اور اعزاز دربار سے محروم کرکے قید کرا دیا۔ کئی دن اسیری میں کاٹ کر پھر بادشاہ ہی کی عنایت سے رہا ہوئے۔ اس کے کچھ دن بعد ہی علی نقی کی ستم رانیاں، دن دھاڑے رعایا پر ظلم و ستم اور بادشاہ کی غفلتیں رنگ لائیں۔ بادشاہ سلامت تخت حکومت سے اتار دئیے گئے۔ اور کلکتہ میں وظیفہ خوار کی طرح رہنے کا حکم ہوا۔ انھوں نے اسیر کو بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا مگر وہ دربار لکھنؤ سے بالکل شکستہ خاطر ہو چکے تھے کسی طرح بھی بادشاہ کے ساتھ جانا پسند نہیں کیا بادشاہ کے کلکتہ جاتے ہی یہ رامپور چلدیے۔ واجد علی شاہ نے کئی جگہ اسیر کی اس بے وفائی کا گلہ کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں صاحب بہادر جنگ اسیر نوجوانی میں راقم کا ہم پیالہ وہم نوالہ رہا اُس کے باپ دادا میرے دربار کے قدیم نمک خوار رہے اسیر میرا مصاحب اور داروغہ کل

تھا لیکن جب میں لکھنؤ سے کلکتہ چلا تو یہ گھر میں جا چھپا اور مجھے چھوڑ کر نواب رام پور کو اپنا بادشاہ بنالیا"

جس زمانے میں نواب محمد سعید خاں والی رام پور لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اپنے بیٹوں کی تعلیم کے لیے اسیر کو استاد مقرر کیا تھا ان کے انتقال کے بعد جب نواب یوسف علی خاں مسند حکومت پر بیٹھے تو اسیر کے لیے بطور حق استادی کچھ وظیفہ مقرر کردیا۔ یہ انھیں لکھنؤ ہی میں ملا کرتا تھا۔ ۱۲۷۳ھ میں واجد علی شاہ کلکتہ روانہ ہوے تو اسیر نے رام پور کا رُخ کیا۔ نواب یوسف علی خاں بڑی تواضع سے پیش آے۔ معقول تنخواہ مقرر کرکے دربار میں جگہ دی اور اپنا کلام بھی اصلاح کے لیے دکھانے لگے۔ یوسف علی خاں کے بعد ان کے جانشین نواب کلب علی خاں نے بھی اسیر کی سرپرستی و قدر افزائی میں کمی نہیں کی۔ اسیر کی زندگی کے یہ آخری ایام نہایت اطمینان اور فارغ البالی میں گزرے۔ دربار رام پور میں ہر وقت شاعرانہ صحبتیں گرم رہتی تھیں دلی لکھنؤ اور دیگر مقامات کے باکمال شعرا ہر وقت دربار میں حاضر رہتے۔ بزلہ سنجی شعر گوئی اور خوش مذاقی کی یادگار بزم قائم تھی اسیر یہاں کی محفلوں میں خوب چمکے اور بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ۱۲۹۹ھ میں یہیں وفات پائی۔ اور اپنے مکونہ مکان کے قریب دفن ہوے۔

اسیر کی مشق سخن پچاس ساٹھ برس سے بھی زیادہ کی تھی اگرچہ انھیں اپنے استاد سے کچھ زیادہ فیض اُٹھانے کا موقع نہ مل سکا لیکن شعر و شاعری سے جو قدرتی لگاؤ ان کی طبیعت کو تھا اور مسلسل مشق سخن نے انکی شاعری کو بڑی ترقی دی اور اپنے زمانہ کا استاد سخن بنا دیا۔ لکھنؤ کی شاعرانہ صحبتوں کا بھی انکی تربیت اور شاعری کی ترقی و اصلاح میں بڑا حصہ ہے۔ رام پور میں تو انکی استادی مسلم تھی اور بڑے بڑے اساتذۂ وقت کے پہلو بہ پہلو دادِ سخن حاصل کرتے تھے اسیر کے شاگردوں کی فہرست خاصی طویل ہے ان میں بہت سے اعلیٰ پایہ شاعر ہیں بعض باکمالوں نے خود استاد کی ذات کو فخر و مباہات حاصل ہے ممتاز شاگردوں میں امیر احمد امیر مینائی، منشی احمد علی شوق قدوائی۔ الٰہی بخش نازش۔ ریاض احمد ریاض، فیضل رسول خاں واسطی۔ ماہر لکھنوی۔ ظہور لکھنوی یوسف لکھنوی۔ اسد۔ سرشار، ابرار و صفدر قابل ذکر ہیں اسیر کے دو بیٹے حکیم اور افضل بھی باپ کے شاگرد۔ صاحب دیوان شاعر اور لکھنؤ کے عمائدین میں سے ہیں۔

اسیر نہ صرف اردو کے کہنہ مشق شاعر تھے بلکہ فارسی شعر گوئی بھی اس زمانے کے تعلیم یافتوں و اہل علم کی طرح کیا کرتے تھے فارسی میں ان کا ایک ضخیم دیوان "گلشن تعشق" اور "ذولسانین" جو نوابانِ رامپور کے مدحیہ قصیدوں کا مجموعہ ہے موجود ہیں اردو میں چھ دیوان ہیں جن میں سے چار چھپ چکے ہیں۔ مولف خمخانہ جاوید نے چاروں مطبوعہ دیوان سے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ مثنویوں کی بھی خاصی تعداد ہے جن میں سے ایک درۃ التاج شایع ہوچکی ہے۔ اسیر کے کلیات میں ہر صنف سخن کا کلام کثرت سے ہے اور ان کے زورِ طبع اور قدرت بیان کا کافی ثبوت ہے۔ اس زمانہ کی لکھنوی

شاعری کی عام خصوصیت یعنے لفظی رعایتوں اور صنعتوں کا التزام ان کے ہاں بھی ہے اور بہت ہے۔ شعروشاعری کے علاوہ صرف ونحو اور علم وعروض میں بھی کئی رسالے اُن سے یادگار ہیں ایک رسالہ "زرکامل عیار شرح معیار الاشعار" مطبوع اور شایع ہو چکا ہے۔

پردۂ قدرت

(از جناب محمد اقبال صدیقی صاحب اقبال)

پردہ اگر نہ ہوتا تھا انتظام مشکل ۔۔۔ پردے میں ہو رہے ہیں دنیا کے کام مشکل
کس طرح چین آتا کیونکر حیات ہوتی ۔۔۔ دن کی جو روشنی میں پردہ نہ رات ہوتی
پردے کی سب ہے قوت اعضا میں کچھ نہ ہوتا
پردہ اگر نہ ہوتا دنیا میں کچھ نہ ہوتا

پروانہ کا نہ سنتا اپنا نہ حال کہنا ۔۔۔ اے شمع کس سے سیکھا پردے میں بیٹھ رہنا
پردے میں تو چھپی ہے کیا دل بڑا دیا ہے ۔۔۔ تو جان لے رہی ہے وہ جان دے رہا ہے
پروانہ کو میسر ہرگز تپش نہ ہوتی
پردہ اگر نہ ہوتا ایسی کشش نہ ہوتی

کوئی صدا سنی جب یاد نگار آئی ۔۔۔ دل نے کہا تڑپ کر آواز یار آئی
نالے نہ دربدر ہم یوں دلخراش کرتے ۔۔۔ پردہ جو وہ نہ کرتا کس کو تلاش کرتے
پردہ میں رہ کے یار پردہ نشیں نے مارا
پردہ سے اس نے ہم کو سو سو طرح پکارا

پردہ میں کیوں چھپا ہے اے نور بے نیازی ۔۔۔ ہر شان سے عیاں ہے تیری کرشمہ سازی
باغ جہاں پہ تیرا احسان ہے غائبانہ ۔۔۔ ہر پتا کہہ رہا ہے ہم سے ترا فسانہ
اقبال کون ہے جو قائل نہیں تمھارا
پردہ سے باہر آنا مشکل نہیں تمھارا

مترجمہ جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

پھاگن کی پورنما ہے۔ آم کے بوروں کی خوشبو سے بسی ہوئی موسم بہار کی ہوا چل رہی ہے۔ تالاب کے کنارے ایک پرانے لیچی کے درخت کے گھنے پتوں میں سے کسی بے خواب تھکے ماندے پپیہے کی الاپ مکرجیوں کے مکان کی ایک بے خواب خوابگاہ میں داخل ہو رہی ہے۔ ہیمنت کچھ چلبلے پن سے کبھی تو اپنی بیوی کے بندھے ہوئے سر کے بالوں میں سے تھوڑے سے بال کھول کر اپنی انگلیوں میں لپیٹتا ہے۔ کبھی اس کے کڑے اور چوڑیوں کو ٹکرا کر بجاتا ہے اور کبھی اس کے جوڑے میں لپٹے ہوئے پھولوں کے گجرے کو نکال کر اس کے منہ پر رکھ دیتا ہے۔ شام کے وقت کے کملائے ہوئے پھول کے پودے کو تروتازہ کرنے کے لیے ہوا جیسے ایک دفعہ ادھر سے اور ایک دفعہ ادھر سے ذرا ذرا ہلا جھلا دیتی ہے۔ ہیمنت کی بھی کچھ کچھ وہی حالت تھی۔

لیکن کسم روبرو کے چاند کی چاندنی میں فضائے بسیط کی جانب دونوں آنکھیں گاڑھے چپ چاپ بیٹھی ہے شوہر کی چنچلاہٹ اسے چھو کر۔ ٹکرا کر پیچھے لوٹ جاتی ہے آخر میں ہیمنت نے کچھ بیتابی سے کسم کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچا تانی کی اور کہا "کسم کہاں ہو تم؟ تم تو اتنی دور پہنچ گئی ہو کہ دوربین سے بڑے غور کے ساتھ دیکھنے پر بمشکل کہیں بوندسی دکھائی دیتی ہو۔ میری بڑی تمنا ہے کہ آج تم ذرا پاس آجاؤ۔ دیکھو تو سہی کیسی سہانی رات ہے!"

کسم نے چاندنی کی طرف سے نگاہ اٹھا کر ہیمنت کی جانب رخ کیا! اور کہا "یہ چاندنی رات یہ موسم بہار کی ہوا اسی گھڑی طلسم بن کر ہوا ہو جا سکتی ہے۔ میں ایک ایسا منتر جانتی ہوں"

ہیمنت نے کہا۔ "اگر جانتی ہو تو اس کے اظہار کی ضرورت نہیں بلکہ ایسا اگر کوئی منتر یاد ہو تو جس سے ہفتہ میں تین چار اتوار پڑیں یا رات شام کے پانچ ساڑھے پانچ بجے تک ٹھہر سکے تو اسے سننے کے لیے میں تیار ہوں" یہ کہتے ہوئے اس نے کسم کو اور بھی اپنی جانب کھینچنا چاہا۔ کسم اس بغلگیری کے پھندے میں پھنسنے نہ پائی کہنے لگی "ہتے دم جو بات تم سے کہنا چاہتی تھی اسے آج ہی کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج تم مجھے کتنی ہی سزا کیوں نہ دو۔ میں اسے بڑی خوشی سے سہہ سکوں گی۔"

سزا کے بارے میں جے دیو کا ایک شلوک سنا کر ہیمنت اسکو پرکیف کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس اثنا میں غصہ سے آتے ہوئے کسی کے سلیپر کی چٹ چٹ آواز قریب تر سنائی دینے لگی۔ یہ ہیمنت کے باپ ہری کا ہر کی جانی پہچانی آہٹ تھی۔ ہیمنت گھبرا گیا۔ ہری ہر نے دروازہ کے پاس آ کر غصہ سے گرجتے ہوئے کہا "ہیمنت! ہو کو ابھی گھر سے فوراً ہی باہر نکال دو" ہیمنت نے عورت کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ عورت نے کچھ بھی تعجب ظاہر نہیں کیا۔ صرف دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر اپنی پوری قوت اور جوش سے اپنے کو گویا اوجھل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ بادنسیم کے ساتھ پپیہے کی سریلی الاپ مکان میں گونجنے لگی۔ کسی کے کانوں تک پہنچی دنیا بے انتہا دلفریب ہے۔ لیکن پھر بھی اتنی جلدی برہم ہو جاتی ہے۔

(۴)

ہیمنت نے باہر سے لوٹ کر عورت سے پوچھا "کیوں یہ بات سچ ہے؟"

عورت نے کہا "ہاں سچ ہے۔"

"اتنے دنوں سے کہی کیوں نہیں تھی؟"

"بہت دفعہ کہنے کی کوشش کی پر کہہ نہ سکی میں بڑی پاپی ہوں۔"

"تو آج سب کھول کر کہہ دے"

"کسُم نے سوچ بچار کے ساتھ ڈھٹائی سے سب حال کہہ سنایا۔ گویا وہ نہ رکنے والے قدموں سے پامردی کے ساتھ دہکتی ہوئی آگ میں سے ہو کر نکل گئی۔ کس قدر شورش تھی کوئی سمجھ نہ سکا۔ سب سن کر ہیمنت اٹھ کر چل دیا۔ کسُم نے سمجھا خصم جو چلے گئے اُن کو اب وہ پا نہیں سکتی۔ ذرا بھی تعجب نہ ہوا یہ واقعہ بھی گویا روزمرہ کے اور واقعات کی مانند بالکل قدرتی طور پر اس کو پیش آیا۔ دل پر ایک عجیب ہی پژمردہ خاموشی طاری رہی۔ بار بار اسے دنیا اور پریم شروع سے لیکر آخر تک جھوٹے اور خالی معلوم ہونے لگے۔ ہیمنت کی گزشتہ پریم کی ساری باتیں یاد کر کے نہایت ہی ناگوار اور تکلیف دہ ہنسی ایک تیز بے رحم چھری کی مانند اس کے دل پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک داغ کر گئی۔ شاید اُس نے سوچا ہو۔ جس پریم کو وہ اتنا سمجھتی تھی۔ اتنا معزز اتنا موقر جس کے پل بھر کی برہ ایسی دل دو بھر کانٹے والی تھی جس کے لمحہ بھر کا ملاپ ایسا دلنواز تھا کہ غیر محدود و لاانتہا ہی معلوم ہوتا تھا۔ ایک جنم سے دوسرے جنم تک بھی جس کے انتہا کا قیاس نہیں ہو سکتا وہی پریم ہے یہ! بس اتنی ہی نیو پر کھڑا تھا وہ! سماج نے جونہی ذرا سی ٹھیس لگائی وہ غیر محدود لاانتہا ہی پریم جھٹ سے پاش پاش ہو کر ایک مشت خاک بن گیا! ہیمنت ابھی کچھ دیر پہلے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کانوں کے پاس کہہ رہا تھا "کیسی سہانی رات ہے" وہ رات تو ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اب بھی وہی پپیہا بول رہا ہے۔ وہی بادنسیم مسہری کو جنبش دے جاتی ہے۔ وہی چاندنی میٹھی نیند سوتی ہوئی حسینہ

کی طرح دریچہ کے پاس کے پلنگ کے ایک کنارے سے ٹل کر پڑی ہوی ہے۔ سب کچھ جھوٹ ہے! پریم مجھ سے بھی زیادہ جھوٹا ہے فریب ساز ہے۔!

(۳)

دوسرے دن صبح ہی بے خوابی سے پژمردہ ہیمنت پاگل کی طرح پیارے شنکر گھوشال کے گھر پہنچا۔ پیارے شنکر نے پوچھا" کہو بھائی سیم کیا خبر ہے!" ہیمنت نے دھکتی ہوی اور اونچے شعلوں سے جلتی ہوی آگ کی مانند کانپتے کانپتے کہا" تم نے ہماری ذات خراب کردی ہے۔ ستیاناس کیا ہے۔ تمھیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی" کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ سانس پھولنے لگا۔ پیارے شنکر نے ذرا مسکراتے ہوے کہا۔

"اور تم لوگوں نے ہماری ذات کی نگہداشت کی ہے" ہمارے سماج کی رکھشا کی ہے۔ ہماری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا ہے! ہم پر تم لوگوں کی بڑی مہربانی ہے۔ بڑا پریم ہے کیوں؟"

ہیمنت نے چاہا کہ اسی وقت پیارے شنکر کو غصے کی آگ سے بھسم کردے۔ پر اُسی آگ میں خود جلنے لگا پیارے شنکر بڑے مزے سے جوں کا توں بیٹھا رہا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ہیمنت نے بھرائی ہوی آواز میں کہا" میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟"

پیارے شنکر نے کہا۔ میں پوچھتا ہوں۔ میری ایک لڑکی کے سوا اور اولاد نہیں۔ میری اس لڑکی نے تمھارے باپ کا کیا قصور کیا تھا" "تم تب چھوٹے تھے بچے تھے اس کے اندر بڑے بڑے گل ہیں کھلیں گے تب دیکھنا"

"میرا داماد نوکانت جس وقت میری لڑکی کا زیور چرا کر ولایت بھاگ گیا تھا تب تم بچے تھے بعد ازاں پانچ برس کے بعد وہ جب بیرسٹر ہو کر وطن لوٹا تب محلے میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ شاید تمھیں کچھ کچھ یاد ہو۔ تم تب کلکتے کے اسکول میں پڑھتے تھے تمھارے باپ گاؤں کے سرپنچ بن کر کہا کہ لڑکی کو اگر داماد کے ہاں بھیجنے کا ارادہ ہو تو بھیج دو اسے پھر گھر نہیں لاسکتے۔ میں نے اُن کے ہاتھ پیر چھوئے منت کی" بھیا اس دفعہ تم مجھے بچالو۔ میں نے لڑکی کو گوبر کھلاکر کفارہ ادا کیا ہے آپ لوگ اُسے ذات میں داخل کرلیجئے۔ تمھارے باپ کی طرح بھی راضی نہ ہوے میں بھی اپنی اکلوتی لڑکی کو نہ چھوڑ سکا۔ ذات چھوڑ کر وطن چھوڑ کر کلکتہ میں آرہا۔ یہاں آکر بھی پنڈ نہ چھوٹا۔ اپنے بھتیجے کے بیاہ کی جس وقت میں پوری تیاریاں کر چکا تو تمھارے باپ نے جاکر لڑکی والوں کو ایسا بھڑکا دیا کہ آخر بیاہ ہوا ہی نہیں میں نے عہد کیا کہ اگر اس کا انتقام نہ لے لوں تو برہمن کی اولاد نہیں۔ اب شاید کچھ کچھ سمجھ گئے ہونگے۔ پھر تھوڑی سی اور سن لو۔ ساری باتیں سن کر تم خوش ہو جاوگے اس میں بڑا لطف ہے۔

"تم جب کالج میں پڑھتے تھے تمھارے گھر کے پاس ہی وپرداس چٹرجی کا مکان تھا۔ بچارا بڑا بھلا مانس تھا اب انتقال کر چکا ہے۔ چٹرجی صاحب کے مکان میں کسم نامی کمسن بیوہ یتیم کایستھ لڑکی بیکسی کی حالت میں

رہتی تھی لڑکی بڑی خوبصورت تھی۔ بچارا بوڑھا برہمن کالج کے طلبہ کی نظروں سے اسے محفوظ رکھنے کے لیے ذرا پریشان سا ہو گیا تھا پر بوڑھے آدمی کو چکمہ دینا ایک لڑکی کے لیے معمولی بات تھی۔ لڑکی اکثر کپڑے سکھانے کے لیے چھت پر جایا کرتی اور تم بھی شاید چھت پر بغیر گئے سبق یاد نہ ہوتا تھا آپس میں دونوں کی چھت پر کوئی بات چیت ہوتی تھی یا نہیں یہ میں نہیں جانتا پر لڑکی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر بوڑھے کو شبہ ہوا۔ کیونکہ کام دھندے میں اس کی اکثر بھول چوک پائی جاتی اور تپ سوامی گوری کی طرح دن بدن آب و خواب چھوڑنے لگی۔ بعض وقت شام کے وقت وہ بوڑھے کے سامنے ہی بلاوجہ آنسوؤں کو روک نہیں سکتی تھی۔

آخر بوڑھا تاڑ گیا کہ چھت پر تم دونوں کا وقت بے وقت خوب میل جول ہوا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ کالج میں غیر حاضر ہو کر دوپہر میں چھت کے ایک گوشے میں زندگانی کے سایہ میں بیٹھ کر تم کتاب کے صفحے الٹا کرتے تھے تنہائی کے مطالعہ میں یکایک تمہارا اتنا شوق بڑھ گیا تھا کہ ویرداس جس وقت میرے پاس صلاح لینے آیا تو میں نے کہا چچا تم تو بہت دنوں سے کاشی جی جانے کی سوچ رہے ہو۔ لڑکی کو میرے پاس چھوڑ کر تم تیرتھ باسی جاؤ۔ میں اس کا بار اپنے سر لیتا ہوں''

''ویرداس تیرتھ کرنے گیا۔ میں نے اس لڑکی کو سری پتی چٹرجی کے گھر میں رکھ کر سی کو لڑکی کا باپ مشہور کر دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تم جانتے ہو۔ تم سے شروع سے لے کر آخر تک سب باتیں بیان کرنے میں مجھے بڑا لطف آیا۔ جیسے کوئی کہانی ہے۔ طبیعت تو چاہتی ہے کہ اسے پوری لکھ کر ایک کتاب چھپاؤں۔ پر مجھے لکھنا نہیں آتا۔ سنتا ہوں میرا بھتیجا شدھ بدھ لکھنا جانتا ہے اسی سے لکھانے کی خواہش ہے مگر تم اور وہ دونوں مل کر لکھیں تو بہت ہی اچھا ہے کیونکہ سرگذشت کی جزئیات مجھے بخوبی یاد نہیں''

ہیمنت نے پیارے شنکر کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ بولا۔ کسم نے اس بیاہ کی بابت کوئی شکایت نہیں کی'' پیارے شنکر نے کہا ''شکایت کی تھی یا نہیں سمجھنا ٹیڑھی کھیر ہے۔

جانتے ہو بیٹا وہ عورت ٹھہری جس وقت ''نا'' کہے تو ''ہاں'' سمجھنا چاہیے پہلے پہل تو نئے مکان میں آکر تمھیں نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے کیسی پگلی سی ہو گئی'' تم نے بھی نہ جانے کیسے پتہ لگا لیا اکثر کتابیں ہاتھ میں لیے کالج جاتے ہوئے تم راستہ میں بھول جایا کرتے اور سری پتی کے مکان کے سامنے نہ جانے کیا ڈھونڈا کرتے۔ ٹھیک پریسیڈنسی کالج کا راستہ ڈھونڈتے ہو۔ ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا دراصل کسی بھلے آدمی کے گھر کی چلمن سے کیڑے پتنگوں اور وارفتہ نوجوانوں کے دل کو راہ ہوا کرتی ہے یہ سن کر مجھے بڑا قلق ہے۔ دیکھا تمہاری پڑھائی میں بہت ہرج ہو رہا ہے اور لڑکی کی اوقات خراب ہو رہی ہے''

''ایک دن کسم کو بلا کر کہا ''بیٹا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ تو جس

کو دل سے چاہتی ہے میں جانتا ہوں لڑکا بھی مٹی ہوا جا رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ دونوں کا میل ملاپ ہو جائے سنتے ہی کسم دفعتہً رو پڑی اور تیزی سے بھاگ گئی۔ اسی طرح اکثر کبھی کبھی شام کو سری پتی کے گھر جا کر کسم کو بلاتا اور اس سے تمہارا ذکر کرکے حجاب کو دور کرتا اتنے میں اس کا حجاب جاتا رہا اور لگاتار روزانہ سبق پڑھا پڑھا کر میں نے اسے سمجھا دیا کہ بجز بیاہ کے دوسرا کوئی علاج نہیں اس کے سوا ملاپ کی کوئی صورت نہیں۔ کسم نے کہا "کس طرح ہوگا" میں نے کہا "خاندانی کنواری لڑکی بتا کر چلا دوں گا۔ بہت بحث بحثی کے بعد اس نے تمہاری رائے دریافت کرنی چاہی میں نے کہا "وہ تو ویسے ہی پاگل سا ہو رہا ہے اس سے پریشان کن باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ بلا دقت اطمینان سے کام ہو جانا ہی ہر دو کے لیے اچھا ہے خاص کر جبکہ اس بات کا افشا ہو جانے کا اندیشہ نہیں تو پھر خواہ مخواہ کیوں بچارے کو زندگی بھر کے لیے پریشانی میں ڈالا جائے؟" کسم کیا سمجھی کیا نہ سمجھی میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ کبھی روتے رہتی کبھی چپکے بیٹھے رہتی۔ آخر میں میں جب کہتا "تو جانے دے" تو پھر وہ بے چین ہو جاتی۔ ایسی حالت میں سری پتی کے ذریعہ تمہارے پاس شادی کا پیام بھجوا دیا۔ دیکھا فیصلہ کرنے میں تم نے ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ تب بیاہ کی بات پختہ ہو گئی"۔

"بیاہ سے کچھ پہلے کسم ایسی گھبری کہ سمٹنا دشوار ہو گیا۔ وہ پاؤں پڑنے لگی بولی نہیں تاؤ جی ایسا مت کرو میں نے کہا کیسی پگلی ہو گئی ہے۔ سب کچھ تو ہو چکا ہے اب کیسے بات لوٹائی جا سکتی ہے۔

کسم بولی تم ظاہر کر دو کہ دفعتہً اس کی موت ہو گئی ہے اور مجھے یہاں سے کہیں کو روانہ کر دو۔"

میں نے کہا۔ پھر اس کی دیرینہ آرزو کل پوری ہو گی یہ جان کر وہ سورگ میں بیٹھا ہوا ہے آج میں بیچارے اس کے پاس تمہارے مرنے کی خبر پہنچا دوں! اور اس کے دوسرے ہی دن تمہارے پاس اس کے انتقال کی خبر پہنچانی پڑے گی اور پھر اسی دن شام کو میرے پاس تمہارے مر جانے کی اطلاع آئے گی۔ میں اس بڑھاپے میں عورت کا اور مرد کا خون کرنے بیٹھا ہوں اس کے بعد شبھ لگن میں شادی مبارک ہو گئی۔ میں اپنے ایک فرض کی ادائی سے سبکدوش ہوا پھر کیا ہوا سو تم جانتے ہی ہو۔"

ہیمنت نے کہا ہم لوگوں کو جو کچھ کرنا تھا سو وہ آپ کر چکے تھے پھر بات کو ظاہر کیوں کیا؟"

پیارے شنکر نے کہا دیکھا کہ تمہارے چھوٹی بہن کی بیاہ کی بات چیت سب پختہ ہو چکی ہے تب دل ہی دل میں سوچنے لگا ایک برہمن کی ذات بگاڑ چکا ہوں تو وہ صرف فرض سمجھ کر اب جو دوسرے ایک برہمن کی ذات جا رہی ہے اس میں میرا فرض ہے کہ اس کی نگہداشت کروں لہذا ان لوگوں کو خط لکھ دیا اور لکھا کہ ہیمنت نے شودر کی کنیا کے ساتھ بیاہ کیا ہے اس کا میرے پاس ثبوت ہے۔"

ہیمنت نے بڑی مشکل سے ہمت کر کے کہا "اب میں جو اس لڑکی کو چھوڑ دوں گا اسکی گت کیا ہوگی؟"

آپ لسے سہارا دیں گے۔"

پیارے شنکر نے کہا میرا جو کام تھا سو وہ میں کر چکا اب دوسرے کی چھوڑی ہوی عورت کو پرورش کرنا میرا فرض نہیں۔ ارے آ وہیمنت بابو کے لیے ذرا شربت ڈال کر ایک گلاس کچے ناریل کا پانی لے آ۔ اور پان بھی لیتے آنا۔"

ہیمنت اس ٹھنڈائی کی آو بھگت کا انتظار کیے بغیر فوراً ہی وہاں سے چل دیا۔

(۴)

کرشن پکشی کی پانچویں ہے۔ اندھیری رات میں جھڑیاں جھپاتی نہیں ہیں تالاب کے کنارے لیچی کے درخت نے گویا سیاہ تختہ پر گہری سیاہی کا روغن پھیر دیا ہے صرف باد نسیم اس تاریکی میں اندھے کی مانند ادھر اُدھر گھوم رہی ہے گویا اُسے اندھیرے نے گھیر لیا ہے۔ آسمان کے تارے ٹکٹکی لگائے نظروں سے جی جان سے تاریکی کو جدا کر کے نہ جانے کس راز نہانی کا انکشاف کرنا چاہتے ہیں۔ خوابگاہ میں آج دیا نہیں جلایا گیا ہے۔ ہیمنت کھڑکی کے پاس پلنگ پر بیٹھا ہوا سامنے کی تاریکی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کسم زمین پر دونوں ہاتھوں سے اس کے پیروں کو پکڑ کر اُن پر اپنا سر رکھے پڑی ہے۔ سماں سمجھو جاہل ہونے والے سمندر کی مانند واقع ہے۔ گویا انتہائی رات کے وقت ناتجربہ کار مصور نے یہ امٹ تصویر کھینچ دی ہے چاروں طرف ہو کا عالم ہے۔ بیچ میں ایک سنج ہے اور اس کے پیروں کے پاس ایک مجرمہ ہے۔ پھر سلیپروں کی چٹ چٹ آہٹ ہوی ہری ہر جی نے دروازے کے پاس آ کر کہا بہت دیر ہو چکی ہے اب مزید انتظار نہیں ہو سکتا لڑکی کو گھر سے نکال باہر کر دو!"

کسم نے ان الفاظ کے سنتے ہی لمحہ بھر کے لیے ایک دفعہ اور طویل عمر کی حسرت مٹانے کے لیے ہیمنت کے پیر اور بھی دگنی قوت سے پکڑ لیے۔ قدم چوم کر پاؤں کی خاک پیشانی پر لگا کر، پیر چھوڑ دیے۔ ہیمنت نے اُٹھ کر باپ سے جا کر کہا "عورت کو میں تیاگ نہیں کر سکتا!"

ہری ہر نے گرج کر کہا "ذات کھوے گا؟"

ہیمنت نے کہا "میں ذات پات نہیں مانتا"

"تو جا، تو بھی نکل جا۔"

ف زوال ماہ

باغِ دکن

خواجہ ہمت علی خاں ہمتؔ کے کلام کا انتخاب

خواجہ ہمت علی خاں ہمتؔ کے حالات و واقعات کا صاف طور پر پتا نہیں چلتا، بعض کتابوں کے دیکھنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ چندولال (دیوانِ دکن) کے درباری شاعر تھے، چنانچہ مہاراجہ چندولال نے اپنی کتاب "عشرت کدۂ آفاق" کی تقریب میں جن علما، فضلا، حکما اور شعرا کے نام گنائے ہیں اُن شعرا میں ہمتؔ کا بھی نام لیا ہے مہاراجہ چندولال کے فرزند ارجمند راجہ بالا پرشاد معروف بہ دولہا راج بہادر کی شادی خانہ آبادی ۱۲۲۳ھ میں جہاں مرزا احمد طاہر شیرازی نیر کی محمد جواد شیرازی حبیب مرزا شائق نخجوانی ملا محمد فایض کاشانی۔ مرزا ابوالفیض بیگ افتخار حسین علی خاں ایماؔ ذوالفقار علی خاں صفاؔ نے تہنیتی قصاید و تاریخی قطعات پیش کیے تھے وہاں ہمتؔ نے بھی چند تاریخی قطعات گزرانے۔ اور یہ قطعات عشرت کدۂ آفاق میں تحریر ہیں۔ یہاں صرف ایک قطعہ نمونہ کے طور پر درج کیا جاتا ہے۔

عشرت خورشید طلعت ماہرو، جلوہ گر شد باہزاراں آرزو ٭ از برائے تہنیت ہمتؔ بگو، وصل ماہ و مشتری آمد نکو

دربار چندولال کے پہلے نواب اعظم الامرا ارسطو جاہ کے دربار کی باریابی کا ثبوت اس شعر سے ملتا ہے

اعظم الامرا کا دل جو دو سخا کا ہے محیط ٭ صدف دل ہی پُر از گوہر شہوار کرے بس

اور ایک قطعہ ان کے حالات پر روشنی ڈالنے والا یہ بھی ہو سکتا ہے۔

کرم ادھر بھی جناب فتوت آپ کیجے ٭ اس اپنے ہمتؔ بے نام بے نشاں کی طرف ٭ نشاد ل کروں اور نذر نقد جاں کو ٭ کیا جو رنجہ قدم مجھ سے ناتواں کی طرف

اس کے علاوہ ہمتؔ کے متعلق مجھے کسی اور ذریعہ سے معلومات نہ ہو سکے ان کے دیوان میں ایک مسلسل غزل ایسی ہے جس سے ہمتؔ کی سوسائٹی وغیرہ کا ایک حد تک علم ہو سکتا ہے:۔

غزل

وہ کیا دن تھے کہ ہمتؔ کو مہیا ساز و ساماں تھا	مُئے گلرنگ سیر باغ اور خوش وقت خنداں تھا
گمتؔ بھی مشغلہ تھا مجمع یاران رنگیں سے	گھر ہمتؔ کا خدا شاہد ہے رشک صد گلستاں تھا
ہنرؔ، نمانؔ، تمناؔ، خان اخترؔ، نکہتؔ و تنہاؔ	مہرباں الفت وا یاں ہر اک شاعر غزلخواں تھا

عہ: تذکرہ تمناؔ (قلمی) میں ان کا نام خواجہ عنایت اللہ خاں لکھا ہے۔ جو لشکر جنگ کے بیٹے اور خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت شاگرد شاہ سراج اورنگ آبادی کے بھائی ہیں لیکن شعرائے دکن ملکاپوری میں تو فتوت کوئی اور ہی ہے ۱۲

عہ، تماشا۔ دکنی اردو ۱۲

خصوصاً رات کو اس کے مکاں پر جشن ہوتا تھا
غرض محمود اقراں نامور عیاش دوراں تھا

فجر سے تا گجر ہوتا تھا اُس جا راگ و رنگ ایسا
پکھاوج اور طنبورا ہاتھ سے مستوں کے نالاں تھا

کبت دھرپت کی تانیں سن کنھیا کان کو پکڑے
ستار اور بین میں در پردہ راگ و رنگ عریاں تھا

ہوا ایسا تفرقہ میری اس کی ہو گئی دوری
جو اُس کے پاس سے آتا میں اس کا حال پرساں تھا

ہوا پھر حسب قسمت اتفاق اس شہر آنے کا
جہاں ساکن وہ موزوں طبع یار پاک طبعاں تھا

گیا میں اس کے ملنے کو تو کیا دیکھوں کہ غمگیں تھا
نہ وہ چہلیں نہ وہ رندی۔ بہت خاطر پریشاں تھا

میں پوچھا کیا ہوا اے یار رنگیں کچھ حقیقت کہہ؟
کہا، "وہ اک نقل کرتا ہوں مرا کوئی آشنا یہاں تھا

میں اُس آرام جاں کے ساتھ دایم عیش کرتا تھا
برنگ برق ہنستا تھا مثال ابر گریاں تھا

جو دیکھا غور سے میں نے ہوا زار و نزار اتنا
اثر چہرہ پہ اُس کے عشق کا ظاہر نمایاں تھا

ہوئی مہلت میں فرقت ناگہاں طالع کی گردش سے
تو سب کچھ بھول جا کر عشق میں افتاں و خیزاں تھا

پڑا تھا خاک خوں میں آہ اس کے شمع بالیں تھی
نہ کوئی غمخوار حاضر تھا نہ کوئی وارث نمایاں تھا"

ہوا میں حال اس کا دیکھ کر بے تاب و بے طاقت
پکارا چو طرف رو رو کے یہ جان محباں تھا

کہاں ہے دل کہ عاشق تھا کہاں ہے جاں کہ گویا تھا؟
بتائی آہ نے سینہ یہاں دل تھا وہاں جاں تھا

خبر اس کی سنا جب سے کہا افسوس واحسرت
خدا دے مغفرت ہمت بہت خوش خلق انساں تھا

ہمت کا دیوان نواب عالی رفاعی معتمد انجمن ارباب اردو سرور نگر حیدرآباد دکن کے کتب خانے میں ہے (ہ) کی ردیف تک غزلیں ہیں اور ان کے کلام کا انتخاب اسی دیوان سے کیا گیا ہے (عمر یافعی)

مطلع دیوان ہے سرلوح بسم اللہ کا
زیب بخشش صفحۂ دل نام ہے اللہ کا

ہر سحر تیری شعاع نور سے تابندہ ہوں
ذرۂ بے دست و پا خورشید کی درگاہ کا

دو جہاں تفسیر اسکی کیا کہوں شان نزول
ہے یہ مصحف بیکلی سیپارۂ دل آہ کا

خانہ زاد فاطمہ تھا غلام اہل بیت
بندۂ شہ لوگاں مملوک حضرت شاہ کا

ہے محبت کو ترے سینہ میں ایسا جاذبہ
ربط ہو آپس میں جیسا کہربا و کاہ کا

حق تعالیٰ نے کیا قرآں میں جن کی ہے ثنا
ہوں ثنا خواں دل سے اصحاب نبی اللہ کا

مجھ کو عسرت کیوں ہو ہمت ہر روز بد پرپا
ہے وسیلہ امر اولاد رسول اللہ کا

فزوں از حد ہے احساں شکر اُس خلاق اکرم کا
ادا حمد میں یارا ملایک کا نہ آدم کا

حرم اور دیر کا معبود زنار و نور کا غم
وہی جلوہ نما نظارہ میں ہے دو عالم کا

مقام ہستی سے شہر ہستی ایک منزل ہے
حباب آ گے ابھی پوچھیں گے غافل تجھ سے دم دم کا

شمار دم سے آگے رہ قدم پر رکھ نگہ غافل
زبان دل سے جاری ذکر رکھنا اسم اعظم کا

تو اپنا کام کر چل بے آدم مسافر ہے
نہ لینا ہے تجھے شادی کا نا دینا تجھے غم کا

الف الفت کا فی تا بین احمد اور احد ہیگا
مقدم نور محمدی تھا خدا کے اسم محرم کا

کہاں مقدور حمد و نعت کا خاموش رہ ہمت
صلوٰۃ اور سجدہ کیجے پھر بھروسہ ہے کسے دم کا

دل چاہیے ملاقات کو یہ دیدہ نہ دیدہ
جوں آئینہ صورت کا تری دیکھنے والا

واللہ مجھے کوچۂ دلدار کا سایا
یاد آئے گا فردوس میں دیوار کا سایا

دیکھ آئینے میں ابروئے خمدار کا سایا
دیکھا مہ نو دیکھ کے تروار کا سایا

ہر روز دعا مانگتا ہوں ہاتھ اٹھا کر
جم جم رہے سر پر قدم یار کا سایا

تب شام و سحر جلوہ نما ہوتے ہیں ہمت
جب رخ پہ ترے زلف شکن دار کا سایا

اشک اک پل نہ آنکھ سے سوکا
رنگ کچھ پھر ہوا مرے رو کا

دل تھا پہلے رفیق بازو کا
ہم نشیں! اب ہے تیرے پہلو کا

دل ستمگر کو کیوں دیا ہیہات
عقل نے بھولا ہوش نے چوکا

حسن کا نشہ بے خودی مے کی
وقت ہے داؤ گھات قابو کا

یار بے رحم دل پئے آزار
دشمن جاں ہے دوست پہلو کا

ہنس کے کہتا ہے خوب رو ہمت
نہ کرو ذکر ایسے بد خو کا

آہ بھرتا ہے کوئی تفتہ جگر آخر شب
نالۂ سوختہ رکھتا ہے اثر آخر شب

دل اپنا دے کے دشمن جانی کہا کیے
بس آج سے نہ دوستی کیجے کسو کے ساتھ

مہندی کا کل بہانہ تھا ہے آج غسل کا
وعدہ وفا ہو وصل کا کب حیلہ جو کے ساتھ

دیکھو نہ عزیزو دل ناکام کی صورت
دکھلاؤ مجھے میرے دلآرام کی صورت

(مستزاد)

اس وقت میں ہے بے کسی سر پر مرے حاضر
پوچھا نہ کسی نے کہ یہ جیتا ہے کہ مرتا
آوارہ ہوا کو؟
کیا اس کی ہے حالت

سن شب کو مرے درد و مصیبت کی کہانی
یہ تو وہی اگلا ہے ترا قصہ پرانا
کہنے لگا "خاموش!"
کہہ تازہ حکایت

رہیں یہ چشم تر دایم وضو سات
کہ گزرے مردموں کی آبرو سات

قدم بوسی کی ہوں حسرت میں پامال
برنگ نقش پا کس آرزو سات

میں بددماغی سے تیری کہاں کروں فریاد
ہوا نہ آج تلک کوئی دادرس باعث

دل جگر اور چشم و جاں ہیں یار زخم تیغ سے
چارہ سازو میں کروں آہ کس کس کا علاج

پٹے یہ ڈھیلے پیچ کی ہے تند تار پیچ
ڈالا ہے جال کرنے کو دل کے شکار پیچ

گلشن میں باد تند نے کی ایسی سرکشی
دستار گل کے کھل گئے سر پر سے چار پیچ

مخمور چشم مست نگہ کی وہ کیفیت
نرگس کی دیکھتا ہے چمن میں بہار ہیچ

ہمت سے بات کرتے ہو لکنت زباں میں
ہے میکشی شب کا نمایاں خمار صبح

حنائی اس کف پا کی ہے ایک ٹھوکر بس
کہ درد سر کے مرے واسطے ہے صندل سرخ

نہ دھو لہو کو مرے اپنی تیغ سے قاتل
کہ یادگار رہے یہ نیام مخمل سرخ

نہ خط پہ مہر ہے نا ہے کمر بند
لفافے کا کھلا ہے سر بسر بند

کیا قاصد کو خط لے کر نظر بند
کبوتر کے بھی کر رکھا ہے پر بند

محبت کے اسے رشتوں میں جکڑا
گرفتاری میں دل ہے بند در بند

بغل میں دل نے طفل اشک پالا
یہ نور چشم ہے میرا جگر بند

تری دہلیز پر دیکھا ہوں شب کو
نشاں ہائے پے غیر اور گھر کا در بند

کروں کیا بس نہ تھا چوکھٹ سے سر مارا
پھڑکتا دل رہا جوں مرغ پر بند

کرے مئے نوشیاں اور عیش و عشرت
رکھیں گے گھر کا در آٹھوں پہر بند

وہ قسمیں کونسا بس چھوڑ کمبخت
رہا نہیں کچھ کہیں پر زور پر بند

خوبان ملنگاں کا آرائش زیور
خورشید کا سر بند مہ نو کا کمر بند

نا دل کی طپش جاتی ہے ہمت نہ وہ شورش
زنجیر سے آہوں کی رکھا وحشی کو کر بند

ترش رو کاہے کو ہوتا ہے اے شیریں لب
تلخ دشنام بھی ہے بوسے کے ہنگام لذیذ

ہے لخت دل مرا بازوئے یار کا تعویذ
ہے چشم بد کی نظر کے اتار کا تعویذ

کوئی تو ٹونا کرو ٹوٹکا فسوں منتر
لے آؤ یار کے اخلاص (و) پیار کا تعویذ

ہلال نکلا ہے خورشید رو کے بازو پر
چمک رہا ہے وہ نقش و نگار کا تعویذ

گلے میں اس دل بیمار کے اے ہمت باندھ
تپ فراق کی رفع بخار کا تعویذ

کیے مجھ سے برا لوگوں نے آخر شکوہ کہہ کہہ کر
وہ بدظن اور میں رسوا ہوا دشنام کہہ کہہ کر

دل نالاں بشال بلبل شیدا کے چہکہ / کہ تا وہ غنچہ لب گل کی طرح ہنس دے تو کھوکر
رگ ابر بہاری سے ہوئے ہم چشم یہ مژگاں / کہیں طوفان نہ کردیویں یہ مجھ اشک بہہ کر
مری آنکھوں میں پتلی نہیں یہ مرغ آبی ہے / ہوا ہے مردم آبی لقب پانی میں رہ کر

ہو بستر گل یار دلآرام بغل میں / لپٹے ہی رہیں صبح سے تا شام پلنگ پر
وو ناز کے انداز وہ ہم آغوشی کے وہ لطف / شب ہم کو مزے سے ہوئی تمام پلنگ پر
تمہاری زلف کو چھیڑا تھا اب بھلا کس نے / کچھ آپ ہی آپ جو بل کھا رہے ہیں یار ابھی تو
کبھی گیا تھا وہ شاید کہ سیر کو ہمت / چمن میں خم ہی خجالت سے ہے نہال ہنوز

ایک تو یار ملا ایسا ستمگار کہ بس / دوسرا ہاتھ سے اس دل کے ہوں ناچار کہ بس
چشم مخمور تری دیکھ چمن میں نرگس / بے عصا اٹھ نہیں سکتی ہوئی بیمار کہ بس
آگے ہر بات پہ تھا آرے بلے ہاں جی ہاں / اب تو ہوں بھی نہیں کہتے ہیں بیزار کہ بس
ٹوٹتا دل ہے ہر اک نقش قدم پر ہمت
قد قیامت وہ غضب قہر یہ رفتار کہ بس

صدائے قلقل مینا ہے بحر و جوش / وداع عقل ہے اور رخصت ہوش
زبان کٹتی ہے اور کرتا نہیں آہ / برنگ شمع جلنا رونا خاموش
تصدق میں ترے بھولے پنے کے / یہ نسیان یاد رکھ وعدہ فراموش
قدم بوسی کا مجھ کو جب نہیں حکم / کروں کیوں کر تمنائے ہم آغوش
رہے ساقی ترا مے خانہ آباد / ہے تو نوشا نوش سے مے کا پیالہ جوش
ہمارا سجدہ گہ نقش قدم ہے / ہمارے سر کا افسر تیری پاپوش
سنے ہمت کی وہ فریاد کیوں کر
بجائے پنبہ در رکھتا ہے در گوش

نبھے گا کس طرح اس بدگمان سے اخلاص / مجھی سے بیر ہے مجھ کو جہاں سے اخلاص
بھلائی اوروں کی ہے اس کے خوب میں بدخو / برائی دل میں ہے منہ سے زبان سے اخلاص
یہ دل تو دشمن جاں ہے اسے تو پیار نہ کر / جو چاہے جی سے رکھ اس مہرباں سے اخلاص

نہ دیکھا ذرہ نوازی کا آفتاب میں نقص / تری ہی چشم کے ہے پردہ حجاب میں نقص
اتر کے چرخ سے آتا تری سواری میں / نہ ہوتا اس مہ نو کے اگر رکاب میں نقص
ہر اک مزاج میں کیفیت علیحدہ ہے / غلط ہے شیخ نہ رکھ نشۂ شراب میں نقص

لے نقد دل عوض کہ ادا ہو تمام قرض / سرکار زلف کا ہے ترا دام دام قرض
حاجت نہیں تقاضے کی خاطر نشان ہے / پہنچا ہی دیگا وعدہ پہ تیرا غلام قرض
گزران ہے ادھار پہ صبر و قرار کی / جنس گرسنگی سے ہمت آتا ہے کام قرض

اس کتابی رخ زیبا کے لکھا اوصاف میں خط / مہربانی و کرم چاہ کے اطراف میں خط
ملو قلم سے کیا نقاش نے یہ کار سوا / حسن لکھتا ہے ترے چہرۂ شفاف میں خط
ہار کے تار جیسے ہیں تن نازک پہ ترے / ہے رگ گل کی طرح تجھ بدن صاف میں خط
داستان ہجر کی اور ہے رقم شرح و بیاں / حرف شکوہ نہیں رسالہ ہے الطاف میں خط
شہر خوبوں میں اے ہمت تو منادی کر دے
دل گم گشتہ کی خاطر لکھو اطراف میں خط

نبھاؤ کیوں کہ کوئی ایسے کج ادا سے ربط / اسے جفا سے ہے ربط اور مجھے وفا سے ربط
جہاں میں اور کوئی خوب رو نہ تھے ہمت / کیا جو ڈھونڈھ کے تو ایسے بے وفا سے ربط

نہیں بات میں تیری ثبات ذرا نہ پھر اس شیوۂ وفا کا تو دم غلط
بھلا لوگوں سے پوچھو نہ یا تو برا اجی تم غلط ہو کہ ہم غلط
مرے گھر کے سوا کہیں جاتے نہیں کوئی اور ہمارے بیاں آئے ہیں
رکھو دیدوں پہ ہاتھ تم اپنے اجی مرے سر کی نہ کھاؤ قسم غلط
مرے طالع جو سوتے تھے جاگ اٹھے ترے پانو صنم مرا ہاتھ لگے
تو نے رات کو خواب میں تکیہ سمجھ رکھا زانو پہ میرے قدم غلط
مجھے اپنے سے اپنے تو دور کیا مرے دشمن جاں کو حضور رکھا
ترا قول و قرار قسم غلط ترا آرے بلے و نعم غلط

شراب ناز نے گا ہے نہ یوں کیا مخطوط / جو کچھ کہ چشم نے ساقی کی کردیا مخطوط
رہے ہے یار سے صحبت شراب خواروں کی / میں اس سے خوش ہوا اور مجھ سے وہ ہوا مخطوط

محفل میں عاشقوں کی نہ کوئی لگا سکے شمع / جل جائے گا پتنگ ابھی کر کے ہائے شمع
روتی ہے جلتی گلتی ہے اس پر خموش ہے / ثابت ہے راہ عشق میں اتنا تو پائے شمع

مجھ سے ملنے کا نہ کر یار تو اقرار دروغ / اور رقیبوں کی ملاقات کا انکار دروغ

آسماں کرچکا عیار ترے مکر و فریب   سچ تو یہ ہے کہ کیا وعدہ کبھی بار دروغ

ہے زبان زد یہ سخن خلق میں ہمت مشہور

راستی میری ترا اندک و بسیار دروغ

شام کو عارض پہ اسکے ایسی آ لگتی ہے زلف   باغ میں سنبل کی جیسے صبح لہراتی ہے زلف

کیا بلا ہے پیچ و تاب دیکھ میرے دل صد چاک سے   جتنا سلجھاتا ہوں اتنا ہی الجھ جاتی ہے زلف

دل نہ ہو تو ہے اس کے کس طرح پھر چاک چاک

وصل کی شب شاخ شانے سیکڑوں لاتی ہے زلف

غضب ہے دیکھے ہے جب مجھ ناتواں کی طرف   میں دیکھ رہا ہوں آہ آسماں کی طرف

صبا تو کان میں غنچے کے یہ سخن کہہ دے   نہ دیکھ اسکے تو ہرگز لب دہاں کی طرف

اے شیخ تجھ سے ہو فرتوت پر وہ کب مائل   جو ہو گی دختر رز تو کسی جواں کی طرف

خدا کی یوں ہی خدائی بحق ہے اے یارو   ہے کافر اب وہ کوئی ہو نہ جو بتاں کی طرف

شرف پذیر ہو ہمت بخلعت تحسین

لکھا اس غزل کو تو استاد نکتہ داں کی طرف

چلا ہے دل لے مجھے کوئے دلستاں کی طرف   رواں ہو روح جس عنوان نفس جاں کی طرف

چمن میں گوش ہو کر گل کا بلبلو سن لو   رکھا نہ کان کسی کی کبھی فغاں کی طرف

لگن تنگ ہے اے شمع تیری روشن ہے   حجاب میر سے کر دیکھ مت جواں کی طرف

ہے لفافہ اس نامہ میں ہرگز نہیں ہے آہ نفاق   دم قدم سے اتفاق اپنے ہے اہل وفاق

دل لے آتے ہیں حق تبی سے بہا سے جاتے ہیں ملول   دید گلزار جہاں کا تھا عدم میں اشتیاق

چمکی ابرو میں جبیں پہ پسینے اور افشاں ہے   یہ نگارستان حسن چن چن کر رکھا بالا طاق

اس کے جور و جفا جھیلتے ہیں ہمت مگر   ہجر کا بار گراں سم جدائی دل پہ شاق

میں نرنگ غنچہ کے کھول نہ دی تجھے دل کی گھنڈی کی گرہ کو

مراد دست رس ہو نسیم سا ترے کاش بند قبا تلک

دل غم نصیب کو شاد کر مجھے تو نے بھیجا نہ یاد کر

نہ تو نامہ اور نہ پیام تک سلام تک نہ دعا تلک

مجھے اس صنم کا حضور ہے تری بندگی میں قصور ہے

اے شیخ! تو ہے بخود غلط نہ خودی سے پہنچے خدا تلک

ارے ہمت اس سے نہ کر گلا ترے چھیڑنے سے ہے وہ خفا

ہنسے گل کی طرح وہ کھل کھلا نہ ہے حجاب صبا تلک

ہمارے سینہ میں یوں آہ پر شرار ہے ایک   کہ جیسا سیکڑوں دانے ہیں اور انار ہے ایک

کیا ہے وعدہ دیدار کس نے اب یارب   جو میری آنکھوں میں سیل اور نہار ہے ایک

ہے آستانہ دل کی مجھے قسم ہمت   کہ شوخیاں مری لاکھوں وہ پردہ دار ہے ایک

حق اگر چاہے تو ہمت ناخن تدبیر سے   عقدۂ خاطر ترا ہو جائے ہے ہر حال حل

چشم و رخسار عجائب ہیں چمن پہ تیرے پھول   دیکھ باہم ہے دہن اور سخن پھول ہیں پھول

گل بدن اپنا غنچہ دہن تم تو ہو پھولوں میں لدے   نرگسی چشم و گل اشک نین پھول ہیں پھول

مرگیوں میں ہیں جو تجھ پہ پھول پڑتے دیکھا   غنچۂ موگرا کرتا ہے جتن پھول ہیں پھول

نگ طفلوں سے دیوانہ کا ہے تن پتھر کیا   بیل بوٹا ہے یہ خوش رنگ جگن پھول ہیں پھول

سیج پر پھولوں کی ہمت نے نہیں بچھایا

صاف ہے نرم ہے خوش بو ہے بدن پھول ہیں پھول

معمور عطر و گل ہے جیب و کنار ہم تم   ہے روز عید مل لیں جاؤ گلے یار ہم تم

اچھی نہیں کدورت ہو صورت صفائی   جوں آئینہ نکالیں دل کا غبار ہم تم

پیارے چمن میں چل کر تر ناکے ہے میکشی کو   اس دخت رز کی مل کر لوٹیں بہار ہم تم

دعویٰ سخن کا اکثر کرتے ہیں یار لیکن   ہیں یادگار دوراں وہ تین چار ہم تم

کافر بتوں کے بندے کہتے ہیں لوگ ناحق

ایمان اور ہمت ہیں دیندار ہم تم

چمن میں ہے وہ جھمکڑا بہار کی ہے یہ دھوم   ہر ایک طرہ گل پر ہے بلبلوں کا ہجوم

نہیں ہے شیوۂ مہر و وفا معاذ اللہ   بتوں کی چاہ کا کیا اعتبار ہے موہوم

ملا ہے خاک میں دل مثل نقش پا ہیہات   جفا کشیدہ و غم دیدہ وصل سے محروم

ہوا ہے تیغ نگہ سے شہید یاد آیا   جوانا مرگ وہ جنت مکان دل مرحوم

قصور کیا ہوا ہمت نے کیا کیا تقصیر[ه]

سبب عتاب کا اب تک رہا ہے نا معلوم

ه دکو: ہما محاورہ ہے جیسے دہلی کا کرامات والا محاورہ خصوصیت رکھتا ہے یہ اس سے زیادہ

جزیرۂ موت

(از جناب اقبال الدین احمد صاحب صدیقی لکھنوی - جائنٹ اڈیٹر اخبار کامریڈ لاہور)

بحر ناپیدا کنار کی خونخوار و ظالم موجیں ایک سنگلاخ جزیرہ کی اونچی نیچی چٹانوں سے ٹکرا کے سفید جھاگوں بڑے بڑے حبابوں اور منتشر چھینٹوں میں فنا ہو رہی ہیں اس خطرناک آبی منظر میں طوفان عظیم برپا ہے۔ سینۂ آب سے اٹھنے والی موجیں پہاڑیوں کی چوٹی تک جا کر قعر سمندر تک پہونچ رہی ہیں۔ منجمد برف کے بڑے بڑے ٹکڑے روئی کے گالے کی طرح اڑ رہے ہیں آبی مخلوق ان تباہ کن ٹکڑوں سے پریشان۔ بڑھنے والا طوفان ہر لحظہ خوفناک صورت اختیار کر رہا ہے تمام فضا پر سیاہ بادلوں کی فوج پانی برسانے کے لیے محیط ہے جس کا پیش خیمہ ہوا کے تیز و تند جھونکے ہیں جو ہر چیز کو اڑائے لیے جا رہے ہیں آسمان کے پانی اگلنے۔ بجلی کی چمک۔ رعد کی کڑک نے ثریٰ سے ثریا تک ذرہ ذرہ کو ہلا دیا۔ اندھیرے کی ایک چادر نے سارے عالم کو اپنے کونے سے چھپا لیا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے نے شدت باراں اور بجلی کی چمک کو ساتھ لے کر منظر کی ہولناکی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ سمندر کا پانی آسمان تک جانے کے لیے بے چین........ سوائے برق جہاں سوز اور رعد جگر دوز کے کوئی چیز نہیں۔ چند انسانی ہستیاں شکستہ اور پھٹے بادبانوں کے جہاز پر موت و زیست کے عالم میں مبتلائے تلاطم تھیں۔ جہاز ایک مگس نیم جاں کی طرح اپنے ناتوان بادبانوں کی مدد سے شناور طوفان تھا طوفانی تھپیڑے اسے مشرق سے مغرب پہنچا دیتے کبھی وہ آسمانی پہاڑیوں سے جا ملتا اور کبھی قعر سمندر میں۔ ان فلاکت زدہ مسافروں کی بری حالت تھی۔ ان بیچاروں پر دوسری بلایہ نازل ہوئی کہ اس ستم رسیدہ جہاز کو برف کے ایک ٹکڑے نے پاش پاش کر دیا اور زندگی کا یہ شکستہ سہارا بھی نہ رہا اور ر اکبان جہاز کا دل یاس سے ڈوبنے لگا۔ حواس گم۔ ہوش پراں۔ بدن جہاز کے ہچکولوں۔ موجوں کے تھپیڑوں۔ بارش کی مار اور اولوں کی بوچھاڑ سے بیکل اور چور تھا۔ ہائے........ افسوس........ کہ جہاز ڈوبنے لگا۔ پیاری جان کو بچانے کے لیے آخری تدبیر کی گئی۔ کشتیوں کی رسیاں کاٹ کر ناہموار پانی پر چھوڑ دی گئیں۔ خوف زدہ مسافر بدحواسوں اور پاگلوں کی طرح اس میں کودنے لگے۔ قسمت برگشتہ نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ بعض کے کودنے سے کشتیاں ہٹ گئیں اور بعض کو کشتیاں نہ معلوم کہاں لے گئیں۔ ہاں خوش قسمتی یا سمندر کی مہربانی کہ بمشکل چار آدمی صحیح و سالم اپنی پیاری جان بچا سکے۔ جہاں یہ جہاز ڈوب رہا تھا وہاں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے اس کو اور بھی بے دردی سے توڑ رہے تھے اور اس کی چرچراہٹ موت کا گیت گا رہی تھی۔

سبک رفتار کشتیاں پانی کے پریشان کن انتشار سے تہ و بالا ہو رہی تھیں اور مسافر ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے

جہاز مع تین کشتیوں کے غرق آب ہوگیا اور ایک مسافر کمر ورتپوار کے سہارے ڈوبتا اچھلتا۔ توکل بخدا اپنی بہادری یا بخت کی یاوری سے جزیرہ کی پتھریلی ڈھلوان سے جا لگا ـــــ ہر کمالے را زوال۔

خوفناک طوفان کم ہوا۔ آسمان نے آنکھ کھولی۔ آفتاب نے بادلوں کے پردے سے منہ نکالا۔ اپنی تیز و خونی چمکیلی شعاعوں سے موجوں کو معدوم کر دیا۔ نہیں اب معلوم ہوا کہ اس خونخوار اور موذی سمندر کا یہ ہیجان صرف اس جہاز کے نگلنے کے لئے تھا اس کا ارادہ پورا ہو . . . . . . گیا ـــــ!! وہ مصیبت کا مارا تنہا مسافر پتھر کی ایک چٹان پر آرام کی سانس لے رہا تھا اس کی آنکھیں نہ معلوم کس کس کے ماتم میں اشکبار تھیں جسم برہنہ۔ اعضا سست حوصلہ پست یہ سرزمین جہاں یہ بیچارہ غریب الوطن پڑا ہوا تھا۔

"موت کا جزیرہ" کہلاتی ہے یہاں نہ آبادی نہ خوبصورتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہاڑی نے سمندر سے نکل کر سطح سمندر پر اپنی خوفناک سیاہ چٹانوں سے قبضہ کر لیا ہے اور اکثر جہاز اس کے کالے کالے پتھروں سے ٹکرا کے یہیں تباہ ہو گئے۔ ملاح اس طرف دیکھتے ہوئے گھبراتے مسافروں کو اس کے نام سے غش آجاتے جب کبھی یہاں سے جہاز بخیت گذر جاتا تو خلاصی اور کپتان سب مل کر خدا کا شکر ادا کرتے۔ ترانہ مبارکباد بلند کرتے اور پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھتے اس نے نیند سے آنکھ کھولی اور ایک انگڑائی لیتے ہوئے اس خاموش سنسان ہیبت ناک منظر پر چلتی ہوئی نظر ڈالی۔ اسے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر شہنشاہ حیوانات دکھائی دیا جو اس کی طرف گھور رہا ہے اور کوئی دم جاتا ہے۔ کہ اس شیر کی جھپٹ اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے یہ اقبال و خسران شاہ بلوط کے ایک درخت پر چڑھنے کے لیے لپکا اس طرح کہ یہ درخت کی تمامیں اور شیر اس کے تعاقب میں۔ شیر کا وار خالی گیا اور مسافر ایک مضبوط ٹہنی پکڑ اوپر اچک گیا اور پھر اس کے بھیگے اور زنگ دار پستول کی دو گولیاں شیر کے جسم میں۔ وہ پرہیبت آوازیں مارتا ہوا لڑھکتا پڑا کتا سمیٹ دم توڑ مسافر کا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا اس نے اپنے وفادار ساتھی (پستول) کو بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ بھوک نے درخت سے اترنے پر مجبور کیا۔ آخر کار وہ دیکھتا بھالتا پھونک پھونک کے قدم رکھتا ہوا ان جھنڈوں سے نکل کے ایک راستہ پر ہو لیا جو ایک صاف شفاف دریا کے کنارے پر تھا اس کے دو طرفہ اخروٹ کے درخت تھے۔ اس ندی کے کنارے سبزہ لہرا رہا تھا اور جا بجا چشمے جاری تھے۔ مسافر کے جب قدرے سکون و اطمینان ہوا تو اسی اخروٹ اور جنگلی میووں سے شکم پری کی۔ موتی جیسا صاف پانی پی کر سبزہ پر دراز ہو گیا وہ عالم خواب میں محو تھا کہ یکایک چونکا۔ پڑا پیاری نیند اچاٹ ہو گئی۔ گھبرا کے اٹھ بیٹھا اور حسرت بھری پرنم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا ایک ہاتھ اس کا دل پر تھا اور دوسرا سبزہ پر ایک چیخ اس کی زبان سے نکلی "ہائے" گردن پیچھے کو جھک گئی اور وہ بلا سہارے گھانس پر گر پڑا۔ اور یہ چند کلمے بمشکل اس کی زبان سے سنائی دیئے۔ میری . . . . . پیاری . . . . . . محبوبہ . . . . میرے . . . . . پیارے . . . . . . بچے۔

غزل

(جناب صفی اورنگ آبادی (حیدرآباد))

فیصلہ کر! یا تو ارمانِ دلِ مضطر نکال!
یا تو، بسم اللہ میں حاضر ہوں چل! خنجر نکال!

کون کہتا ہے، کہ ارمانِ دلِ مضطر نکال!
باتوں باتوں میں بگڑ جا! بیٹھے بیٹھے شر نکال!

اے دلِ وحشی! نکل گھر سے تو۔ اُس کا گھر نکال!
پانو کے چکر نہیں تقدیر کے چکر نکال!

مجھ کو جو کہنا ہو، کہہ! میری خطا۔ میرا قصور۔
نام، تو اس کا نہ منہ سے۔ اے ملامت گر! نکال

دل کی چوٹیں دیکھ کر۔ اُس سخت گو نے یہ کہا
"تو مرے نزدیک سے ایک آدھ تو پتھر نکال"!

بے دلی کو بھی جنوں سمجھیں تو سب سمجھا کریں
دل تو کہتا ہے کہ گھر کی بات کو باہر نکال!

اللہ اللہ! کسرِ نفسی کی کوئی حد ہی نہیں
تیرے صدقے! کوئی اپنا سا پری پیکر نکال!

دل کے دینے میں کشش و پنج اس قدر بے سود ہے
مجھ پہ کچھ تیرا نکلتا ہے تو غارت گر نکال!

یہ نیا غم ہے کہ تجھ سے مل کے پچھتانا پڑا
بس! ستمگر بس! شکایت کے نہ اب دفتر نکال!

تجھ کو گننے کی ضرورت کیا ہے اے میرے قصور
ظلم تو ہے! ایک کے دس۔ سات کے ستر نکال!

یہ تلوّن تو ترا اے دل نہیں کچھ کام کا
یا تو اُس سے ڈر ہمیشہ! یا تو اس کا ڈر نکال!

اے جنونِ عشق تیری قدر اب ہونے لگی
ضعف کہتا ہے کہ "گھر سے پانو تو باہر نکال"!

میں یہ کہتا ہوں کہ "نام اُس بے وفا کا اب نہ لو"
دل یہ کہتا ہے کہ "اُس کا تذکرہ اکثر نکال"!!

تیرا دیوانہ ہوں تو اپنا مجھے سایہ سمجھ!
گھر میں رہ تو گھر میں رکھ! باہر نکل! باہر نکال!

جرم دل کا دیکھ! خود کو دیکھ! اپنی شان دیکھ!
جانے دے! اَن جان ہو جا! چشم پوشی کر! نکال!

اے صفی پھر اُس کی محفل کی تمنّا ہے تجھے
یاد ہے وہ؟ "ہے ارے کوئی اسے باہر نکال"!

تنقیدیں

فرہنگ عثمانیہ از قاضی میر لطف علی صاحب عارف حیدرآبادی۔ ضخامت (۳۱۸) صفحات قیمت پانچ روپیہ مولف صاحب سے بہ مقام اندرون فتح دروازہ حیدرآباد دکن طلب کیجئے

فرہنگ عثمانیہ المعروف بہ اصطلاحات اسنادی جیسا کہ اس عرف سے ظاہر ہے معاش، ماہوار زمین پٹہ اور مالگزاری و تاریخی اسناد کے الفاظ و اصطلاحات کی ایک جامع فرہنگ ہے۔ مولف نے بڑی تلاش اور کوشش سے زمینداروں اور اہل معاش کے لیے نہایت مفید تالیف کی ہے۔ غالباً یہ پہلی جلد ہے اس میں صرف وہ الفاظ اور اصطلاحات ہیں جو الف اور ب سے شروع ہوتے ہیں۔ الفاظ کی تشریح و توضیح بڑی حد تک صحت اور صفائی سے کی گئی ہے وکلاء، اہلکاران دفاتر اور معاش داروں کی اس کے ذریعہ بہت سی فنی مشکلات جو وقت بے وقت الجھنیں پیدا کر دیتی اور بہت سا وقت لے لیتی ہیں دور ہو جائیں گی یہ کتاب نہ صرف ریاست حیدرآباد بلکہ دوسری تمام دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کے باشندوں کے لیے بھی یکساں مفید ثابت ہوگی کیونکہ اس میں مغلیہ زمانہ بلکہ اس سے پہلے کے عہد کی مالگزاری کی اصطلاحیں جو اکثر قدیم دستاویزات و اسنادیں ملتی ہیں اور ایسے مصطلحات جو حیدرآباد کے سوا دوسرے رجواڑوں میں رائج تھے اور ہیں سب درج ہیں۔ بعض چیزیں غیر ضروری طور پر بھی شریک کر دی گئی ہیں جن کا اندراج اور وہ بھی تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے موضوع سے بالکل خارج نظر آتا ہے مثلاً آصف جاہ کی ضمن میں جملہ آصف جاہی بادشاہوں کا ذکر اور پھر بادشاہ کی ضمن میں بابر شاہ بانی خاندان مغلیہ سے لیکر بہادر شاہ ظفر اور علاءالدین حسن بہمنی سے لے کر قطب شاہی، عادل شاہی، عماد شاہی، نظام شاہی، برید شاہی، اور آصف جاہی بادشاہوں کی تاریخ معہ ان کے وزراء وغیرہ کے حالات کے کتاب کے موضوع سے بہت کم علاقہ رکھتے ہیں۔ آصف جاہی بادشاہوں کا ذکر دو جگہ آیا ہے ایک موقع پر کسی قدر تفصیل سے اور دوسرے موقع پر بالکل اختصار کے ساتھ۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو کتاب کی ضخامت غیر ضروری طور پر نہ بڑھتی اور اس کے ساتھ دوسری متعلقہ اشیاء کے لیے خاصی جگہ نکل آتی۔

ہندی اردو مالا مولفہ پنڈت ہری ہر صاحب شاستری پروفیسر ہندی و سنسکرت کلیہ جامعہ عثمانیہ ضخامت (۲۶) صفحے اوسط تقطیع قیمت ۶/

پنڈت جی نے ہندی کی یہ پہلی کتاب بڑے سوچ بچار کے بعد لکھی ہے اور اس کی تالیف کا مقصد اردو دانوں کو ہندی زبان کے سیکھنے میں آسانی پہنچانا ہے۔ ہندی کی ابتدائی کتابیں بکثرت ہیں اور خصوصاً ہندی سبھا سیلون کے زیر اہتمام جو نہایت شاندار پیمانے پر ہندی کی زبان کی اشاعت اور اس کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلانے

کی کوشش کر رہی ہے متعدد رسالے اور ابتدائی کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جو دوسری زبانوں کے جاننے والوں کیلئے جلدی سے ہندی سیکھ لینے کا سامان کر دیتی ہیں۔ پنڈت جی نے اردو دانوں کے لیے یہ کتاب بڑی مفید لکھی ہے اور بہ لحاظ اس تجربے کے جو انھیں جامعہ عثمانیہ میں اُردو داں طلبہ کو ہندی پڑھاتے رہنے سے حاصل ہے تمام ضروریات کو ملحوظ رکھا ہے۔ ہندی حروف تہجی کے نیچے اردو میں اُن کے تلفظ اور بعد میں ہر سبق کو اردو رسم الخط میں لکھا ہے جس سے پڑھنے والے بلا کسی دقت کے ہندی سیکھ سکتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ پنڈت جی اس سلسلہ میں اور کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دوسری کتاب کی تالیف تو شروع بھی کر دی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب اردو میں ہندی کے لیے جو ابتدائی کتابیں شریک ہیں اگر انکی بجائے یہ اور اس کے بعد کی دوسری اور تیسری کتابیں تیار ہونے پہ شریک درس کی جائیں تو یقین ہے کہ امیدواران امتحانات ایف اے و بی اے کے لیے بڑی سہولت کا موجب ہونگی اور فی الوقت جو دقتیں موجودہ کتابوں کے خالص ہندی خوانوں کے لیے ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہیں دور ہو جائنگی

سالنامہ رہبر دکن

مرتبہ مولوی سید احمد محی الدین صاحب ضخامت (۱۰۰) صفحے پونیہ ۱۲ تقطیع قیمت عہ
مولوی سید یوسف الدین صاحب منیجر رہبر دکن افضل گنج حیدر آباد دکن سے طلب کیجیے

روز نامہ رہبر دکن جو حیدر آباد کا نہایت مقبول اور سر بر آوردہ روزنامہ ہے اپنی بے لاگ پالیسی حق گوئی اور صحیح خدمت گزاری ملک و قوم کی وجہ سے روز بروز ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے۔ کئی سال سے ہر فصلی سنہ کے آغاز میں انگریزی اخباروں کی طرح عظیم الشان پیمانے پر سالنامہ شائع کر رہا ہے یہ سالنامہ ۱۳۳۹ف کا ہے اور صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اردو صحافت میں بے نظیر ہے کسی اردو اخبار نے آج تک اس شان کا سالنامہ شائع نہیں کیا اگر ایک طرف مختلف علمی تعلیمی اور ادبی عنوانات پر مفید تحقیقی اور دلچسپ مضامین اور قدیم و جدید رنگ کی دلکش نظموں اور غزلوں کا ایک پاکیزہ مجموعہ ہے تو دوسری طرف تاریخی دلچسپی اور حیدر آباد کے نظمائے دفاتر اور عام پسندیدگی کی متعدد تصاویر کا نفیس مرقع ہے۔ اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کا ایک کئی رنگی فوٹو نہایت خوبصورت اس کی خوبیوں میں چار چاند لگا رہا ہے تاریخی دلچسپی کی تصاویر میں جملہ آصفجاہی سلاطین قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کی قلمی تصویریں اور قدیم ہندو منادر کے فوٹو قابل ذکر ہیں نظام ساگر کے مناظر اور ان کے ساتھ اس ساگر پر بسیط معلومات کا مضمون ایک دلچسپ چیز ہے متعدد افسانے ہیں جو اچھے افسانہ نویسوں کی قلمکاری کا نتیجہ ہیں۔ جدید طرز کی نظموں میں اجنٹہ پر قاضی زین العابدین صاحب کی نظم اعلی تخیل اور پختہ تراکیب اور زور بیان کے لحاظ سے ایک شہکار ہے۔ غزلوں میں حیدر آباد کے مشہور شاعر صفی، ماہر اور عزیز اور اخگر کی غزلیں یقیناً بہت پسند کی جائینگی۔ اگرچہ تمام مضامین نہایت عمدہ ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اردو کے حروف ہجا اور دیوان خاکی دو ادبی مضمون بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھے گئے ہیں

اول الذکر اس لحاظ سے بھی خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے کہ اب تک عام طور پر اردو کی ہجائیں (۵۵) سے زیادہ آواز یں نہیں دریافت کی گئیں۔ مولوی ابو المحاسن متین صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے بڑی تلاش و تجسس سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کی ہجائیں (۵۵) سے بہت زیادہ یعنے (۲۴۲) آوازیں ہیں۔ اس تحقیق و انکشاف سے اردو زبان کی لسانیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ مدیر صاحب رہبر دکن اس سالنامے کی ترتیب و اشاعت پر قابل مبارکباد ہیں۔ اردو صحافت میں ان کی یہ ساعی انقلاب انگیز ثابت ہونگی۔

دی اسٹار

انگریزی ہفتہ وار۔ مدیر عزیز احمد صاحب بی اے عثمانیہ سالانہ چندہ ۱۲؎ ششماہی ۷؎ ہے سہ ماہی ۴؎ منتظم صاحب دی اسٹار ہیوٹ روڈ الہ آباد

یہ انگریزی زبان کا ایک آزاد اسلامی ہفتہ وار جریدہ ہے جو الہ آباد سے جناب عزیز احمد صاحب بی اے عثمانیہ کے زیر ادارت جاری ہوا ہے اس کے مسلسل کئی نمبروں کے مطالعہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اغراض و مفاد کی حفاظت ان کے حقوق کے مطالبے اور انکی تائید اس پرچے کا نصب العین ہے ممالک اسلامیہ عرب، ایران، مصر و عراق افغانستان اور حیدرآباد کے مسایل حاضرہ اور حالات و کوائف پر تنقیح و تبصرہ کا خاص اہتمام ہے مسلمانان ہند کے سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مسایل پر آزادانہ مباحثے اور رہنمایانہ رائے دہی میں کافی سعی کی جاتی ہے ہر نمبر میں ضرور ایک آدھ علمی مضمون بھی ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں مسلمانوں کے خاص اخبارات کی جو کمی ہے اس کے مدنظر یہ ہفتہ وار اخبار نہایت مفید اور قابل قدر ہے لایق مدیر اور کارپردازان انتظامی کے حسن سعی سے اچھے کاغذ صاف ٹایپ اور پاکیزہ طباعت کے ساتھ یہ پابندی شایع ہو رہا ہے۔ انگریزی کے اچھے انشاپردازوں کے مضامین بھی ہوتے ہیں پبلک ذہنیت کی تعلیم و تربیت کے لیے امید ہے کہ اس کی خدمات بڑی مفید ثابت ہونگی۔

بجز ٹائیٹل لقبیہ کامل حصۂ متن مطبوعہ خورشید پریس موقوعہ یوسف بازار نیپال حیدرآباد

اس صدی کی
مہتم بالشان اردو کتاب
اردو شہ پارے

فہرست مضامین مجلّہ مکتبہ

(جلد سوم)

تنقیدین

تصاویر

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سیکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اُس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ پسلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) ۸ نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۳ہر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی معاف ہوگا۔

خط اور تار کا پتہ "زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پُرتاثیر اور لاجواب دوا

بیرونی استعمال کے لئے اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اُس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر۔ درد سول بچھو کے زہر کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا استعمال کرنے سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعضا کو سینکیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرماویں بخوشی تعمیل کی جائیگی۔

نوٹ:۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر۔ جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

مطبوعات مکتبۂ ابراہیمیہ

روح تنقید — از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (لندن) فن تنقید پر اردو زبان میں پہلی اور جامع کتاب ہے جس میں ماضی وحال کے علمائے مشرق و یورپ کے اصول تنقید مع مثالوں کے بیان کئے گئے ہیں اور اردو تنقید کی موجودہ حالت اس میں ترقی کے امکانات پر بحث اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر تنقید کی گئی ضخامت (۳۰۵) صفحے طبع دوم قیمت (عہ)

تنقیدی مقالات — از ڈاکٹر زور یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں اردو کے مشاہیر شعرا اور نثر نگاروں کے شہ کاروں پر بسیط تنقید کی ہے۔ تخلیقی تنقید کے ساتھ انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنیکے خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت (۲۰۰ صفحے) مجلد قیمت (عہ)

اردو کے اسالیب بیان — از ڈاکٹر زور۔ اردو نثر نگاری کی ابتدا سے لیکر موجودہ زمانہ کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان پر بالغ نظرانہ تنقید۔ اردو انشا پردازی کے اسالیب کی عہد بہ عہد تبدیلیاں مختلف رجحانات تحریر پر محققانہ تبصرہ ضخامت صفحے (۲۰۴) قیمت (عہ)

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب — از ڈاکٹر زور۔ سلطان محمود غزنوی سے پہلے فارسی ادب کا سرسری خاکہ، محمود غزنوی کے علمی ادبی کارنامے۔ فارسی ادبیات دور غزنویہ کا مفصل تذکرہ ضخامت (۱۲۰) صفحے قیمت ۱۲ ار

دنیائے افسانہ — از مولوی محمد عبد القادر سروری۔ ایم اے، ال ال بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ۔ افسانہ نگاری کے اصول و مبادیات اور اردو افسانوں پر اجمالی تبصرہ ضخامت صفحے (۲۱۸) قیمت (عہ)

دکن میں اردو — از مولوی نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل، جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا قطب شاہی، عادل شاہی، اور آصف جاہی دوروں میں اردو نظم و نثر کی ترقی کی تاریخ اور دکن کی ابتدا سے لیکر موجودہ زمانہ کے دو ادیبوں کا

مفصل تذکرہ مع نمونہ کلام ضخامت (۲۸۰) صفحے۔ طبع دوم قیمت (عار)

ارباب نثر اردو | از مولوی سید محمد ام۔ اے۔ شمالی ہند میں اردو نثر نویسی کی اساسی تحریک۔ فورٹ ولیم کالج کی مساعی اور انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر کی محققانہ تاریخ۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تمام نثر نویسوں کے حالات ان کی تحریروں کے اقتباسات کے ساتھ بالتفصیل دیئے گئے ہیں۔ ضخامت (۳۲۰) صفحے مجلد قیمت (عار)

آثار الکرام | از مولانا حکیم سید شمس اللہ قادری۔ ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں کی علمی سرپرستیوں اور ان کے عہدوں کے علمی، ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت (۱۴۴) صفحے تقطیع کلاں قیمت (عہ)

جواہرات کلیات نظیر | از مولانا ذہین و علامہ مختار احمد۔ ہندوستان کے مقبول خاص و عام ہر دلعزیز شاعر نظیر اکبر آبادی کے کلیات کا پاکیزہ انتخاب جس میں بہترین اخلاقی، ادبی، ظرافت آمیز اور دلنواز نظمیں شریک ہیں۔ ضخامت (۲۸۰) صفحے قیمت (عہ)

اردو شہ پارے | از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ام۔ اے، پی، اچ، ڈی (لندن) اردو کی ابتدا سے لے کر ولی کے عہد تک کی ادبی تاریخ اور اس زمانے کے اردو شاعروں اور انشا پردازوں کے بہترین شہ کار جس کے ساتھ دکنی الفاظ کی فرہنگ اور متعلقہ دور کے ادب دوست بادشاہوں اور شاعروں کی نایاب تصاویر۔ جلد اول۔ ضخامت (۴۰۰) صفحے ولایتی کاغذ (فدریبر) مجلد قیمت (لے ۱۲)

اس سلسلے کی جلد دوم جس میں ولی کے بعد سے لے کر حالی کے عہد تک کی ادبی تاریخ اور اس دور کے مصنفین نظم و نثر کے بہترین شہ کار درج ہیں اور جس کو مولوی سید محمد ام، اے، نے بڑی تلاش و تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے (زیر طبع)

جلد سوم مرتبہ مولوی محمد عبد القادر سروری ام۔ اے، ال، ال، بی۔ جس میں حالی سے لے کر موجودہ زمانہ تک کے شاعروں اور انشاء پردازوں کے شہ کار ہیں۔ (زیر طبع)

گلشن گفتار | از مولوی سید محمد ام، اے۔ شعرائے اردو کا سب سے پہلا تذکرہ جس میں زمانہ قدیم سے لیکر میر و سودا کے عہد تک شعراء کے معتبر حالات درج ہیں۔ فاضل مرتب نے ہر شاعر کے ساتھ تمام قدیم ترین تذکروں سے اس کے حالات بصحت جمع کر دیئے ہیں۔ شروع میں ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں قدیم اردو شاعری، اسالیب شعری اور ان کی مقبولیت، اردو تذکرہ نویسی پر دلچسپ بحث ہے، شعرائے قدیم پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے بہترین رہنما، ہر شاعر کی لائف کا مواد موجود ہے، ضخامت (۱۰۰) صفحے قیمت (۱۲)

قاموس الاغلاط | از مولانا ذہین و علامہ سید مختار احمد، عربی، فارسی، اردو، الفاظ جو غلط طور پر اردو میں مروج ہیں، ان کی مختلف پہلوؤں سے تصحیح کر کے ہر لفظ کا صحیح طریقۂ استعمال بتایا گیا ہے۔ ہر لکھنے والے کو اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے، ضخامت (۳۳۲) صفحے، قیمت مجلد (عہ)

دکنی لغت | از سید شعار احمد شعار، اردوے قدیم اور دکھنی کے الفاظ و محاورات کی لغت، ولی اور دیگر شعرائے قدیم کے مطالعہ میں مدد دینے والی فرہنگ، قیمت ۸

مبادی فلسفہ | از مولوی میر حسن الدین بی، اے، ال، ال، بی، ڈاکٹر راپورٹ پی، اچ، ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص اور بامحاورہ اور سلیس اردو ترجمہ، اردو میں فلسفہ کی پہلی کتاب (ضخامت ۱۳۶ صفحے) قیمت ۱۴ر

فسانہ اور کردار | از مولوی محمد عبدالقادر سروری، ام، اے، ال ال، بی۔ دنیائے افسانہ کا دوسرا حصہ، جس میں اشخاص قصہ افسانوں میں ان کی اہمیت اور خوبی کے معیار اور اردو زبان کے چند بہترین اشخاص قصہ پر معنی خیز بحث، ضخامت (۲۳۲) قیمت (عہ)۔

خیابان اردو | از مولوی مختار، ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور گرامی شعراء کے مضامین نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو شائقین ادب کے لئے لاجواب تحفہ ہے۔ ضخامت (۴۲۵) مجلد قیمت (عہ)

طلسم تقدیر | از ڈاکٹر زور، ایک دلچسپ نیم تاریخی فسانہ جس میں دکن کی تاریخی حالت اور اس کے باشندوں کے تمدن پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز تقدیر و تدبیر کے اہم مسئلہ کو بڑی خوبی سے سلجھایا ہے۔ ضخامت ۹۵ صفحے قیمت ۸

اسوۂ حسنہ | از مولوی احمد عبداللہ مسدوسی، بی، اے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی، اس کا تفصیلی جواب۔ ضخامت (۸۰) صفحے قیمت ۸

جغرافیۂ ریاست حیدرآباد دکن | از مولوی غلام قادر بی، اے و مولوی غلام رسول قلمرو سرکار حضور نظام کا تفصیلی اور پُر از معلومات جغرافیہ جس میں ضلع واری اور مختلف موضوعات کے متعدد نقشے شامل ہیں۔ ضخامت (۱۷۶) صفحات قیمت ۱۲

مخزن القواعد | از مولوی میرزا علی رضا شیرازی لکچرار فارسی سٹی کالج، فارسی کی سلیس اور مفید صرف و نحو۔ قیمت ۱۲

ملنے کا پتہ:۔ منیجر مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

سرمایہ داروں کے لئے
زرّین موقع

ملک میں علم و ادب کی خدمت کے لئے ملک والوں کے فائدہ ہی کے لئے ملک ہی کے مُشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر تجارتی کاروبار چلانے کی غرض سے انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ محدودکی بنیاد ڈالی گئی اور انجمن ہائے امداد باہمی ملک سرکار عالی کے تحت رجسٹری کرائی گئی ہے انجمن کا کاروبار تین شعبوں پر منقسم ہے:۔

(۱) تجارت کتب (۲) اشاعت کتب (۳) طباعت

اس انجمن کو اتحادی طور پر کام کرتے ہوئے چوتھا سال ہے تین سال سے اپنے حصہ داروں کو سالانہ دس فیصدی نفع علاوہ زکوٰۃ کے تقسیم کر رہی ہے انجمن کا **مجوزہ سرمایہ** ایک لاکھ روپے کے ہزار حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک حصّے کی قیمت سو روپیہ ہے اور ہر حصّے کی ادائی (۲۰) اقساط میں یکمشت قیمت کی ادائی پر اس سال کا ڈیوڑھا منافع دیا جاتا ہے۔

اجراشدہ سرمایہ پچاس ہزار روپیہ **قیمت فروخت شدہ حصص** تیس ہزار روپیہ۔ شرکت کے فارم اور قواعد و ضوابط کے لئے ذیل کے پتے پر درخواستیں آنی چاہئیں۔

مُعتمد انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ محدود اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مجلّہ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبۂ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ
روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے
نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہوسکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس
روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید
کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا - یکمشت خریدنے والے
حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے
اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔
خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب احباب بالا
رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری
کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص
مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

دار الاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

کے

مدیر

عبدالقادر سروری ام اے ال ال بی

ناشر

سید محمد ام اے

عمر یافعی

مجلّہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں سے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

نیز احتیاطاً ہر پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو دفتر کو مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک ششماہی چھ ماہ کے لئے (صہ) فی پرچہ ۶؎

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (عہ) نصف کیلئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلّہ مکتبہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے۔

رجسٹر نشان پسرکار آصفیہ

(٦٥)

رجسٹر نشان نیہ سرکار انگلشیہ

(۰۰۰۰۰۰)

مجلۂ مکتبہ

جلد (۴) بابتہ ماہ بہمن سنہ ۱۳۳۹ ف م دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء شمارہ (۳)

تصاویر

(۱) موسیٰ ندی (حیدرآباد دکن)۔ (۲) مندر کارنک (مصر) کا اندرونی حصہ

فہرستِ مضامین

شذرات

مجلہ مکتبہ میں چوتھی جلد سے جو صوری و معنوی تبدیلیاں کردی گئی ہیں انھیں ہمارے قارئین کی پسندیدگی حاصل ہوئی اور ہم مسرت کے ساتھ اس کا اظہار کرسکتے ہیں کہ دکن اور بیرونِ دکن میں مجلہ مکتبہ رفتہ رفتہ خاص مقبولیت حاصل کرتا جارہا ہے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے، اور اس کا اظہار "بدتر از گناہ" نہیں تو اور کیا ہے کہ طباعت و کتابت کی ناگوار مشکلات ہمیں قدم قدم پر مبتلائے زحمت کیے جارہی ہیں۔ جن لوگوں کو اس کام سے سابقہ پڑا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ حیدرآباد دکن میں فی الوقت اچھی کتابت اور طباعت کیسی کم یاب شئی بن گئی ہے؟ ہم اس کی متصل کوشش میں ہیں کہ کسی طرح ان پر غالب آئیں اور پابندی وقت سے رسالہ پیش کریں۔

اس سال دسمبر کی آخری تاریخوں میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن (مجلس اسنادات تاریخی) کی بارھویں میقات گوالیار میں منعقد ہوئی۔ گوالیار کے اربابِ نظم و نسق کے حسن اہتمام سے یہ میقات نہایت کامیاب رہی۔ ہندوستان کے چیدہ علمائے تاریخ مثلاً سر جادو ناتھ سرکار، ڈاکٹر بھنڈارکر، پرنسپل رالنس اور مولوی عبد العلی ایم۔ اے وغیرہ نے متعدد تاریخی عنوانات پر محققانہ مضامین پڑھے اور پھر ہندوستان کے مختلف اقطاع کے محکمہ جات اسناد تاریخی کے ذمہ دار عہدہ داروں اور نمایندوں نے سال بھر کی اسنادی چھان بین اور نئے مواد کی فراہمی وغیرہ پر تبادلۂ خیالات کیا۔ کمیشن کے سلسلے میں بڑے سلیقے سے تاریخی اسناد و آثار کی عظیم الشان نمائش بھی کی گئی۔ نمائش کیا تھی ہندوستان کی عظمت گزشتہ کا ایک مرقع۔ ایک وسیع ہال صرف اگلے زمانے کے آلاتِ حرب سے سجا ہوا تھا۔ دیگر نو بڑے بڑے کمروں میں اگلے بادشاہوں کی تصاویر، تحریرات، کتبے، مجسمے، تاریخی سکے اور دیگر آثار اس خوبی سے آراستہ کیے گئے تھے کہ ایک سرسری سیر بھی ہر دیکھنے والے کو ہمارے گزشتہ تمدن کی عظمت و اہمیت کا قائل کردے۔ ہماری ریاست سے بھی مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر اسناد تاریخی نے نمایندگی کی اور اسناد کی خاص کارروائیوں میں شریک رہ کر اِس خصوص میں یہاں جو تحقیقات ہوئی ہیں

اُن سے ارکانِ مجلس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ صاحب موصوف کے علاوہ جامعہ عثمانیہ سے بھی پہلی دفعہ مولوی ہارون خاں صاحب شروانی پروفیسر تاریخ کو نمائندہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ گوالیار کے ارباب اہتمام نے ارکانِ مجلس کو وہاں کے آثار قدیمہ کی سیر کرائی۔ گوالیار کا قلعہ جو قدیم ہے اور متعدد جنگوں میں مرہٹوں کی جائے پناہ تھا قابلِ دید ہے۔ اس کے علاوہ حضرت محمد غوثؒ ایک بڑے بزرگ کا مزار بھی مشہور زیارت گاہ ہے۔ یہیں ہندوستان کے مشہور مغنی تان سین کی قبر ہے۔ ریاست کی طرف سے آثار قدیمہ کی حفاظت کا معقول انتظام ہے اور سیاح بکثرت آتے رہتے ہیں۔

دسمبر کی آخری تاریخوں میں سیاسی جلسوں کے ساتھ زندہ دلانِ پنجاب کی سعی و اہتمام سے سارے ہندوستان کے کتب خانوں کی کانفرنس بھی منعقد ہوئی اور یہ پہلی دفعہ ہے کہ اس کانفرنس کے ساتھ ایک مفید نمائش بھی کی گئی۔ سر پی۔ سی رے پروفیسر جامعہ کلکتہ کے فاضلانہ خطبہ کے علاوہ کتب خانے کے متعلق مختلف اربابِ علم نے اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کیا۔ مسٹر راندھیر جی ایم۔ اے۔ مدیر ماڈرن ریویو کا مضمون "کتب خانے کے فوائد" پر بے حد پسند کیا گیا۔ نمائش میں پنجاب اور دیگر مقامات کی انگریزی و اردو مطبوعات کے علاوہ مخطوطات کا ایک مختصر ذخیرہ بھی تھا۔ ایک حصے میں کتب خانے کی تازہ ترین اصلاحات کا مظاہرہ کیا گیا تھا جس سے کتب خانوں کے اربابِ متعلقہ نے بڑی مفید معلومات حاصل کیں۔

مکتبۂ ابراہیمیہ ایک عرصے سے اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ مدارس سرکار عالی کے لیے مختلف مضامین میں عمدہ کتب نصاب تیار کرے۔ قبل ازیں سلسلہ حساب اور جغرافیہ ریاست حیدرآباد سلسلہ معلوماتِ دیہی اور چند دیگر انتخابات جو اس نے پیش کئے تھے ملک اور سرکار عالی دونوں نے ان کو پسند کیا اور ان میں سے اکثر و بیشتر نصابِ تعلیم میں شریک کر لیے گئے۔ اب مکتبۂ فارسی کا کورس مرتب کر رہا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی قاعدۂ فارسی کو طبع کرکے اہلِ ملک کے آگے پیش بھی کر دیا ہے۔ یہ کورس بالکل جدید اصول تعلیم پر تیار ہو رہا ہے۔ نیز اس کی ترتیب میں بطور خاص یہ امر ملحوظ ہے کہ مقامی خصوصیات کے ساتھ کتابیں طلبہ کے لئے دلچسپ ہوں اور ان میں اعلےٰ

موسی ندی

مندر کارنک (مصر) کا اندرونی حصہ
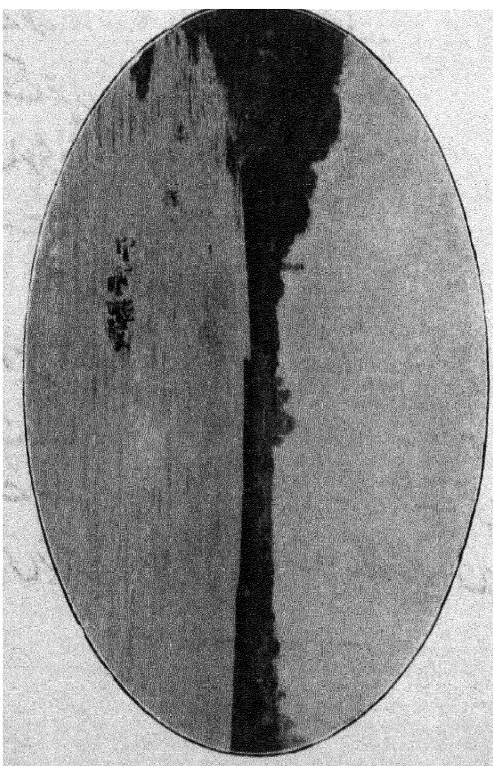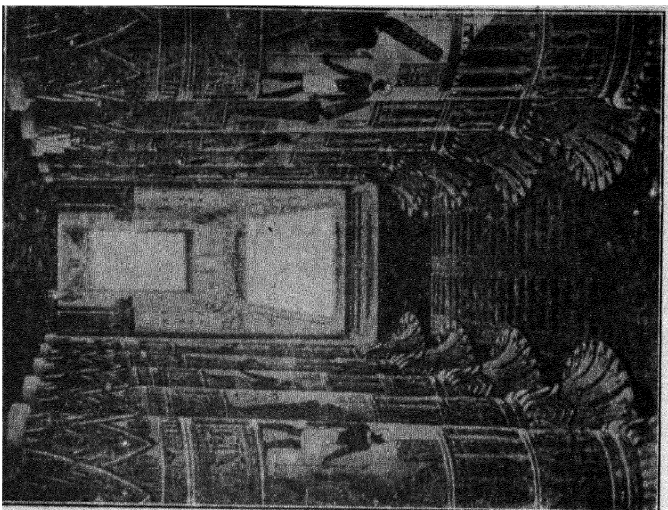
ذوق ادب پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔ ہمیں امید ہے کہ مکتبہ کی یہ مساعی بار آور اور مفید ثابت ہوں گی۔

اِس مہینے مکتبہ سے ایک اور کتاب "کردار اور افسانہ" اشاعت پذیر ہوئی ہے جو مجلہ مکتبہ کے ایڈیٹر کی تالیف ہے۔ مصنف نے اِس سے قبل افسانے کے اصول و مبادیات پر اپنی ایک کتاب "دنیائے افسانہ" میں افسانے کے متعلقات پر مزید تحقیقات و معلومات پیش کرنے کا جو وعدہ کیا تھا، یہ اُسی کا ایفا ہے۔ "کردار اور افسانہ" میں افسانے کے سب اہم پہلو یعنی اشخاصِ قصّہ سے متعلق تمام فنی اور تنقیدی معلومات جمع کی گئی ہیں اور اُردو کے چند مشہور ترین اشخاص کو انھیں اصول کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستانی اکاڈمی نے اُردو میں اعلیٰ کتابیں شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اُس میں حسبِ ذیل کتابیں جو اس وقت زیرِ طبع ہیں اُردو ادب میں مفید اضافہ کریں گی:-

۱۔ مغلوں سے عرب و ہندوستان کے تعلقات۔

۲۔ مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر۔

۳۔ ہندی شاعری۔

۴۔ ترقی زراعت۔

اِس مہینے اُردو میں چند نئے رسالے جاری ہوئے ہیں اور بعض کے جنوری سے اجرا ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ اِن میں لکھنؤ کا "ادب" اور الٰہ آباد کا "چاند" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آئندہ نمبر میں انشاءاللہ ان نئے معاصرین پر تبصرہ کیا جائے گا۔ تنقید کے لئے بھی اس ماہ میں متعدد کتب وصول ہوئی ہیں جن پر اِس نمبر میں تبصرہ نہیں کیا جا سکا۔ اگلے نمبر میں ان پر بھی ریویو شائع ہوں گے۔

خود اعانتی

(از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی اے)

مرزا صاحب نے اسمائلز کی مشہور عالم کتاب "سلف ہلپ" کا اردو میں نہایت پاکیزہ ترجمہ کیا ہے اس سے پہلے اس کتاب کا ایک ملخص ترجمہ "سحر تاب" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ لیکن علمی دنیا میں اس کتاب کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کے مدنظر اس کی ضرورت تھی کہ اس کو پوری طرح اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ مرزا صاحب کی یہ کوشش بے حد ستایش کی مستحق ہے کیونکہ اس کے مفید ہونے میں شبہ نہیں۔ یہ اس ترجمہ کا ابتدائی حصہ ہے دیگر حصے بھی آئندہ شائع کیے جائینگے۔ "مجلہ مکتبہ"

"خدا اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"

یہ ایک آزمودہ مقولہ ہے اور اس چھوٹے سے فقرے میں وسیع انسانی تجربے جمع ہیں خود اعانتی کا جوش حقیقی انفرادی ترقی کی بنیاد اور قومی ترقی و اقتدار کا اصلی ذریعہ ہے دوسروں کی مدد کے نتائج عموماً کمزور ہوا کرتے ہیں لیکن ذاتی مدد سے انسان کو کافی تقویت حاصل ہوتی ہے اشخاص یا گروہوں کا کام دوسرے انجام دیں تو اس سے ان کے دماغوں سے خود اعانتی کا جوش اور اس کی ضرورت کا احساس جاتا رہتا ہے۔ اور جب کبھی اشخاص کسی رہنما یا حکومت پر کامل اعتماد کر لیتے ہیں تو اس صورت میں ان کا یہ طرز عمل انھیں بالکل بے بس بنا دیتا ہے۔

بہترین ادارے یا دستور بھی انسان کو عملی مدد نہیں دے سکتے ان سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی فلاح و بہبود کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیں لیکن ہر زمانہ میں لوگ اس بات کو تسلیم کرتے آئے ہیں کہ مرفہ الحالی اور عیش و آرام ذاتی کوشش سے نہیں بلکہ اداروں کے ذریعہ حاصل کیا جائے اور یہی سبب ہے کہ قانون ساز مجلسوں کو انسانی ترقی اور بہبودی کا بڑا ذریعہ خیال کر کے انھیں سب سے افضل و اعلیٰ سمجھا جاتا ہے تین یا پانچ برس میں ایک آدھ دفعہ ایک یا دو اشخاص کسی مسئلہ کی نسبت رائے دینے سے خواہ وہ کیسی ہی دیانتداری سے دیجائے قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ اس سے کسی شخص کی زندگی اور سیرت پر بہت تھوڑا عملی اثر پڑ سکتا ہے۔ نیز یہ بات دن بدن روز روشن کی طرح واضح ہوتی جا رہی ہے کہ حکومت کا کام اثباتی اور عملی نہیں بلکہ منفی اور مانع ہے اور وہ انسانی جان و مال اور آزادی کی حفاظت ہے قوانین کا نفاذ اور عملدر آمد اگر دانشمندی سے

ہو تو اس سے انسانوں کو اپنی دماغی یا جسمانی محنت کے ثمرہ سے مستفید ہونے کا موقع ہاتھ آتا ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ لوگ کسی قدر ذاتی ایثار سے بھی کام لیں لیکن سخت ترین اور ابھارنے والے قوانین بھی ایک کاہل کو محنتی، مسرف کو کفایت شعار۔ یا شرابی کو پرہیزگار نہیں بنا سکتے یہ باتیں انفرادی کوشش کفایت شعاری اور کوشش سے حاصل ہو سکتی ہیں نیز انکے لئے صفات ستودہ کی ضرورت ہے نہ کہ اعلیٰ حقوق واقتدار کی۔

کسی قوم کی حکومت ہمیشہ ان افراد کا عکس ہوتی ہے جن پر وہ حکمراں ہوتی ہے جو حکومت اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں اعلیٰ ہوگی وہ مجبوراً کھچ کھچا کر رعایا ہی کی سطح پر آجائے گی اور جو حکومت اپنی رعایا سے پیچھے ہو وہ آخر کار ترقی کی دوڑ میں رعایا کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہو جاتی ہے یہ ایک قانون فطرت ہے کہ قوم کا مجموعی کردار جس قسم کا ہو قانون اور حکومت بھی اس کے موافق ہوتے ہیں جس طرح کہ پانی اپنی چال کس آجاتا ہے۔ شریف انسانوں (عمدہ رعایا) پر شریفانہ اور بدکرداروں وجاہلوں پر غیر مہذب طریقے سے حکومت ہو سکتی ہے حقیقت میں تجربوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی سلطنت کی قوت اور قدر و منزلت کا انحصار اسکی حکومت کے عمدہ ہونے پر نہیں بلکہ اس کے افراد کے کردار اور تہذیب پر ہوتا ہے کیونکہ قوم محض انفرادی اوصاف کا مجموعہ ہے اور قوم کی تہذیب درحقیقت اُن مرد۔ عورت اور اطفال کی ذاتی ترقی کا مسئلہ ہے جن سے کہ قوم بنتی ہے جس طرح قومی تنزل انفرادی کاہلی، خود غرضی اور برائیوں کا مجموعہ ہے اسی طرح قومی ترقی شخصی محنت و عزت، ہمدردی و راستبازی کا نتیجہ ہے جن امور کو ہم اہم تمدنی نقائص کے نام سے موسوم کرتے ہیں اُن کے متعلق اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ محض انسان ہی کی آوارگی اور گمراہیوں کا نتیجہ ہیں اور اگرچہ کہ ان کو نیست و نابود کرنے اور ان کی بیخ کنی کی جد و جہد کی جا سکتی ہے تاہم جب تک شخصی زندگی اور کردار بذات خود روبہ اصلاح نہ ہو جائے برائیاں دوبارہ تازہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتی رہیں گی اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کی حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کا انحصار قوانین کے تغیر و تبدل اور اداروں کی ترمیم و اصلاح پر اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ انسانوں کو اُن کی ذاتی اور آزادانہ کوشش سے اعلےٰ مدارج کے حصول اور ترقی کا جوش دلانے اور اُن کی مدد کرنے پر ہے۔

یہ بات کہ انسان پر خارجی حکومت کس طرح ہوتی ہے بہت کم اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ہر چیز کا انحصار اس پر ہے کہ انسان اپنی قوتوں کے ذریعہ خود پر کس طرح حکومت کرتا ہے سب سے بڑا غلام وہ نہیں ہے جو کسی مطلق العنان اور ناخدا ترس بادشاہ کا محکوم ہو گو یہ جرم بُرا ہے بلکہ وہ شخص غلام ہے جو اپنی بداخلاقی، خود غرضی، جہالت اور شریر النفسی کا غلام ہو وہ اقوام جن کے دل اس طرح غلام بن گئے ہیں وہ محض عمدہ دستوروں یا عمدہ قومی انتظام سے آزادی حاصل نہیں کر سکتیں اور جب تک یہ غلامانہ ذہنیت کہ ہماری آزادی

و ترقی حکومت پر منحصر ہے دور نہ ہو اس وقت تک حکومت کے عمدہ انتظام سے خواہ وہ کتنی ہی محنت کا نتیجہ کیوں نہ ہو ویسے ہی غیر موثر اور غیر سودمند نتائج پیدا ہوں گے جیسے کیمیائی جلوسے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ نیز اس قسم کے نتائج کا رتبہ فانوس خیال سے زیادہ نہ ہو گا آزادی کی استوار بنیادوں کا انحصار انفرادی کردار پر ہونا چاہیئے کیونکہ یہی تمدن و معاشرت اور قومی ترقی کا محافظ اور کفیل ہے جان اسٹوارٹ مل کا یہ قول صحیح ہے کہ "ظالم اور خود مختار حکومت بھی اگر اس کی رعایا میں شخصی ترقی اور اصلاح کی صلاحیت موجود ہو تو اپنے قبیح اثرات پیدا نہیں کر سکتی اور جو چیز شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی خود مختار اور ظالم حکومت ہے خواہ وہ کسی نام سے موسوم کی جائے۔"

انسانی ترقی کے متعلق لوگوں کے خیالات مختلف رہے ہیں بعض لوگ خضر جیسی ہستیوں کو ڈھونڈھتے ہیں اور بعض قومیت اور قوانین پارلیمنٹ کے خواہاں ہیں یعنی ایسی فیاض حکومت کے خواہشمند ہیں جو ہمارے سب کام کر دے ہمیں خضروں کا انتظار کرنا ہے اور جب وہ مل جائیں تو "خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ان کو پہچان کر اُن کی تقلید کریں" اس اصول کا مختصر مطلب یہ ہے کہ ہر چیز رعایا کے لیئے کی جائے رعایا خود کچھ نہ کرے یہ ایسا اصول ہے کہ اگر اس کو ہمارا رہنما اور ہادی تصور کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ قوم کی آزادانہ ذہنیت کو برباد کر کے انسانوں کو انسان پرست بنا دے گا خضر کی پرستش انسانی پرستش کی بدترین شکل ہے اور حقیقت میں ایسا ہونا محض قوت کی پرستش ہے نیز اس کے اثرات دماغ انسانی کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسا کہ دولت کی پرستاری سے وہ خوار و ذلیل ہو جاتا ہے ایک بہتر اور سچا اصول جس کی اقوام کو تعلیم دی گئی ہے اور جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اصول خود اعانتی ہے اور جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے عملی جامہ پہنائیں گے۔ خضر کو ڈھونڈھنا بھول جائیں گے اور دن پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور وکٹر ہیوگو نے قلم اور سیف کے متعلق اپنی جو رائے ظاہر کی ہے کہ سه زبان قلم سیف پر ہو گی غالب۔ ان ہر دو اصول پر بھی بجنسہ منطبق ہوتی ہے اور اس سے ہم یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ ہمیں خود اعانتی کے اصول کو اپنا مطمح نظر اور نصب العین بنانا چاہیئے کیونکہ ذاتی مدد اوروں کی مدد پر غالب آتی ہے۔

قوموں اور پارلیمنٹ کے قوانین کی قوت بھی ایک SUPERSLITION ہے آئرلینڈ کے ایک سچے محب وطن ولیم ڈارگن نے ڈبلن کی پہلی صنعتی نمائش کے موقع پر جو کچھ کہا اس کا ذکر اس موقع پر مناسب ہے اس نے کہا کہ "سچ تو یہ ہے کہ جب کبھی میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں میرا وطن اور میرے ہم وطن مجھے فوراً یاد آتے ہیں ہم اپنی آزادی کی نسبت بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں

قو ی یقین ہے کہ ہماری صنعتی آزادی ہمارے ہی اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کیئے جائیں اور اپنی قوتوں کو بجا طور پر استعمال کریں تو اس سے بہتر کوئی موقع ہماری آئندہ بہتری کے لیئے نہیں ہے استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے اگر ہم دلی جوش اور محنت سے کام کیئے جائیں تو مجھے کامل یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک اچھی قوم کی مانند ہو جائے گی اور ہم عیش و آرام خوشی اور آزادی سے مستفید ہوں گے۔"

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قومیں کئی نسلوں کے تجربوں اور کارناموں سے بنی ہیں مستقل مزاج اور محنتی مزدوروں۔ باہمت کاشت کاروں کان کنوں، موجدوں۔ صناعوں۔ آلات جر ثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ وروں شاعروں حکیموں، فلسفیوں اور مدبروں نے اپنے اپنے پیشہ کی حد تک اقوام کے بنانے میں حصہ لیا ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی اور اس کو اعلیٰ مدارج تک پہنچایا ہے ان شریف کاریگروں یعنے تہذیب و شائستگی کے معماروں کی مسلسل محنت نے صنعت، سائنس اور فنون میں بے ترتیبی کو دور کرکے ایک تنظیم پیدا کردی اور رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے آبا و اجداد نے اپنی ہوشیاری اور محنت سے مہیا کی تھی یہ جائداد ہم کو اس لیئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مار بر گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ اس سے مستفید ہوں اور اپنی کوشش سے اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لیئے چھوڑ جائیں۔

انگریزوں کو جو اس قدر ترقی ہوئی اس کا سبب صرف یہ ہے کہ خود اعانتی کا جوش ہر زمانہ میں ان کے قومی کردار کی ایک نمایاں خصوصیت رہا ہے اور اس سے ان کے قومی اقتدار کا اندازہ ہوتا ہے۔ انگریزوں میں ہر زمانہ میں چند افراد ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جو عوام کے طبقہ سے بلند رتبہ رکھتے تھے اور عوام انھیں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن انکی ترقی میں ہزاروں معمولی اور غیر معروف ہستیوں کے کارناموں کو بڑا دخل رہا ہے۔ گو کسی لڑائی کی تاریخ میں صرف سپہ سالاروں کے نام قابل یادگار ہو سکتے ہیں تاہم ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ فتوحات اکثر افراد ہی کی جرأت و دلاوری کی بدولت حاصل ہوئی ہیں زندگی بھی ایک "سپاہیانہ جنگ ہے" ہر زمانہ میں عام لوگ ہی بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں جس طرح بہت سے خوش نصیب اور زبردست ہستیوں کے نام سوانح عمری میں درج ہو چکے ہیں اسی طرح اکثر ایسے لوگوں کے حالات زندگی جن کا تہذیب و ترقی انسانی پر نہایت گہرا اثر پڑا ہے ضبط تحریر میں نہیں آئے۔ ادنےٰ ترین انسان کی زندگی کا بھی جو اپنے ہم جنسوں کے سامنے محنت

سنجیدگی بے لوثی و ایمانداری کی نظیر پیش کرتا ہے ملک کی خوش حالی پر زمانہ موجودہ و مستقبل میں اثر پڑتا ہے کیونکہ اس کی زندگی اور چال چلن کا اثر غیر معلوم طور پر دوسروں پر بہت پڑتا ہے اور آئندہ نسل کے لیے ایک اچھی نظیر قائم ہو جاتی ہے۔

روزمرہ کا تجربہ بتلاتا ہے کہ شخصی کردار سے دوسروں کی زندگی اور چال چلن پر قوی اثر پڑتا ہے اور حقیقت میں یہی بہترین عملی تعلیم ہے اور جب ہم اس کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسہ اور مدرسۃ العلوم کی تعلیم محض ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے زندگی کے علم کا جس کو انگریزی میں لائف ایجوکیشن کہتے ہیں۔ قوم اور انسانوں پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے مکتب و مدرسہ کا علم طاق یا صندوق یا کسی بڑے کتب خانے اور الماری میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے گھر کی بود و باش۔ شہر کے کوچوں میں پھرنے۔ صراف کی دوکان کرنے۔ ہل جوتنے کلوں کے کارخانوں اور پارچہ بافی کے مقامات پر اپنے ساتھ ہی ہوتا ہے یہی وہ مکمل اور موثر تعلیم ہے جس کو شلر نے "نسل انسانی کی تعلیم" کے نام سے موسوم کیا ہے اور جو محنت، اخلاق، خود تربیتی اور نفس کشی پر مشتمل ہے۔ اسی قسم کی تعلیم سے انسان انسان بنتا ہے اور اس کی صحیح تربیت ہونے سے وہ اپنے کاروبار اور فرائض زندگی کو صحیح طریقہ پر انجام دینے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور اپنی عاقبت کو سنوارنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ تعلیم کتابوں سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ انسان اس کو کسی علمی تحصیل سے حاصل کر سکتا ہے لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ "علم سے عمل نہیں آ جاتا علم کو عمل میں لانا علم کی دسترس سے باہر ہے مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست کرتا اور اس کو عالم باعمل بنا دیتا ہے" یہ رائے علمی زندگی اور دماغی تربیت پر ٹھیک طور پر صادق آتی ہے کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ انسان خود کو بہ نسبت تعلیم کے عمل کے ذریعہ زیادہ کامل بنا سکتا ہے اور علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ کردار آدمی کو زیادہ معزز بنا دیتا ہے۔

بڑے اور خصوصاً اچھے آدمیوں کی سوانح عمریاں نہایت کارآمد اور سبق آموز ہوتی ہیں کیونکہ ان کے مطالعہ سے دوسروں کو کافی مدد حاصل ہوتی ہے اور وہ محرک۔ اور رہبر کا کام دیتی ہیں۔ بعض بہترین سوانح عمریاں قریب قریب الہامی کتابوں کے مساوی ہیں جن میں ہم کو اعلیٰ زندگی۔ بلند خیالی اور ذاتی اور دنیاوی مفاد کے لیے پرجوش عمل کا سبق ملتا ہے۔ خود اعانتی کی قوت۔ مستقل عزم عمل اور دیانت داری کی جو مفید مثالیں یہ سوانح عمریاں پیش کرتی ہیں اور جن سے شریفانہ اور مردانہ اخلاق یا کردار کے بنانے میں مدد ملتی ہے ان سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان میں اس کے ذاتی مفاد کی کوشش کی کس قدر قوت موجود ہے نیز یہ کہ خود اعتمادی اور خودداری سے ادنیٰ انسان بھی دوامی اور غیر فانی شہرت

اور عزت و آرام حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

بڑے بڑے ماہران سائنس۔ انشا پرداز حسن کار۔ زبردست پیروان مسیح اور پیشہ گار کسی بالائی قوم یا اعلیٰ جماعت سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ درس گاہوں۔ کارخانوں۔ گوداموں۔ غربا کے جھونپڑوں اور امرا کے محلوں سے ہی پیدا ہوئے مسیح کے بعض زبردست پیرو معمولی لوگوں میں سے تھے بعض اوقات غربا ہی نے اعلیٰ مناصب و مراتب حاصل کئے ہیں۔ ناقابل عبور دشواریاں بھی انکی راہ میں روڑے اٹکا نہ سکیں بلکہ یہی دشواریاں اکثر موقعوں پر ان کے ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں نیز ان سے ان کے قوت عمل اور عزم کو تقویت حاصل ہوئی اور ان کی وہ قابلیتیں یا ذاتی جوہر جو بصورت ثانی پوشیدہ اور بیکار رہتے ظاہر ہو سکے اس قسم کے مغلوب کردہ موانعات اور محصلہ کامیابیوں کی مثالیں حقیقت میں اس قدر ہیں کہ ان سے مندرجہ ذیل خیال کی تصدیق ہوتی ہے ؎

ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

مثال کے طور پر اس مشہور واقعہ کو لیجئے۔ دنیا کا ایک زبردست شاعر و پادری جرمی ٹیلر۔ سوت کاتنے کے آلے کا موجد اور صنعت کپاس کا بانی سر رچرڈ آرک رائیٹ۔ انگلستان کا ایک مشہور میر مجلس عدالت لارڈ ٹنٹرڈن اور زبردست مصور ٹرنر یہ سب اشخاص ایک نائی کی دکان سے اٹھے تھے کسی کو اس بات کا تعینی علم نہیں کہ شکسپیر کون تھا لیکن یہ امر ناقابل بحث ہے کہ وہ ایک ادنےٰ درجہ کا آدمی تھا اس کا باپ ایک قصاب اور چروا ہا تھا شکسپیر کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی حصہ یعنی بچپن میں اُون صاف کرنے کا کام کیا کرتا تھا لیکن بعض لوگوں کو اس خیال سے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک مدرسہ کا ملازم تھا اور بعد میں کسی ساہوکار کا منشی مقرر ہوا حقیقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکسپیر صرف ایک کام نہیں کرتا رہا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لیتا رہا۔ ایک مصنف جو سمندر اور اس کے متعلقات پر لکھا کرتا تھا شکسپیر کے بحری اصطلاحات کی خوبی و برجستگی کی بنا پر اس بات کا دعوےٰ کرتا ہے کہ شکسپیر ضرور ایک ملاح رہا ہوگا اسی طرح ایک پادری اس کی تصانیف کے داخلی ثبوت سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ غالباً وہ کسی پادری کا منشی تھا گھوڑوں کے گوشت کے ایک مشہور ماہر کا خیال ہے کہ وہ تاجر اسپ ہوگا۔ شکسپیر یقیناً ایک تماشکار تھا اور دوران زندگی میں اس نے "کئی کھیل کھیلے" اور وسیع تجربہ اور مشاہدہ سے اپنی عجیب و غریب قابلیت اور معلومات میں اضافہ کیا۔ بہر حال وہ ایک شوقین طالب علم اور بلا کا جفاکش اور محنتی لڑکا تھا۔ انگریزوں کے کردار کھنانے میں اس کی تصانیف آج تک نا بردست حصہ لیتی چلی آرہی ہیں۔

انجینئر برنڈلے ۔ ناخدا کُک اور شاعر برنس ادنےٰ مزدوروں ہی سے پیدا ہوئے ہیں ۔ معمار بن
جانسن پر فخر و مباہات کرسکتے ہیں جو لنکنسن اِن کی عمارت پر ہاتھ میں تھاپی اور جیب میں کتاب رکھے
ہوئے کام کیا کرتا تھا ۔ اڈورڈ اور ٹالفورڈ انجینئر ہیو ملر ماہر ارضیات اور الان کننگھم مصنف و سنگ
تراش بھی معمولی انسانوں میں سے تھے مشہور نجاروں میں ہم انیگو جونس معمار ۔ ہیاریسن CHRONOMETER
MAKER جان ہنٹر ماہر فعلیات، رومینے اور اوپی مصور، پروفیسر لی مستشرق اور جان گبسن بت تراش
کے نام پاتے ہیں ۔ سمن ریاضی داں ۔ بیکین سنگ تراش ۔ آڈم واکر ۔ جان فاسٹر ولسن ماہر علم طیور ۔ ڈاکٹر
لیونگ اسٹون مشنری سیاح اور ٹاناہل شاعر جلاہوں کے طبقے سے ہوئے ہیں ۔ سر کلوڈسلی شاول
زبردست امیر البحر، اسٹرجن ماہر علم برق ۔ سیامیول ڈرو مضمون نگار ۔ گفرڈ مدیر رسالہ "کوارٹرلی ریویو"
بلوم فیلڈ شاعر اور ولیم کیاری مشنری کفش دوزوں کی جماعت سے تھے اور جفاکش مشنری مارین بھی
جو توں کے سانچے بنایا کرتا تھا ۔ گذشتہ چند سال میں تھامس اڈورڈ نامی ایک مشہور ماہر علوم طبعیہ
کے متعلق یہ دریافت ہوا ہے کہ وہ ایک کفش دوز تھا اور کفش دوزی کا پیشہ اختیار کرکے ان سے اپنی
بسر اوقات کی ۔ اس نے اپنا فرصت کا وقت علوم طبعیہ کی تمام شاخوں کے مطالعہ کے لیے وقف کر رکھا
تھا اس کا نعم البدل اس کو یہ ملا کہ جس زمانہ میں وہ چھوٹے گھونگوں کی تحقیقات میں معروف رہتا تھا ۔
اس نے ایک نئی چیز دریافت کی جس کو ماہران علوم طبعیہ نے "پرانزا اڈورڈزی" کے نام سے موسوم کیا ہے
خیاطوں کے گروہ سے بھی بہت سے آدمی شہرت حاصل کیے ہیں ۔ جان اسٹو مورخ نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ
خیاطی میں گذارا ۔ جیاکسن مصور سن شعور کو پہنچنے تک ایک خیاط کا کام کیا کرتا تھا ۔ جانباز سر جان ہاکس وڈ
جس نے پائیٹرس کی لڑائی کے موقع پر بڑی شہرت حاصل کی اور جس کو جرأت و بہادری کے صلہ میں اڈورڈ
سوم نے نائٹ کا خطاب عطا کیا ۔ ابتدا میں ایک خیاط کے ہاں بطور کارآموز کام کیا کرتا تھا ۔ امیر البحر
ہابسن بھی جس نے سنہ ۱۷۰۲ء میں بہ مقام ویگو BOOM کو توڑا تھا خیاطی کیا کرتا تھا ۔ ایک مرتبہ بہ مقام
جزیرہ ویٹ بان چرچ کے قریب وہ ایک خیاط کے پاس کام کر رہا تھا یکا یک موضع میں یہ خبر پھیلی کہ
جنگی جہازوں کا ایک بیڑا ایک دور دراز کے سفر پر جانے والا ہے یہ سنتے ہی وہ دوکان سے نکلا اور جہازوں
کا شاندار منظر دیکھنے کی غرض سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ساحل پر پہنچا ۔ اچانک اس کے دل میں ملاح بننے
کا خیال پیدا ہوا وہ کشتی میں بیٹھ کر بیڑے کا رُخ کیا اور امیر البحر کے جہاز پر پہنچکر بطور رضا کار ملازم ہو گیا
کئی سال بعد نہایت اعزاز کے ساتھ وطن واپس ہوکر اسی مکان میں تناول طعام کیا جہاں کہ کسی زمانے
میں وہ بہ حیثیت کارآموز رہ چکا تھا ۔ لیکن سب سے بڑا خیاط بلاشبہ انیڈریو جانسن موجودہ صدر نشین

ممالک متحدہ ہے وہ ایک غیر معمولی کردار اور دماغی قابلیت کا آدمی ہے بمقام واشنگٹن جس وقت اس نے یہ بیان کیا کہ اس نے اپنی سیاسی زندگی حاکم شہر کی خدمت سے شروع کی اور وضع قوانین کے جملہ شعبوں پر حاوی ہوگیا حاضرین میں سے کسی نے چلا کر کہا کہ "تم نے درزی کے درجہ سے ترقی کی" اس وقت جانسن کا قابل تعریف طرز عمل یہ رہا کہ اس نے اس ہجو کا مطلق اثر نہ لیا بلکہ اس طرح جواب دیا کہ:-

ایک صاحب کہتے ہیں کہ میں ایک خیاط تھا یہ امر میرے لئے باعث تکلیف و پریشانی نہیں۔ کیونکہ جس وقت میں بہ حیثیت خیاط کام کرتا تھا تو مجھے ایک اچھا کام کرنے والے خیاط کی شہرت حاصل تھی میں ہمیشہ اپنے گاہکوں کا کام وقت کی پابندی کے ساتھ کیا کرتا تھا۔"

کارڈنل اولزے۔ ڈیفو۔ اکن سیڈ اور کرکو یٹ بھی قصابوں کے لڑکے تھے نیز ایک ٹین گر یعنے کیرا اور جوزف لنکاسٹر ایک BASKETMAKER تھا بخاری انجن کی ایجاد سے متعلق جو بڑے نام مشہور ہیں وہ نیوکومن، واٹ اور اسٹیفن کے ہیں ان میں سے اول الذکر ایک آہنگر دوسرا آلات ریاضی بنانے والا اور آخر الذکر ایک انجن کا خلاصی تھا۔ ہنٹنگڈن واعظ اصل میں کوئلہ ڈھویا کرتا تھا اور بیوک جو چوبی کندہ کاری کا موجد ہے ایک کوئلے کی کان میں کام کرتا تھا۔ ڈاڈسلے ایک چپراسی اور ہال کرافٹ ایک سائیس تھا۔ بافن ناخدا کی بحری زندگی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ پہلے پہل وہ محافظ متول مقرر کیا گیا اور سر کلودسلی شاول جہاز کے کمرہ کا دربان تھا۔ ہرسچل کسی فوجی بیانڈ کا تتے نواز تھا اور چانسٹری گنت لگا کر کندہ کاری کیا کرتا اور امٹی ایک گشتی طباع A JOURNEY MAN PRINTER تھا سر تھامس لارنس شراب خانہ کے ایک محافظ کا بیٹا تھا۔ میکائل فراڈے ایک آہن گر کا لڑکا ابتدا میں ۲۲ سال کی عمر تک ایک صحاف کے پاس بحیثیت کارآموز کام کرتا رہا اس وقت وہ سب سے زبردست فلسفی مانا جاتا ہے اور علم طبعیات کے پیچیدہ اور مشکل مسایل ونکات کی تشریح اور وضاحت میں اس کو اپنے استاد پر بھی فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔

ان اشخاص میں جنہوں نے علم ہیئت کو ترقی دی ہم پولینڈ کے ایک نان بائی کے لڑکے کوپرنیکس جرمنی کے مسافر خانہ کے محافظ کے لڑکے کیپلر۔ ڈی البرٹ جو لاوارثی کی حالت میں پیرس کے سنٹ جین لی راند نامی گرجا کی سیڑھیوں پر موسم سرما کی ایک شب پڑا پایا گیا اور جس کو ایک چرواہے کی عورت نے پرورش کیا اور نیوٹن اور لاپلیس کو پاتے ہیں۔ نیوٹن گران تھم کے ایک معمولی آدمی کا لڑکا اور لاپلیس بیومنٹ کے ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔

ان مشہور اشخاص نے اپنی زندگیوں میں مخالف اور غیر موزوں ماحول کے باوجود اپنی فہم و فراست سے ایسی غیر فانی اور دوامی شہرت حاصل کی جو دنیا کی ساری دولت کے بدلے میں بھی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی

حقیقت میں ان اشخاص کی ترقی میں ان کے ادنےٰ ماحول سے بھی زیادہ دولت ہی کے سدراہ اور مانع و مزاحم ہونے کا امکان تھا۔ ماہر علم ہیئت و ریاضی لیاگرینج کا باپ ٹیورن میں جنگی خزانچی کی خدمت پر مامور تھا لیکن SPECULATIONS سے تباہ ہونے کی وجہ اس کا خاندان انتہا درجہ کی مفلسی میں گرفتار ہوگیا۔ لیاگرینج نے بعد چل کر اسی واقعہ کو اپنی شہرت و کامیابی کا بڑا سبب قرار دیا ہے وہ کہا کرتا تھا کہ "اگر میں دولتمند ہوتا تو غالباً ایک ریاضی داں نہ بنتا"

تاریخ انگلستان میں ایسے پادریوں اور مذہبی رہبروں کی مثالیں بھی موجود ہیں جن کے لڑکوں نے خاص شہرت حاصل کی۔ ان میں ہم ڈریک اور نلسن جنھوں نے بحری جنگوں میں ناموری حاصل کی سائنس داں اولاسٹن۔ ینگ۔ پلے فیر اور بل حسن کاری میں رن۔ رینالڈس ولسن اور وِلکی، قانون داں تھرلو اور کیامپ بل اور ادبیات میں آلسین، تھامسن۔ گولڈ اسمتھ۔ کولرج اور ٹینی سن کے نام پاتے ہیں۔ لارڈ ہارڈنگ کرنل اڈورڈز اور میجر ہاڈسن بھی جنھیں ہندوستانی جنگوں میں بڑی ناموری حاصل ہوی پادریوں کے لڑکے تھے حقیقت میں ہندوستان میں برطانیہ کو جو حکومت حاصل ہوی اور برقرار رہی وہ خاصکر کلائیو۔ وارن ہیسٹنگ اور اس کے جانشینوں جیسے اوسط طبقہ کے اشخاص ہی کا طفیل تھا یہ وہ لوگ تھے جن کی پرورش کارخانوں میں ہوی اور زندگی کاروبار میں بسر ہوی۔

وکلا کے لڑکوں میں ہم اڈمنڈ برک۔ انجنیر اسمی ٹن۔ اسکاٹ، ورڈس ورتھ۔ لارڈ سومرس، ہارڈوک اور ڈن ننگ کو پاتے ہیں۔ سرولیم بلاک اسٹون ایک ریشم فروش کا بیٹا تھا جس کی ولادت اس کے باپ کی وفات کے بعد ہوی تھی۔ لارڈ گفرڈ کا باپ ڈوور کا ایک کرانہ فروش، لارڈ ڈنہم کا باپ ایک طبیب یا دوا فروش، منصف ٹالفرڈ کا باپ ایک دیہی شراب فروش اور لارڈ چیف بیرن پالک کا باپ چیرنگ کراس کا ایک مشہور زین ساز تھا۔ آثار نینوا کا محقق لیارڈ LAYARD. لندن میں کسی وکیل کے دفتر کا منشی تھا اور سرولیم آرم اسٹرانگ موجد HYDRAULIC MACHINERY. بھی کچھ عرصہ وکالت کرتا رہا ملٹن لندن کے کسی ساہوکار کا بیٹا تھا اور پوپ اور سودے اونی پارچہ فروشوں کے بیٹے تھے۔ پروفیسر ولسن پیزلی کے ایک دستکار کا بیٹا اور لارڈ مکالے ایک آفریقی تاجر کا بیٹا تھا کیٹس ایک دوافروش تھا اور سرہمفری ڈیوی ایک دوافروش کا شاگرد تھا۔ ڈیوی نے اپنے متعلق ایک مرتبہ کہا "میری موجودہ حیثیت خود میری ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے"

نیچرل ہسٹری کے ماہر رچرڈ اوون کی زندگی ایک ادنیٰ جہازی کے درجہ سے شروع ہوی تھی اس نے اپنے وہ سائنٹفک تحقیقات جن پر اس کی موجودہ شہرت کی اساس قایم ہے عمر رسیدہ ہونے کے بعد شروع

کی تھی جس وقت وہ اس شاندار عجائب خانہ کی فہرست کی ترتیب میں جس کو جان ہنٹر نے بڑی جد وجہد فراہم کیا تھا مصروف تھا اسی وقت اس نے اپنی زبردست قابلیت کی بنیاد قایم کی اس کام میں وہ تقریبًا دس سال تک بہ مقام سرجنس کالج مشغول رہا۔

تاریخ انگلستان کی طرح دیگر ممالک کی تاریخ میں بھی ایسے لوگوں کی صدہا مثالیں ملیں گی جنھوں نے اپنی ذاتی محنت اور فہم و فراست سے مفلسی پر غلبہ حاصل کیا تھا جن کاروں میں ہم کلاڈ ایک باورچی کے بیٹے اور جیفیس ایک نان بائی کے بیٹے کو پاتے ہیں۔ لیوپولڈ رابرٹ ایک گھڑی ساز کا اور ہیڈن ایک پہیے بنانے والے کا بیٹا تھا۔ ڈاگیری کسی تماشہ گاہ کا ایک مصور مناظر تھا گری گوری ہفتم کا باپ ایک نجار سکسٹس پنجم کا باپ ایک چرواہا اور اڈرین ششم کا باپ ایک غریب ملاح تھا بچپن میں جب اڈرین کو پڑھنے کے لیے چراغ میسر نہ تھا سڑکوں اور گرجاؤں کے چراغوں کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے اسباق یاد کیا کرتا تھا اس سے اس کی اس محنت تحمل اور شوق کا پتہ چلتا ہے جو اس کی آیندہ شہرت و ترقی کا پیش خیمہ ہے اسی طرح مندرجہ ذیل اشخاص بھی ادنےٰ درجہ کے آدمی تھے۔

”ہا“ ماہر معدنیات ہے (۱۷۸۷) سنٹ جسٹ کے ایک جلاہے کا بیٹا تھا کل سازمائی مورل آرمینس کے ایک نان بائی کا بیٹا تھا۔ ریاضی داں جوزف فوریر آکسیر کے ایک خیاط کا بیٹا تھا۔ معمار ڈیوریٹ پیرس کے ایک کفش دوز کا بیٹا تھا اور ماہر علوم طبعیہ جسنر زیورخ کے ایک دباغ کا بیٹا تھا جس نے اپنی زندگی مفلسی علالت اور خانگی افکارات و مصائب سے شروع کی تھی لیکن ان میں سے کوئی چیز اس کی ہمت کو متزلزل اور اسکی ترقی کو روک نہ سکی۔ اس کی زندگی حقیقت میں اُس مقولہ کی صداقت کی ایک عمدہ مثال ہے کہ ”جن لوگوں کو بہت کچھ کرنا ہے اور جو محنت کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے وقت بہت ہے“۔ پیری رامس بھی اسی قسم کا آدمی تھا وہ مفلس والدین کا بیٹا تھا۔ بچپن میں اس کو بھیڑوں کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا لیکن اس کام سے ناراض ہوکر وہ پیرس چلا گیا۔ بڑی دشواری کے بعد ناویر کالج میں بحیثیت ملازم داخل ہو گیا اس ملازمت سے اس کے لیے تحصیل علم کی راہ کھل گئی اور بہت قلیل عرصہ میں وہ اپنے زمانہ کا ایک نہایت مشہور شخص ثابت ہوا۔

وایاکولن دوافروش ایک کسان کا بیٹا تھا بچپن میں جس وقت وہ مدرسہ میں پڑھتا تھا گو اس کے جسم پر معمولی کپڑے رہتے تھے لیکن اس کے چہرے پر فہم و فراست اور اعلیٰ قابلیت کے آثار نمایاں تھے اس کا استاد جس نے اسے نوشت و خواند سکھایا اس کی جفاکشی اور علمی شوق کی توصیف کرتے وقت کہا کرتا تھا ”میرے پیارے لڑکے محنت کیے جاؤ۔ کالن محنت سے پڑھو ایک روز تم بھی ایسا ہی لباس زیب تن کرنے کے قابل ہوجاؤ گے۔ جیسا کہ دار وغۂ گرجا پہنا کرتا ہے“ ایک دیہی دوافروش نے جس کو مدرسہ میں جانے کا اتفاق

ہوا کالن کو دیکھ کر اس کے توانا قوی کی تعریف کی اور اپنے معمل LABORATORY میں ادویات کوٹنے پر
ملازم رکھنے کی خواہش ظاہر کی جس پر ویانکولن اس امید سے کہ اس کو وہاں تعلیم جاری رکھنے کا موقعہ ہاتھ
آئے گا راضی ہو گیا دوا فروش اس کو کچھ وقت تعلیم میں صرف کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اس لیئے وہ فوراً
ملازمت ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس طرح سینٹ اینڈریے کو خیرباد کہہ کر اپنا اسباب اپنی پیٹھ پر لیئے
ہوئے اس نے پیرس کی راہ لی۔ پیرس پہنچکر اس نے کسی دوا فروش کے ہاں نوکری کی تلاش کی لیکن ناکام رہا۔
ماندگی اور تہی دستی سے مجبور ہو کر بیمار پڑ گیا جس کی وجہ اس کو شفاخانہ پہنچادیا گیا۔ یہاں ویانکولن کو موت کا
یقین ہو گیا لیکن اس محتاج لڑکے کا مستقبل شاندار تھا اس لئے اس کو صحت حاصل ہوی اس نے اور ایک بار
نوکری کی تلاش کی اور آخر کار ایک دوا فروش کے ہاں ملازم ہو گیا۔ چند روز بعد مشہور دواساز فورکرائے
اس لڑکے کا حال سنا اس کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوا اور اپنا معتمد خانگی بنا لیا۔ کئی سال بعد فورکرائے
کے انتقال پر ویانکولن بحیثیت پروفیسر کیمیا اس کا جانشین بن گیا آخر ۱۸۲۹ء میں ضلع کالوڈس کے ELECTORS
نے چیمبر آف ڈپوٹیس (مجلس نائبین) میں اس کو اپنا نمائندہ مقرر کیا اور وہ دوبارہ نہایت اعزاز کے
ساتھ اپنے اسی موضع میں داخل ہوا جس کو اس نے کئی سال پیشتر مفلسی اور گمنامی کی حالت میں خیرباد کہا تھا

ایسے اشخاص کی مثالیں جنھوں نے معمولی درجوں سے ترقی کر کے اعلیٰ فوجی مراتب و خدمات حاصل کیئے
فرانس میں انقلاب اولے کے زمانہ کے بعد سے بکثرت ملتی ہیں انگلستان میں ایسی نظیریں نہیں ملتیں۔ ہاکے ہمبرٹ
اور پچی گرو نے اپنی زندگیاں خانگی سپاہیوں کے درجہ سے شروع کیں۔ ہاکے جس وقت شاہی فوج میں ملازم تھا
ولسیٹ کو ٹون کی آرائنگی کیا کرتا تھا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس ذریعہ سے روپیہ پیدا کر کے وہ فوجی علوم کی
کتابیں خریدنے کے قابل ہو جائے۔ ہمبرٹ بچپن میں بڑا نکما اور بے حیا لڑکا تھا سولہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گیا
اور باری باری سے نانسی کے ایک تاجر الیاس کے ایک کاریگر اور خرگوش کے چمڑوں کی تجارت کرنے والے کا ملازم
رہا۔ ۱۷۹۲ء میں بطور رضاکار فوج میں داخل ہوا اور ایک ہی سال میں فوج کا افسر بن گیا۔ کلی برلا فیر۔ جوبیٹ۔
وکٹر۔ لانس۔ سولٹ۔ ماسینا۔ سنٹ کیر۔ ڈی ارلن۔ میورٹ۔ آگرو۔ بیسیرے اور نے کو معمولی درجوں سے ترقی
حاصل ہوی جو بعض صورتوں میں تیز اور بعض میں دھیمی رہی۔ سنٹ کیر ٹول کے ایک دباغ کا بیٹا تھا اس نے
اپنی زندگی ایک تماشکار کی حیثیت سے شروع کی اس کے بعد چاسیو کی فوج میں داخل ہوا اور ایک سال کے اندر
ترقی کر کے کپتان کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ وکٹر ڈک ڈی بلونو ۱۷۸۱ء میں توپ خانہ میں بھرتی ہوا۔ انقلاب
فرانس کے پیشتر فوج سے برطرف کر دیا گیا تھا لیکن آغاز جنگ کے ساتھ ہی دوبارہ شامل ہوا اور چند ماہ کے عرصہ
میں اپنی قابلیت اور بہادری کی وجہ اجیٹنٹ میجر اور افسر فوج کے عہدہ تک ترقی کر گیا۔ میورٹ پیری گورڈ کے

ایک قصبہ کے مسافر خانہ کے محافظ کا بیٹا تھا اور گھوڑوں کی حفاظت کیا کرتا تھا پہلے پچاسویں رجمنٹ میں بھرتی ہوا اور بد دل حکمی کی علت میں برطرف ہوا لیکن دوبارہ بھرتی ہو کر تھوڑے عرصہ میں کرنل کے عہدہ تک پہنچ گیا نے اٹھارہ سال کی عمر میں حصار کی ایک رجمنٹ میں بھرتی ہوا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ کیا لیرا کی قابلیت دیکھ کر اس کو "محنتی یا جفا کش" کا خطاب دیا اور پچیس سال کی عمر میں اجیٹن جنرل کے عہدے پر ترقی دی اس کے برخلاف سولٹ کو فوج میں بھرتی ہو کر عہدہ سرجنٹ تک پہنچنے چھ سال گذارنا پڑا لیکن سولٹ کی ترقی ماسینا کی ترقی کی نسبت تیز تھی ماسینا کو سرجنٹ کے عہدہ تک پہنچنے سے قبل ۱۴ سال تک سپاہی کا کام کرنا پڑا اور گو بعد میں یکے بعد دیگرے کرنل، جنرل اور مارشل کے درجہ تک پہنچا اس نے کہا کہ سرجنٹ کی خدمت انجام دیتے وقت دیگر خدمات کے مقابلہ میں اس کو زیادہ محنت کرنی پڑی۔ فرانسیسی فوج کے کئی معمولی آدمی آج تک اسی قسم کی ترقیاں کرتے چلے آئے ہیں۔ چنگاریز ۱۸۱۵ء میں شاہی باڈی گارڈ میں بہ حیثیت خانگی ملازم کے شریک ہوا۔ مارشل ہیوگارڈ کو چار سال معمولی خدمت انجام دینے کے بعد افسری کا عہدہ ملا۔ فرانس کے موجودہ وزیر جنگ مارشل رانڈن کی زندگی ایک بیانڈ نواز کے درجہ سے شروع ہوئی تھی۔ ورسے کی گیالری میں اس کی تصویر موجود ہے جس میں اس کا ہات باجے پر رکھا ہوا ہے یہ تصویر خود اس کی خواہش پر تیار کی گئی تھی اس قسم کی مثالیں فرانسیسی سپاہیوں کو ان کے فرایض کی انجام دہی کیلئے جوش دلاتی ہیں کیونکہ ہر سپاہی محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی اپنی ذاتی محنت سے ایک سپہ سالار بن سکتا ہے

ایسے اشخاص کی مثالیں جو مستقل کوشش کے ذریعہ ادنٰے درجوں سے ترقی کر کے اعلٰی مناصب حاصل کیے اور سوسائٹی کے لیے مفید ثابت ہوے انگلستان اور دیگر ممالک میں اس قدر ملتی ہیں کہ ایک عرصہ سے انھیں مستثنٰے تصور نہیں کیا جا رہا ہے بعض قابل غور مثالوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مخالف واقعات اور مشکلات کا ابتدا میں مردانہ وار مقابلہ ہی ترقی کی مقدم شرط ہے۔ برطانوی دار العوام میں ہمیشہ ایسے خود ترقی یافتہ SELFRAISED اشخاص کی بڑی تعداد برسر کار رہی ہے ان اشخاص نے صنعتی نمایندوں کی حیثیت سے عمدہ خدمات انجام دئیے اور مجلس وضع قوانین کا طفیل ہے کہ وہاں انکی وقعت ہوئی اور ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ سالفورڈ کے نمایندے یارکن جوزف برادرٹن آنجہانی نے TEN HOURS BILL پر بحث کرتے وقت جب اُن مصائب و آلام کا جوش کے ساتھ تفصیلی ذکر کیا جن میں وہ ایک کپاس کی گرنی میں قلی کی حیثیت سے کام کرتے وقت مبتلا رہ چکا تھا نیز جب یہ کہا کہ اس نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی اس کو اقتدار حاصل ہو تو وہ مزدوروں کی اصلاح اور فلاح میں کوشش کریگا سر جیمس گراہم نے فورًا کھڑے ہو کر کہا کہ مجھے اب تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ مسٹر برادرٹن نے ایک ادنٰے درجہ سے ترقی کی ہے

نیز یہ کہ اس واقعہ سے دارالعوام میں جس کو پہلے سے زیادہ ناز ہو گیا تھا کہ ایک ادنیٰ درجہ سے ترقی کیا ہوا شخص ملک کے موروثی شرفا اور امرا کے دوش بدوش مساوی حیثیت سے بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔

اولڈہام کا نمائندہ مسٹر فاکس اپنے گذشتہ واقعات کا تذکرہ اس طرح کیا کرتا تھا کہ "جب میں ناروچ میں جلاہے کا ملازم تھا" پارلیمنٹ کے دیگر ارکان بھی جنکی اصلیت نہایت ادنیٰ تھی اس وقت موجود ہیں جہازوں کے مالک مسٹر لنڈسے نے جو حال تک سنڈرلینڈ کے نمائندے رہ چکے ہیں ایک مرتبہ اپنے سیاسی مخالفین کے ایک جلسے کے جواب میں ووٹ کے انتخاب کنندوں سے اپنی زندگی کے واقعات بیان کئے۔ چودہ سال کی عمر میں لنڈسے کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا اور جب وہ تلاش روزگار میں گلاسگو سے لیورپول روانہ ہوا تو جہاز کا مقررہ کرایہ ادا کرنے سے قاصر رہنے کی وجہ جہاز کے کپتان نے کرایہ کے معاوضہ میں جہاز پر کام لینے رضامندی ظاہر کی اور لنڈسے کو کوئلے کی کان میں کام کرنا پڑا۔ لیورپول میں ملازمت ملنے سے قبل اس کو سات ہفتے بیکار گزارنا پڑا اس عرصہ میں وہ جھونپڑوں میں رہتا اور بمشکل گذر بسر کیا کرتا تھا آخر کار ایک مغربی جہاز میں اس کو پناہ مل گئی اور وہ جہاز میں قلی بن گیا اور ۱۹ سال کی عمر سے قبل اپنے نیک اطوار کی بدولت ایک جہاز کا افسر بن گیا ۲۳ سال کی عمر میں اس نے اپنی بحری زندگی ختم کر کے ساحل پر زندگی بسر کرنی شروع کی اس کے بعد اس نے بہت جلد ترقی کر لی وہ کہا کرتا تھا کہ "اس نے سخت محنت مستقل عمل اور ہمیشہ اس زبردست اصول کو مدنظر رکھنے سے کہ ہم دوسروں سے جس قسم کی توقع رکھیں اسی قسم کا برتاؤ ہمیں ان کے ساتھ کرنا چاہئے" ترقی کی۔

ولیم جیاکسن کے واقعات بھی جو اس وقت شمالی ڈربی شیر کے نمائندے ہیں مسٹر لنڈسے کی زندگی سے بالکل مشابہ ہیں۔ جیاکسن کا باپ لنکاسٹر کا ایک طبیب تھا جب وہ فوت ہوا تو اس نے گیارہ بچے چھوڑے ولیم جیاکسن اس کا ساتواں بیٹا تھا۔ بڑے لڑکوں کی تعلیم باپ کی زندگی میں ہو چکی تھی لیکن کمسن بچوں کو باپ کی وفات کے بعد اپنا کفیل آپ بننا پڑا۔ ولیم کو بارہ سال کی عمر میں مدرسہ کو خیرباد کہنا پڑا کیونکہ وہ ایک جہاز پر ملازم کروا دیا گیا تھا جہاں اس کو صبح کے چھ بجے سے شام کے ۹ بجے تک سخت محنت کرنی پڑتی تھی جہاز کا مالک علیل ہونے سے ولیم counting house میں لایا گیا جہاں اس کو کافی فرصت ملتی تھی اور علم حاصل کرنے کا اچھا موقع مل گیا انگریزی لغت کا ایک حصہ اس کے ہاتھ لگا اور اس نے دن رات محنت کر کے اس کے جملہ جلد پڑھ ڈالے بعد میں اس نے تجارت شروع کی اور اس کی جفاکشی و ہوشیاری کی بدولت اس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ آج تقریباً ہر سمندر پر اس کے جہاز برسرکار ہیں اور تقریباً دنیا کے ہر ملک سے اس کے تجارتی تعلقات وابستہ ہیں۔

اسی قسم کے لوگوں میں رچرڈ کابڈن کا شمار بھی کیا جا سکتا ہے جس نے اپنی ابتدائی زندگی نہایت ادنٰے درجہ سے شروع کی تھی وہ سکس کے ایک معمولی کسان کا بیٹا تھا کم عمری میں لندن بھجوا دیا گیا اور شہر کے ایک گودام میں قلی مقرر ہو گیا وہ ایک ہوشیار، محنتی اور علم کا شایق آدمی تھا اس کا معلم جو ایک قدیم مدرسہ کا مالک تھا اس کو زیادہ پڑھنے سے منع کیا کرتا تھا لیکن کابڈن نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنے دماغ کو حتی الامکان علمی معلومات سے پُر کر کے دن بدن اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب حاصل کرتا گیا اس کے بعد اس نے سیر و سیاحت شروع کی اور کافی تجربہ حاصل کر کے آخر کار مانچسٹر میں چھینٹ کی رنگائی کا کاروبار شروع کیا۔ رفاہ عام کے کاموں خصوصًا عوام الناس کی تعلیم سے اس کو خاص دلچسپی تھی اور اسکی توجہ رفتہ رفتہ مسئلہ ([illegible]) کی جانب مائل جس کی تنسیخ کے لئے اس نے اپنی جان اور مال کو وقف کر دیا تھا یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس کی پہلی پبلک تقریر بالکل ناکام رہی لیکن وہ مستقل مزاج اور محنتی تھا مسلسل مشق کے بعد آخر کار ایک قابل مقرر بن گیا اور مسٹر برائٹ پیل جیسی ممتاز ہستی سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔ فرانسیسی سفیر ایم۔ ڈروَن ڈی لھویز نے مسٹر کابڈن کے متعلق خوب کہا ہے کہ "مسٹر کابڈن قابلیت استقلال اور محنت کی ایک زندہ مثال یا ایسے اشخاص کی ایک عمدہ نظیر ہے جو سوسائٹی کے ادنٰے درجوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی ذاتی کوشش اور قابلیت کے ذریعہ اعلیٰ مناصب حاصل کرتے اور پبلک میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ نیز مسٹر کابڈن اُن غیر فانی صفات کی ایک نادر مثال ہے جو انگریزوں کے اخلاق میں جبلی طور پر پائے جاتے ہیں۔"

ان تمام مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شہرت خواہ کسی قسم کی اور کسی شعبۂ زندگی میں ہو محض انفرادی محنت اور جفاکشی کا نتیجہ ہے ہر قسم کا کمال آرام طلبی اور کاہلی کی دسترس سے باہر ہے۔ ذاتی جد و جہد اور دماغی محنت ہی سے انسان کی مفید تربیت ہوتی ہے اس کی عقل اور تجربہ بڑھتا ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ (باقی)

۱۹

پندِ بے سود

نظم

جلسۂ انجمن امداد باہمی محدود محکمۂ نظم جمعیت صرفِ خاص مبارک

منعقدہ

۲۵ ربیع المنور ۱۳۴۸ھ م ۲۵ مہر ۱۳۳۸ف روز شنبہ

تقریب

حضرت صفیؔ اورنگ آبادی (حیدرآبادی) کسی رسمی تعریف و توصیف کے محتاج نہیں یہ اپنے تغزل کی بدولت کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اس کے ثبوت میں آپ کا وہ رنگین اور پُر اثر کلام ہی جو آج عوام سے لیکر خواص تک کی زبان پر ہے۔ بزم سرود ہو یا محفل سماع، کوئی اس سے خالی نہیں، لیکن اب آپ کی شاعری قومیات و اخلاقیات میں جاذب ہو رہی ہی!

ملک و قوم کو آپ کے اُستاد حضرت کیفی حیدرآبادی رح کی گرما گرم مجالس قومی میں ایک خاص اسپرٹ پیدا کرنے والی شاعری کے فقدان کا جو افسوس تھا، شاید وہ اس نظم کے پڑھنے کے بعد باقی نہیں رہے گا، اور بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوا کیے:

ع :- "شکر صد شکر کہ شاگرد بہ اُستاد رسید" فیضانِ سخن کسی خاص شخص کا حصہ نہیں، ہر دماغ اس سے استفادہ کر سکتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ ہر منظوم میں شعریت نہیں ہوتی! یہ "منصب جلیل" کچھ اور ہی رتبہ رکھتا ہی ما و شما کے نصیب میں نہیں!

نظم پڑھیے اور اعجازِ سخن کے مزے لیجیے! مضمون کی روانی، زبان و بیان، اثر و تاثیر، بال باندھے غلام ہیں! موضوع خشک؟ قوافی معدود؟ مثنوی کی بحر؟ اور بحر اپنی خصوصیات پر حاوی؟ یہ شاعری نہیں! معجز بیانیاں ہیں!! اور پھر اس پر یہ عجز نفس؟ "یہ ہی تلوار لیکن زنگ خوردہ یہ ہی آئینہ، لیکن گرد آلود" نہ عبرت اس عبارت سے ہی ظاہر نہ لذت، اس حکایت میں ہی موجود

ہمارے ہم انجمنوں کے لئے پیوستہ سالانہ رپورٹ کا ع :- "یہ گویا اک طرح کا ہی خلاصہ"

اور پھر منظوم ہی پُر اثر ہی۔ اس لیے یقین ہی کہ اس کو پڑھیں گے اور بار بار پڑھیں گے!

ملک کے ادبی مذاق اور زندگی رکھنے والوں سے توقع ہی کہ اس کو دیکھیں گے اور خوش ہو ہو کے دیکھیں گے کہ ہمیں بھی ایک ایسا شاعر مل گیا ہی! ایک خشک موضوع پر ایسی نظم؟ ع :- میں کیا کہوں خدا کی قسم شاعری ہی یہ! معتمد انجمن

اگر ہو پند میں تاثیر مفقود ۔۔۔ تو ایسی پند ہوگی پند بے سود
مگر ہی شاعری کا رنگ کچھ اور ۔۔۔ بڑی سچ بھی کبھی ہوتی ہے بے سود
صداقت میں اثر ہوتا ہی لیکن ۔۔۔ صداقت اس زمانہ میں ہی محدود
اثر کو فاتحہ پڑھتے ہیں شاعر ۔۔۔ صداقت سے تو مطلب بھی نہیں خود
صداقت وہ نہیں جو کہ عذب ہو ۔۔۔ صداقت وہ ہی جس سے خوش ہو معبود
صداقت میں ہو تھوڑی شاعری بھی ۔۔۔ تو پھر حاصل ہی کچھ ہوتا ہی مقصود
زباں پر آدمی کی ہو وہی بات ۔۔۔ رہے جو بات اس کے دل میں موجود
گر موضوع بھی ہو کچھ مزے دار ۔۔۔ اگر ایسا ہو تو لطف نابود

۳ یہی مشکل مجھے بھی آپڑی ہے / اگر ہے جھوٹ تو جھوٹا ہے مردود
خدا لگتی کہے کوئی خدا دوست / بھلا شاعر کرے کیا اس میں افزود
یہ قصہ ہے وہی پارینہ قصہ / جو بہر نظم جمعیت ہے محدود
وہی ہے باہمی امداد منظور / وہی ہمدردوں کی سعیٔ بہبود
یہ ہے اس انجمن کا تیسرا سال / ابھی تک تو ہوا ہر کام مسعود
رپورٹ اس سال جو اس کی چھپی ہے / وہ ہے گو سات ہی ورقوں میں محدود
مگر ان سات ورقوں ہی میں دیکھو / ہر اک شے ہے مع اعداد معدود
قیام انجمن کا ذکر ہے ہر / نظام انجمن کا حال موجود
کیے ہیں متن تختے اس میں شامل / کہ جن میں درج ہے سب جنس مقصود
حقیقی نفع و نقصان آمد و خرچ / نہیں اپنی طرف سے کچھ بھی افزود
ہر اک صیغے کا بہر ماضی و حال / توازن ہے بطرز نیک و مسعود
لکھے ہیں اس میں اسمائے اراکین / جو ہیں اس کام میں ہر طرح خوشنود
مراتب سب میں خدمت کے برابر / بکر مفلوک ہو یا زید محمود

۴ مری اک نظم بھی اس میں چھپی ہے / بنا رکھا ہے جس نے مجھ کو محسود
مگر خوش ہوں کہ میں حاسد نہیں ہوں / ادا ہو کس زباں سے شکر معبود
قلم کاغذ کی ہے میری لڑائی / نہیں درکار گولی اور بارود
کروں کیوں گفتگو ترکی بہ ترکی / دعا ہے دے سمجھ ایسوں کو معبود
وہ مالک ہے بنا دے ہست کو نیست / وہ خالق ہے کرے نابود کو بود
تو ہاں فقر بھی ہیں اس انجمن کا / نہیں ہے کام کچھ اس کا بھی بے سود
وظیفہ پاتے ہیں اک صاحب اس سے / کہ وہ کرتے ہیں کام آمد ہی محدود

۵ دعا پر ختم ہے یہ سال نامہ / دعا اس کی جو ہے مقبول معبود
نظام الملک آصف جاہ سابع / جسے مد نظر ہے سب کی بہبود
دعا میں بھی کروں ہے فرض میرا / ہر اک سامع سے ہے آمین مقصود
الٰہی از طفیل ماہ میلاد / خداوندا بحق شاہ مولود
کرا اس کے دشمنوں کو خوار و برباد / دکھا شان عنائے حضرت ہود

۶ یہ گویا اک طرح کا ہے خلاصہ / اگرچہ ہیں مرے اشعار معدود
رپورٹ اس کو کہو یا سال نامہ / کہ ہے امرود جام اور جام امرود
اب اس کے آگے آخر کیا لکھوں میں / سخن کوتاہ راہ فکر مسدود

۷ اگر کچھ ہے تو گنجائش ہے اتنی / بس اپنی رائے کر سکتا ہوں افزود
تو اس حصہ کی ذاتی رائے یہ ہے / کہ یہ ہے ایک کار نیک و مسعود
اسے ہے باہمی امداد درکار / نہیں ہے انجمن کچھ طالب جود

نہ شخصی فائدہ ہے اس کا مقصد / نہ ذاتی سود مندی اس کا مقصود
نہ ہو سکتا ہے اس میں کچھ کم و بیش / نہ کر سکتے ہیں اس میں کچھ غتربود
کتاب اس کی نہیں ہے شاخ در شاخ / حساب اس کا نہیں ہے سود در سود
یہ خود ہی آپ اپنی شاہد کار / یہ خود ہی آپ ناقد آپ منقود
پڑھو پڑھ کر ذرا سمجھو بھی اس کو / لکھا ہے اس میں سب مذموم و محمود
یہاں تک تو ہوا حال انجمن کا / مگر ہے شاعری کا لطف مفقود

۸ یہ ہے تلوار لیکن زنگ خوردہ / یہ ہے آئینہ لیکن گرد آلود
نہ عبرت اس عبارت سے ہے ظاہر / نہ لذت اس حکایت میں ہے موجود
نہ یہ حال کلیم اللہ و فرعون / نہ یہ ذکر خلیل اللہ و نمرود
نہ تعریف ضیائے دست موسیٰ / نہ توصیف ادائے لحن داؤد

۹ پھر اس پر ایک یہ بھی ہے مصیبت / جو کر دیتی ہے ہر جذبے کو نابود
ادھر ہے عیب تکرار قوافی / ادھر ہیں قافیے معدود و محدود
نہیں معدود و محدود اس کو مانا / مگر سب کب ہیں میرے حسب مقصود

۱۰ سبب اک اور اس سے بھی برا ہے / کہ جس سے بے مزہ ہے میری شد بود
کہاں میں اور کہاں جلسے کہاں نظم / کہاں میں؟ اور کہاں تقریظ؟ کہاں سود؟
میں اک شاعر ہوں اور وہ بھی غزل گو / مرا رنگ سخن مخصوص محدود
جو میرے رنگ کے اشعار ہوتے / تو ہوتے ان میں لاکھوں حسن موجود
نہ یہ ہے داستان قیس و لیلیٰ / نہ یہ وصف ایاز و مدح محمود
لب و دنداں نہیں ہیں لعل و گوہر / دل سوزاں نہیں ہے مجمر عود
یہاں پروانہ بے پر نہیں عشق / تو ہوگا حسن پھر کیوں شمع بے دود
اشارے میں کہوں کیا حرف مقصد / کنائے میں کروں کیا شرح مقصود
خیال جدت تمہید بے کار / کمال ندرت تشبیہ بے سود

۱۱ نہ میری نظم میں گل ہے نہ بلبل / نہ اس میں کوئی شاہد ہے نہ مشہود
مگر پوچھو کسی شاعر کے دل سے / کہ ہو موضوع جس دم خشک و محدود
رہے پیش نظر پھر صاف گوئی / ہیں پھر قافیے بھی اس کو معدود
تو پیش آتی ہے کیسی کیسی مشکل / ارادے کیسے ہو جاتے ہیں نابود
بہت خون جگر کھاتا ہے شاعر / نہیں کچھ شاعری حلوائے بے دود

۱۲ یہ اک بربر ہے مگر اے سننے والو / اگر اس انجمن سے کچھ ہے مقصود
تو اتنا اور اک احسان ہو اس پر / خدا رکھے تمھیں خوش حال و خوشنود
یہ ستر شعر ہیں پڑھنے کے قابل / ہے ان میں تمھاری سامعین کی بہبود
نہ دیکھو کچھ آصفی کی نظم دیکھو / ہوا کرتا ہے پیارا اصل سے سود!

"بھکاری"

از

(جناب محمد محی الدین صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ)

اس پر بھی ایک زمانہ عیش و آرام کا گذر چکا تھا۔ اب اگر وہ غریب اور بیمار ہوا تو کیا؟

پندرہ برس کی عمر میں اس کے دونوں پاؤں راستہ چلتے ہوئے ایک وزنی گاڑی کے پہیئے کے نیچے کچل گئے۔ اسپتال میں اُن کو کاٹ ڈالا گیا۔ تب سے وہ بغلی لکڑیوں کے سہارے گاؤں کے چکر لگاتا اور بھیک مانگتا۔ اس کے اونچے شانوں کے درمیان اُس کا جھکا ہوا سر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ دو پہاڑوں کے درمیان رکھدیا گیا ہے۔

گاؤں کے پادری نے ایک دن گرجا سے آتے ہوئے دیکھا کہ ایک نوزائیدہ بچہ خندق میں پڑا ہوا ہے۔ پادری نے رحم کھا کر اُٹھا لیا۔ اور وہ گرجہ کے خیراتی فنڈ سے پالا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر قسم کی تعلیم سے اجنبی رہا۔ سردی کے موسم میں ایک دن گاؤں کے روٹی بنانے والے نے اُس کے کانپتے ہوئے جسم پر ترس کھا کر اسے تھوڑی سی شراب پلا دی تھی۔ جس کا نتیجہ اس کی کٹی ہوئی ٹانگیں تھیں جو گاؤں کے ہر بچے بوڑھے کا نشانہ مذاق بنی ہوئی تھیں۔

گاؤں کے پادری نے اس کی نگہداشت چھوڑ دی کیونکہ وہ کام کاج کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اب گداگری کے سوا پیٹ پالنے کی کوئی اور صورت نہ تھی۔ شروع میں گاؤں کی ایک دولتمند بیوہ نے اُس کو اصطبل میں سونے کے لئے تھوڑی سی جگہ دے رکھی تھی۔ اور جس دن اُسے بھیک نہ ملتی یا برف باری کی شدت کی وجہ سے وہ باہر نہ جا تا تو اُسے یہ یقین ضرور رہتا کہ وہ گھانس کے ایک کونے پر روٹی کے چند ٹکڑے ضرور رکھا ہوا پائیگا۔ کبھی کبھی اُسے چند پیسے بھی مل جاتے۔

مگر اب اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ گاؤں میں اسے بہت کم خیرات ملتی تھی۔ لوگ چالیس سال سے دن رات اسے گاؤں کی گلیوں میں کسی نہ کسی دروازہ پر اپنی لکڑیوں پر کھڑا چلاتا ہوا دیکھا کرتا دیکھتے چکے تھے۔ تاہم وہ گاؤں نہ چھوڑ سکتا تھا۔ یہی دو تین مکان اور چند جھونپڑیاں اس کی آماجگاہ تھیں جہاں وہ اپنی درد و غم سے بھری ہوئی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ اس نے بھیک مانگنے کے علاقوں کی تقسیم کر رکھی تھی۔ اور مقررہ دنوں میں وہ اس علاقہ کے سوا جہاں اس نے اس روز بھیک مانگنا مقرر کر رکھا تھا دوسری جگہ ہرگز نہ جاتا تھا۔ وہ گاؤں کے باہر دور کے درختوں کی اس پار کی دنیا سے قطعاً ناواقف تھا۔ اور اسے یہ جاننے کی نہ تشویش

تھی نہ ضرورت۔ کیونکہ وہ جگہ اُس کے علاقہ میں شامل نہ تھی۔ اور جب کسان جو اس کے دست سوال سے تنگ آ چکے تھے۔ اسے بھیک مانگتا ہوا دیکھ کر کہتے "ہٹ۔ دور ہو جا۔ تو کسی دوسرے گاؤں کو کیوں نہیں چلا جاتا" تو وہ خاموشی سے سر جھکا کر اُن کے سامنے سے چلا جاتا۔ کسی دوسرے گاؤں کو جانے کے خیال سے ایک خوف اس کے دل پر چھا جاتا۔ نئے چہرے خراب برتاؤ۔ لوگوں کی مشتبہ نظریں اور سب سے زیادہ پولیس جس کو وہ دور سے آتا دیکھ کر وہ کانٹوں کی جھاڑیوں یا تیز نوکیلے پتھروں کے پیچھے چھپ جاتا۔ ان سب باتوں کا خیال اسے خوفزدہ کر دیتا تھا۔

پولیس جس کے بوٹ کی کھٹ پٹ دور سے سنکر اس کے جسم میں ایک خوفناک پھرتی آجاتی اور بغل سے لکڑیوں کو گرا کر خود زمین پر بے تحاشہ منہ کے بل گر جاتا۔ گولہ کی طرح سکڑا ہوا۔ خاموش خرگوش کی طرح دبکا ہوا۔ اس کے جسم کے خاک آلود چیتھڑے زمین کی رنگت سے مل جاتے اور دیکھنے والوں کو وہ مٹی کا تودہ نظر آتا۔ حالانکہ اس کو اُن سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے خون میں یہ خوف وراثتاً شامل ہوتا آیا ہے۔

اس کا کوئی گھر نہ تھا۔ نہ کوئی جھونپڑی اور نہ سونے کی جگہ۔ گرمیوں کے موسم میں وہ کہیں بھی کھلی ہوا میں پڑ جاتا البتہ سردیوں میں اسے باڑہ کود کر کسی کے اصطبل میں گھس جانا پڑتا تھا۔

لنگڑا ہونے کے باوجود عادت کی وجہ سے وہ اس کام میں ماہر تھا۔ پو پھٹنے کے قبل وہ اُٹھ چلا جاتا تاکہ کسی کی نظر اُس پر نہ پڑے۔ اسے گاؤں کے ہر اصطبل کی باڑہ کے چند ایسے سوراخ اور ٹوٹے ہوئے مقام معلوم تھے جن کے ذریعہ سے وہ ان کے اندر بآسانی پہونچ جاتا تھا۔ ایک عضو نے معطل ہو کر دوسرے میں زیادہ طاقت پیدا کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ ایسے مضبوط اور طاقت دار تھے کہ وہ درختوں کی لٹکتی ہوئی ٹہنیوں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اوپر چڑھ جاتا اور باڑہ کی دوسری طرف کود جاتا۔

کبھی وہ اناج کے خرمن گھانس کے ڈھیر میں چھپ جاتا اور اس وقت تک باہر نہ نکلتا جب اُسے بھوک خوب ستاتی۔ اور جب روٹی اس کے پاس کافی مقدار میں جمع رہتی تو وہ اُن احاطوں سے چار چار پانچ پانچ روز تک باہر نہ نکلتا۔

وہ جنگل کے جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا۔ ایسے ہرن کی جو آدمیوں میں گھرا ہوا ہو۔ یا ایسے خرگوش کی جس کا تعاقب شکاری کتے کر رہے ہوں گاؤں کے لوگوں کے رحم کے جذبہ کو وہ اب کبھی نہ ابھار سکتا تھا۔ کیونکہ وہ دل میں ان سے سخت نفرت رکھتا تھا۔ اور یہ دشمنی کسی نہ کسی طرح اُن کے عاجزانہ الفاظ سے ظاہر ہو جاتی تھی۔

اس کا عرف لوگوں نے "بل" رکھدیا تھا۔ کیونکہ اس کا جسم ان لکڑیوں کے درمیان اسی طرح لٹکتا جیسے گھنٹا پچھلے دنوں سے وہ بھوکا تھا۔ اسے کھانے کو کچھ نہ ملا تھا۔ ان لوگوں نے اُسے خیرات دینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ لوگ اس سے بالکل تنگ آچکے تھے عورتیں اسے دروازہ پر دیکھتے ہی گالیاں دیتی اور پانی لیکر دوڑتیں۔ "نکل بدمعاش۔ حرامخور۔ ابھی پرسوں ہی تو میں نے تجھے پوری روٹی دی تھی" اور پانی ٹھنڈا برف کا سا پانی اس کے سردی سے اکڑے ہوئے جسم پر ڈالا جاتا۔ وہ ان تکلیفوں کو مردانہ وار برداشت کرتا اور پانی کی صراحی دیکھتے ہی اتنی تیزی سے جتنی کہ اس کی کٹی ہوئی ٹانگیں اجازت دیتیں بھاگ کھڑا ہوتا مینڈک کی طرح اچھلکر۔ اور بازو کے دوسرے دروازہ پر جا کھڑا ہوتا۔ جہاں پھر اسی طرح اس کا استقبال کیا جاتا۔ اور دونوں عورتیں اپنے اپنے دروازہ میں کھڑی آپس میں کہتیں۔

"لنگڑا ہے تو ہوا کرے۔ ہمارے احسان کو؟ ہم اس کو عمر بھر تک دو دفعہ پلاؤ دینے سے تو رہے"

مگر ان سب باتوں کے باوجود بھوک ایک فطری چیز تھی جو اس غریب لنگڑے کو بھی روز آنہ دو وقت ضرور لگتی۔

آج اس نے اپنی علاقہ بندی کے خلاف پورے گاؤں کا دو دو بار دورہ کیا مگر اُسے کچھ نہ ملا۔ اب قریب کے ایک دوسرے گاؤں کو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس پر تیسرا فاقہ گذر رہا تھا۔ مگر دوسرا گاؤں دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ اور ایک انسان وہ بھی لنگڑا خالی پیٹ اور خالی جیب لیکر دو میل کا فاصلہ نہیں طے کر سکتا۔ مگر وہ چل کھڑا ہوا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ سرد ہوا اناج کے کھیتوں اور درختوں کی ننگی ٹہنیوں میں سے گذر کر سرسراہٹ کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ کالے کالے بادل نیچی آسمان کی پتلی سڑک پر کسی نامعلوم منزل کے لئے دوڑ رہے تھے۔ کیا وہ بھی خالی پیٹ تھے اور دو میل کے فاصلہ پر کسی گاؤں کو جا رہے تھے؟ لنگڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کی لکڑیاں یکے بعد دیگرے تنہا سخت سڑک پر کھٹ کھٹ کر رہی تھیں۔ وہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور سرد ہوا اس کے سینہ کی گہرائیوں تک اُتر رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ سڑک کے کنارے کسی پل یا پتھر پر ستانے بیٹھ جاتا۔ بھوک کی شدت سے بڑی آنت چھوٹی کو کھا رہی تھی۔ اس کے ہوش و حواس آہستہ آہستہ جواب دے رہے تھے۔ اس کا صرف ایک مقصد تھا۔ کھانا پیٹ بھر کھانا۔ مگر وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ مقصد پورا کیسے ہو سکتا ہے۔

مسلسل تین گھنٹے تک وہ اسی لانبی سڑک پر کشمکش کرتا رہا۔ اور جب دوسرے گاؤں کے اونچے جھاڑ دور سے نظر آنے لگے تو اس کے دم میں دم آیا۔ امید نے اسکے قدم بڑھائے مگر اس کی قسمت میں ناکام رہنا لکھا تھا پہلے سوال کے

ایک سخت مزاج کسان نے جو گاؤں سے آرہا اُسے اس ترشی سے جھڑک دیا کہ اس کا دل بیٹھ گیا۔ "اس گاؤں میں سب کے سب ایسے ہی ہوں گے" اس نے دل میں خیال کیا۔ مگر وہ صابر اور مستقل مزاج تھا۔ اس نے ہر دروازہ پر آواز دی۔ اور جہاں وہ گیا اس سے اسی طرح خراب سلوک ہوا۔ اس نے اپنا دورہ پورے گاؤں میں جاری رکھا۔ مگر اسے ایک پیسہ بھی نہ ملا

پھر اس نے کسانوں کے کھیتوں اور جھونپڑیوں کا رُخ کیا۔ نرم نرم کیچڑ اور پانی سے لبریز کھیت جس میں اُس کی لکڑی آدھی سے زیادہ اندر دھنستی جاتی تھی وہ مایوس ہو گیا۔ کیونکہ وہ تھک کر چُور ہو گیا تھا۔ لکڑی اُٹھانا اس کے لئے دوبھر تھا۔ ہر جگہ اسے ڈرا کر تھکا دیا گیا تھا۔ موسم بھی ایسا سرد اور مغموم تھا کہ جس میں لوگوں کے دل پتھر۔ مزاج تیز۔ روح سیاہ اور ہاتھ کوتاہ بن جاتے ہیں۔

وہ ایک خندق کے کنارے لیٹ گیا۔ جو کسی کسان کے کھیت چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس نے لکڑیوں کو جسم سے دور کیا — یہ بہترین طریقہ ہے یہ ظاہر کرنے کا کہ وہ لکڑیوں سمیت زمین پر اوندھے منہ کیسے گر پڑا اور لکڑیاں خود بخود اس سے کیسے علیحدہ ہو گئیں — اس میں حرکت کی تک سکت باقی نہ رہی تھی۔ بھوک اس کے بدن کو کھا رہی تھی۔

وہ منتظر تھا۔ مگر کس کا؟ وہ خود نہ جانتا تھا۔ آہ۔ غیر فانی اُمید اب بھی اس کے دل میں جاگزیں تھی۔ وہ امداد کا سب سے زیادہ محتاج تھا۔ سرد برفانے والی ہوائیں خندق کے کنارے بھوکا پڑا ہوا۔ مگر مدد اسے کیسے پہونچ سکتی تھی۔ آسمانی یا کسی انسان کے ہاتھوں؟

کالی مرغوں کا ایک غول سامنے سے گزرا۔ وہ جانور اپنی خوراک زمین پر ڈھونڈھتے جا رہے تھے وہ زمین جو سب جانداروں کو غذا پہونچاتی ہے اور کسی کو بھوکوں نہیں مارتی۔ مگر اس میں استثنا بھی ہے وہ کون ہے؟ یہ لنگڑا بھکاری۔ ہر لمحہ ان مرغوں کی عقابی آنکھ کسی پوشیدہ کیڑے یا اناج کے دانے کو زمین پر پڑا ہوا دیکھ پاتی اور وہ دوڑ کر اُسے اپنی چونچ سے اُٹھا لیتے پھر اپنی سست رفتار مگر یقینی تلاش شروع کر دیتے۔

"بل" انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیالات اب اسی نقطہ پر جمع ہو گئے تھے دفعتاً اسے خیال آیا۔ کہ انہی مرغوں میں سے ایک اگر اسے مل جائے تو آگ پر بھونی ہوئی کیا لطف دے گی۔

یہ خیال کہ ایسا کرنا چوری میں داخل ہے اسے چھو تک نہیں۔ بازو ہی ایک پتھر پڑا ہوا تھا اس نے اُسے اُٹھا لیا۔ اور قریب ترین مرغی پر پھینک مارا۔ بچپن کی نشانہ بازی اب کام آئی۔ مرغی ایک تیز چیخ کے ساتھ زمین پر گر کر لوٹنے لگی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈی ہو گئی۔

باقی پرندے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے اور اپنی پتلی پتلی ٹانگوں کو جلدی جلدی اٹھاتے ہوئے بھاگ گئے۔

اور "بل" پھر اپنی لکڑی کے سہارے اُٹھتے ہوئے اس مال غنیمت کو لینے کے لئے حتی الامکان تیزی سے بڑھا۔ اس کی چال سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود ایک بڑی مرغی ہے جو اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی اور اپنی پتلی ٹانگوں کو جلدی جلدی اٹھاتی ہوئی دوڑ رہی ہے۔

مردہ مرغی زمین پر پڑی ہوئی۔ اس کا سر خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ "بل" نے ہاتھ بڑھایا۔ دفعتاً اس کی پیٹھ پر ایک زور کا مکا پڑا۔ جس کے صدمہ سے اس کی لکڑیاں بغل سے نکل پڑیں اور وہ لڑھکتا ہوا دس قدم چلا گیا۔

ایک موٹا کسان غصہ میں بھرا ہوا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ اور قریب آیا اور زمین پر پڑے ہوئے "بل" کو گالیاں دیتے ہوئے خوب لات اور گھُسے مارنے لگا۔ "بل" کسی طرح ان بے پناہ ضربوں سے بچ نہ سکتا تھا۔ اس پر مکوں اور لاتوں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

اس کے نوکر بھی اس کے پیچھے دوڑے ہوئے آئے اور اس زد و کوب میں حصہ لینے لگے۔ جب وہ مارتے مارتے تھک گئے۔ تو وہ اُسے کشاں کشاں ایک جھونپڑے کی طرف لے گئے۔ جہاں ایک تاریک کوٹھڑی میں اُسے مقفل کر دیا گیا۔ نوکروں میں سے ایک پولیس کو بلانے دوڑا۔

"بل" نیم مردہ۔ خون آلودہ اور بھوک کی وجہ سے حالت غش میں زمین پر پڑا رہا۔ رات ہوئی اور پھر صبح مگر کھانے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ "بل" بے ہوش ہونے کی وجہ سے بھوک کی اس دوزخی تکلیف سے بچا رہا۔ کبھی کبھی اُسے ہوش آجاتا اور پھر شدتِ کرب سے وہ بے ہوش ہو جاتا۔

دوپہر کے وقت پولیس آئی۔ اور جھونپڑی کا دروازہ بڑی احتیاط سے کھولا گیا۔ گویا اندر کوئی ہٹا کٹا آدمی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ کیونکہ کسان کے نوکر نے تھانے پر بیان کیا تھا کہ وہ ایک موٹا اور لانبا جوان ہے۔ جس کو بڑی مشکل سے گرفتار کیا گیا ہے۔

"اٹھو۔ اٹھ کھڑا ہو" سارجنٹ نے چیخ کر کہا۔

مگر "بل" ہل نہ سکتا تھا۔ اس نے اپنی لکڑیوں کے سہارے سے اُٹھنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ پولیس والوں نے خیال کیا کہ شاید وہ دھوکہ دینے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ دو مسلح سپاہیوں نے اُسے پکڑ کر اٹھا دیا اور بڑی مشکل سے اُس نے لکڑیوں پر اپنا سہارا قائم کیا۔

مارے خوف کے وہ کانپ رہا تھا۔ اسے غش پر غش آرہے تھے اور اس کے بہر بن مو سے پسینہ جاری تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسی شکار کی صیاد کے سامنے یا چوہے کی بلی کے مقابلہ میں۔ وہ کسی آسمانی قوت کی مدد سے

کھڑا ہونے کے قابل بنا رہا۔

"چل ہمارے ساتھ" سارجنٹ نے کہا۔ وہ بڑی مشکل سے چلا۔ کسان کے نوکر اُسے جاتا دیکھ کر ہنس رہے تھے عورتیں کوس رہی تھیں اور مرد گالیاں دے رہے تھے۔ اُس کے دونوں بازو دو سپاہی پکڑے ہوئے تھے جو کبھی کبھی اس کو سہارا بھی دیدیتے۔ یا گرنے سے بچا لیتے۔

اس پر خوف اتنا غالب تھا کہ اس کی اطراف کیا ہو رہا ہے یا کیا ہونے والا ہے وہ یہ تک سمجھ سکتا تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ ایک مخمور شراب والے کی طرح راستہ طے کر رہا تھا۔ اگر کبھی وہ ستانے رکتا تو سپاہیوں کے مکے اسے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیتے۔ راستہ چلنے والے اُسے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے۔

"ہو نہ ہو یہ کوئی چور ہے"

شام شام کے وقت وہ پولیس کے تھانے پر پہونچے۔ وہ آج تک کبھی اتنی دور نہ چلا تھا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ شکایت کا نہ نکالا۔ کیوں کہ اس میں اب سمجھنے یا تمیز کرنے کی قوت باقی نہ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا ہی نہ چاہتا تھا۔ دوسرے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اور علاوہ بریں اس کے خیالات اتنے پریشان اور ملے جلے تھے کہ وہ اُن کا اظہار زبان سے نہ کر سکتا تھا۔

وہ تھانے میں مجرموں کی کوٹھری میں مقید کر دیا گیا۔ پولیس والوں نے اس کا خیال تک نہ کیا کہ اُسے کھانے کی بھی کوئی ضرورت ہے۔ دوسرے دن وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔

مگر دوسرے روز جب پولیس مین اُسے لینے کے لئے کمرہ میں داخل ہوا تو اس کا جسم تو زمین پر گرا ہوا پڑا تھا مگر اس کی رُوح بہشت میں عمدہ عمدہ نعمتوں اور لذائذ کا لطف اٹھا رہی تھی۔

کیا تعجب؟

(ماخوذ از موپاساں)

ارسطو کا سیاسی تخیل

(از جناب غلام جیلانی صاحب بی۔ اے پریسیڈنٹ ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن)

یونان کا مردم خیز خطہ دنیا کی قدیم تاریخ میں مختلف علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے اعتبار سے ایک خاص ممتاز و بلند پایہ حیثیت رکھتا ہے' اسی ملک کی مشت خاک سے فارقلیس' سقراط' افلاطون و ارسطو جیسی باکمال ہستیوں نے جنم لیا اور اپنی فقید النظیر علمی خدمات کی بدولت یونان کو دنیا کی تاریخ میں لافانی عظمت و شہرت بخشی' یونان کے مدبرین و علما میں سب سے بڑی شخصیت ارسطو کی ہے جو نہ صرف اپنے پیش رؤں بلکہ چند امتیازی خصوصیات کی وجہ سے فلسفہ سیاسیات میں عہد قدیم سے لیکر عصر جدید تک کے دنیا کے تمام سیاسی مفکرین میں ایک نمایاں اہمیت رکھتی ہے' اس کی ایک بدیہی وجہ تو یہ ہے کہ ارسطو ہی پہلا وہ شخص تھا جس نے سیاسی مسائل پر محققانہ تحلیل و تدوین سے نظر کی جو ہر علمی تحقیقات کے لئے ازبس ضروری ہے' اسی نے سب سے پہلے اپنے پیش رؤں کے منتشر سیاسی خیالات کو یکجا کر کے' اپنے ملکہ ترتیب و تنظیم کی بدولت' دوسرے علوم کی طرح سیاسیات کو بھی ایک فن کے درجہ سے ترقی دیکر علم کے اعلیٰ مرتبہ پر پہونچایا' جس زمانہ میں وہ پیدا ہوا اُس وقت یونانی ذہانت کے حسن و شباب کا آفتاب نصف النہار پر پہونچ چکا تھا۔

یہاں کے شہروں کی سیاسی سرگرمیاں' بڑے بڑے علما کی موجودگی اور وسائل جہاں سے علوم و فنون کی ترویج' یہ سب ایسے اسباب تھے جو لازمی طور پر سیاسی خیال آرائیوں کی ترغیب و تحریک کے باعث ہوتے تھے' انہی ماحول کے اثرات کی وجہ سے ارسطو کو اپنی اعلیٰ دماغی و ذہنی قوتوں کی ترقی و نشو و نما کا موقع ملا' سب سے بڑی خوبی ارسطو میں یہ ہے کہ وہ اپنے پیش رو مشہور عالم فلسفی افلاطون کے برعکس محض فلسفہ کی خیال آرائیوں میں پھنس کر حقیقت و واقعیت کو کبھی فراموش نہیں کرتا' اُس کے اکثر سیاسی اصول ایسے ہیں کہ اُن پر ہر انسانی سوسائٹی بہ آسانی عمل پیرا ہو کر اعلیٰ درجہ کی سیاسی زندگی بسر کر سکتی ہے۔ ارسطو نے جن سیاسی مسائل پر بحث کی ہے' اُن میں خاص طور پر وہ افکار و خیالات قابل ذکر ہیں جو اُس نے آغاز مملکت' اُس کے اقسام اور ارتقائی کیفیت کے متعلق اپنی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب' سیاسیات' میں پیش کئے ہیں' اس کتاب کے پہلے حصہ میں اُس نے مملکت کے چند بنیادی خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی ہے اُس کے نزدیک مملکت مہذب و متمدن انسانوں کا سب سے بڑا معاشرہ ہے' وہ کہتا ہے کہ ہر جماعت یا معاشرہ کا وجود اُس کے افراد کے کسی

نہ کسی فائدہ کے لئے ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام انسانی افعال کا مقصد کوئی ظاہری مفاد ہوا کرتا ہے مملکت ایک ایسی جماعت ہے جس کا مقصد مجموعی مفاد ہے معاشرتی امتزاج و ارتباط کو پیش نظر رکھتے ہوئے مملکت کی ابتدا کو خاندان سے شروع کیا جا سکتا ہے گو یا وقت کے لحاظ سے خاندان کو مملکت پر تقدم حاصل ہے، ظاہر ہے کہ انسان بالکل تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا اس لئے تسلسل و بقائے حیات کے لئے مرد اور عورت کے اتحاد کی ضرورت ہوئی اور اس اتحاد کی حفاظت کے لئے کچھ احکام اور ان پر عمل کرنے کا سلسلہ چلا اب شوہر و بیوی، آقا و غلام کے باہمی تعلقات سے خاندان بن گیا، اور اس طرح اُن کی باہمی جد وجہد اور کوشش سے اپنی مایحتاج زندگی سہولت و آسانی سے پیدا کرنے لگا اور جب کئی خاندان متحد ہو گئے تو اس اتحاد سے ایک گاؤں یا قبیلہ بنگیا۔ اور بیشتر کے مقابل انسان کی احتیاجات بطریق احسن پوری ہونے لگیں، بہت سے قبیلے یا گاؤں مل کر مملکت کی صورت میں مبدل ہو گئے اس طرح مملکت ہی انسانی معاشرہ کی آخری اور مکمل مثال ہے جس کا قیام انسان کی ضروریات زندگی کی بدرجہ اتم تکمیل اور ایک اعلیٰ پایہ کی متمدن زندگی بسر کرنے کے لئے عمل میں آیا ہے، مملکت کو دو طرح سے فطری جماعت کا لقب دیا جا سکتا ہے اول تو انسان کے عام اور مستقل حالات زندگی اُسے مملکت میں رہنے پر مجبور کرتے ہیں، دوسرے مملکت ہی ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں ہر انسان اپنی قوتوں کا پورا پورا اظہار کر سکتا ہے اور ایک متمدن زندگی جو انسانی حیات کا نصب العین ہے بسر کر سکتا ہے۔ ارسطو انسان کو سیاسی حیوان کا لقب دیتا ہے جس سے اُس "عہد زرین" کی تردید ہوتی ہے جو نظریۂ "معاہدہ معاشرتی" کے زبردست موئید روسو کے نزدیک مملکت کے قیام سے قبل بنی نوع انسان پر گزر چکا ہے جس میں ہر انسان اپنی حالت طبعی میں نہایت لطف و آرام کی انفرادی زندگی بسر کر رہا تھا اور تہذیب و تمدن کے جانگداز اثرات سے محفوظ و مصئون تھا، ارسطو کے خیال کے موجب جو انسان مدنی الطبع نہ ہو اور اجتماعی زندگی کو بنظر تنفر دیکھے، ایسا شخص یا تو کوئی مافوق الفطرت انسان ہے یا حیوان اور علم سیاسیات کو اس قسم کے انسانوں سے مطلق کوئی سروکار نہیں۔

بیان بالا سے ظاہر ہوا کہ تاریخی طور پر خاندان کو مملکت پر تقدم حاصل ہے، ابتداً خاندان کا سرگروہ ایک فرد واحد ہوتا تھا جس کو اپنے ماتحت افراد پر پورا اختیار و تصرف حاصل تھا اس بزرگ خاندان کی حکومت ایک ابتدائی طرز کی شاہی حکومت تھی اس کے بعد حکومت کا زینہ آتا ہے، یہ حکومت ایک نہایت باقاعدہ و منظم جماعت ہے جس میں گاؤں یا قبیلہ محض ایک رکن کی حیثیت رکھتا ہے، ابتداً یہ حکومت

حصولِ حیات کے لئے بنی تھی اس سے ارسطو یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ مملکت ایک مصنوعی جماعت نہیں ہے بلکہ اس دورِ عمل کی فطری و صریحی تکمیل ہے جس کا زینہ خاندان ہے' لیکن ساتھ ہی ارسطو افلاطون کی طرح مملکت کو صرف ایک وسیع خاندان کے مشابہ اور بادشاہ کی حکومت کو بزرگ خاندان کے اقتدار کی ایک ترقی یافتہ شکل بتلا کر خاموش نہیں رہتا بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہتا ہے کہ مملکت وخاندان میں درجہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ نوع کے لحاظ سے حقیقی فرق پایا جاتا ہے' اس کو وہ یوں ثابت کرتا ہے کہ بزرگ خاندان کا اقتدار اگرچہ خاندان کے کل افراد وجائداد پر ہوتا ہے لیکن ان تمام پر اس کے اقتدار کی نوعیت بالکل جداگانہ ہوتی ہے' اپنی بیوی پر اس کا اقتدار جابرانہ نہیں بلکہ مشیرانہ ہوتا ہے وہ اپنی اولاد پر ایک جابر و قہار بادشاہ کی طرح نہیں بلکہ ایک ایسے رحمدل فرمانروا کی طرح حکومت کرتا ہے جس کے نزدیک رعایا کا مفاد اپنے ذاتی مفاد سے زیادہ عزیز ہوتا ہے' لیکن اپنے غلاموں اور جائداد پر محض اپنے ذاتی اغراض و مفاد کے لیئے خودسرانہ وجابرانہ حکومت کرتا ہے' ان ماتحت افراد کے ساتھ بزرگ خاندان کے جو مختلف النوع تعلقات ہوتے ہیں' انہی کے لحاظ سے خاندان اور مملکت میں فرق کیا جاسکتا ہے کیونکہ ارسطو کے خیال کے مطابق مملکت میں فرمانروا کے تعلقات تمام محکوم و ماتحت افراد کے ساتھ یکساں ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ارسطو یہ کہتا ہے کہ خاندان مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے بنتے ہیں اور مملکت اخلاقی و دماغی قوتوں کے نشو ونما کے لئے مملکت بہ تمام وکمال فطرت انسانی کے مطابق ہے' منطقی ترتیب میں اس کا وجود انسان سے پہلے ہے' کیونکہ کوئی شخص مکمل یا قابل برداشت زندگی ایک منظم و باقاعدہ حکومت کی عدم موجودگی میں بسر نہیں کرسکتا' چونکہ حکومت خاندانوں کے باہمی اتحاد سے بنی ہے اس لئے مختلف افراد خاندان کے فرائض اور ان کی نوعیت کے متعلق ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی اہمیت کے اعتبار سے ارسطو نے ان کو ایک عام اصطلاح "اقتصاد" کے تحت میں رکھا ہے۔ سب سے پہلے ان مباحث میں جس مسئلہ نے اس کی توجہ اپنے طرف منعطف کی' وہ غلامی کا مسئلہ ہے' عجیب بات یہ ہے کہ اس نے غلامی کی نہایت زور و شور سے تائید کی ہے' غلاموں کو وہ ہر خاندان کا ایک لازمی جزو قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر فطرت کے اصول کے مطابق عمل کیا جائے تو غلام اور آقا کا تعلق کبھی معقولیت اور انصاف کے خلاف نہیں ہے' تحکم اور اطاعت کے باہمی تعلق ہی کے بلندپایہ اصول پر عمل کرنے سے انسان اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ غلامی کی وہ اس طرح حمایت کرتا ہے کہ ہر انسان میں استعداد و قابلیت کے

مختلف مدارج ہوتے ہیں، بعض لوگوں کی استعداد اتنی اعلیٰ ہوتی ہے کہ وہ تحکم اور رہنمائی اچھی طرح کرسکتے ہیں،
بعض میں اطاعت و فرمانبرداری کی فطری طور پر زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اول الذکر افراد آقا اور موخرالذکر
غلام بننے کی زیادہ اہلیت و موزونیت رکھتے ہیں، اگر ایک دماغی قوت میں ممتاز ہیں، دوسرے جسمانی قوت
میں، خاندان کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے ان ہر دو کے درمیان اتحاد و رابطہ ضروری ہے۔ اس لئے
غلامی انسانی فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ ارسطو کو یہ بات معلوم تھی کہ دنیا میں غلامی کے اس اصول پر بہت کم
عمل ہوتا ہے اور بہت سے غلام ایسے بھی ہیں جو دماغی قابلیت کے اعتبار سے اپنے آقاؤں پر فوقیت رکھتے
ہیں، اس کی ایک بدیہی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں بظاہر کوئی ایسا معیار نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی ایسا صریح
امتیاز کیا جاسکے، مفتوحین کے غلام بنانے کے قاعدہ کو وہ اس وجہ سے جائز قرار دیتا ہے کہ جب تک فاتحین
اپنی دماغی، ذہنی، اخلاقی و جسمانی قوتوں کے اعتبار سے مفتوحین پر تفوق نہ رکھیں اس وقت تک وہ اُن پر
کیسے غلبہ حاصل کرسکتے ہیں، اس لحاظ سے یونانیوں کے اس عام خیال کو تقویت پہونچتی ہے کہ دیگر اقوام عالم پر
قابو حاصل کرکے اُن کو بجا طور پر غلام بنایا جاسکتا ہے۔

افلاطون کے برعکس ارسطو انفرادی ملکیت کو اُٹھانا نہیں چاہتا بلکہ خانگی ملکیت کے مروجہ اصولوں
میں بہت سی باتوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ افلاطونی اشتراکیت پر جو اُس نے فیصلہ کُن اعتراضات
کیئے ہیں وہ زاید از دو ہزار سال کی طویل مدت کے انقضا کے باوجود اب تک اُسی قدر زوردار اور مناسب
ہیں۔ پیدایش دولت اُس کے نزدیک فی نفسہٖ انسان کا کوئی اعلیٰ نصب العین نہیں ہے۔ بلکہ بقائے
حیات کے لیے، انسان کو مجبوراً معاشی جد وجہد کرنی پڑتی ہے، اسی ضمن میں جائز و ناجائز پیدائش دولت
کے طریقوں کا بھی اُس نے اجمالاً ذکر کیا ہے، جائز طریقے وہ ہیں جن کو عمل میں لانے کا مقصد محض ضروریات
زندگی کی تکمیل ہوتا ہے مثلاً کاشتکاری، گلہ بانی، ماہی گیری وغیرہ، ناجائز طریق وہ ہے جس کا مقصد دولت
جمع کرنا ہو، مثلاً اضافۂ دولت کے لئے تجارت کرنا خواہ وہ جنس کا جنس سے تبادلہ کی شکل میں ہو یا زر کی
وساطت سے ہو، ابتداً زر کا رواج محض مبادلہ میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے ہوا لیکن بعد کو
چلکر خود زر کو لوگوں نے انسانی حیات کا مقصد و نصب العین بنالیا، اُسی کا نتیجہ تھا کہ سود کے لین دین کا
مضرت رساں طریق شروع ہوا جو بتدریج ترقی کرکے تقسیم دولت کے عدم مساوات کو ناقابل برداشت
حد تک بڑھا دیا۔

ارسطو نے افلاطون کے جن اشتراکی اصولوں کی تردید کی ہے وہ بیحد دلچسپ ہے افلاطون کے اس خیال سے وہ موافقت نہیں کرتا کہ اگر انسان کو اپنی اولاد کے متعلق لاعلمی رہے تو ہر شخص مملکت کے تمام بچوں کو اپنی اولاد سمجھکر پوری الفت و محبت کی نگاہ سے دیکھے گا اور اس طرح خاندانی محبت' افراد مملکت کی محبت میں منتقل ہو جائیگی' ذاتی ملکیت و تصرف ہی اُس کے نزدیک فی الحقیقت محبت کی اصل بنیاد ہے' اس لیئے اگر افراد مملکت شادی کی رسم کو اُٹھا دیں اور اُن کو اپنی اولاد کے متعلق لاعلمی رہے تو کوئی شخص کسی سے محبت ہی نہیں کرے گا' یہ بات آزمودہ ہے کہ جو چیزیں بہت سے لوگوں میں مشترک ہوتی ہیں اُن کی بہت کم پروا کیجاتی ہے کیونکہ انسان کو اپنی چیز کا خاص طور پر خیال ہوتا ہے اور یہ بات مشترک چیزیں نہیں پائی جاتی' ذاتی ملکیت اگر پوری طرح منضبط کردی جائے تو اُس سے اشتراکیت کے مفروضہ فواید کے علاوہ اور بھی بہت سے فایدے حاصل ہو سکتے ہیں' مملکت کے افراد میں سچی اور اعلیٰ اشتراکیت محض یہی ضرب المثل ہے کہ "دوستوں کا مال مشترک ہوتا ہے" (ALL THINGS ARE COMMAN AMONG FRIENDS)

ارسطو نے اپنے دور کی اُن شکایات کو جو آج کل کی طرح اُس زمانہ کے اشتراکیوں کا اصل سرمایہ تھیں' فضول و نامناسب اور انفرادی ملکیت سے بے تعلق بیان کیا ہے۔ ارسطو کے زمانہ میں اس تجویز کو شہرت حاصل ہوگئی تھی کہ تمام شہریوں کے مابین مساویانہ طریقہ پر جائیداد کی تقسیم ہونی چاہیئے' لیکن شد و مد کے ساتھ اس کی بھی اُس نے مخالفت کی۔ وہ کہتا ہے کہ مساوی تقسیم اور خانگی ملکیت کی تحدید فی نفسہٖ اچھی ہے' لیکن اگر بفرض محال اس پر عمل ہو بھی گیا تو محض ایک نسل کی پیدایش اور موت سے تمام شہریوں کے مالکانہ حقوق بدلجائینگے اور سارا حساب کتاب درہم برہم ہو جائیگا' جائداد کا مسئلہ حل ہونے کے بعد آبادی کا پیچیدہ مسئلہ درپیش ہو جائیگا۔ جس کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ علاوہ بریں مساوات خود کوئی بہتر چیز نہیں اس سے بہتر تو یہ ہے کہ انسانی حیثیت میں مساوات قائم کرنے کی بجائے انسانی ضروریات کو برابر کیا جائے۔

اس کے بعد اُس نے دستور مملکت سے بحث کی ہے اور مملکت کو شہریوں کے اجتماع سے تعبیر کیا ہے یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ شہری سے آخر کیا مطلب ہے اور شہری کون ہے؟ ارسطو کے نزدیک کامل شہری کی تعریف یہ ہے کہ وہ قانون سازی اور جبوری میں یا کم از کم دونوں میں سے کسی ایک میں حصہ لینے کا حق رکھتا ہو یا بالفاظ دیگر شہریت کے لیئے سیاسی حقوق کا حصول ضروری ہے اور مملکت ایسے

انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کو اس قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ارسطو اور یہ مزید سوال کرتا ہے کہ شہری کون بن سکتا ہے مزدور اور اہل پیشہ وغیرہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے ایک کامل شہری کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں حکومت و فرمانبرداری دونوں کی استعداد موجود ہو اور ان ہر دو قسم کی قابلیتوں کو ترقی دینا بہر حال ضروری ہے، جن لوگوں کو اپنی بقائے حیات کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی ہے وہ دوسروں کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے کرتے حکمرانی کی ساری قابلیت کھو دیتے ہیں کیونکہ ان کو اپنی اس استعداد کی نشوونما و ترقی کا موقع نہیں ملتا انسان جب تک معیشت کی فکر سے آزاد نہ ہو اس وقت تک اس کے لیے سیاسی فرائض کو کماحقہ انجام دینا دشوار ہے، کام کرنے والے طبقوں کی مملکت کو جس قدر ضرورت ہے اس لحاظ سے ان کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، لیکن اس اعتبار سے وہ حقیقی معنوں میں شہری نہیں کہلا سکتے۔

مملکت کے دستور کے متعلق ارسطو کا خیال ہے کہ اس کے ذریعہ سے حکومت کے مختلف اعضاء، ان کے باہمی تعلقات و نیز اس شخصیت یا جماعت کا حال پوری طرح معلوم ہو سکتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ مرکوز ہو، اقتدار اعلیٰ کا مسئلہ دستور مملکت کے تمام مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ مختلف دساتیر کے درمیان امتیاز کیا جا سکتا ہے جس مملکت میں یہ اقتدار محکم بہت سے لوگوں سے وابستہ ہوتا ہے وہاں کی حکومت کو عمومیت کا لقب دیا جاتا ہے جہاں چند افراد کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے اس کو اعیانیہ کہا جاتا ہے ارسطو مملکت کی روح دستور کو قرار دیتا ہے کیونکہ دستور کی تبدیلی کے ساتھ مملکت کی ہیئت بھی بدلتی رہتی ہے۔ مذکورہ بالا مملکت کی تشریح اور دستور حکومت کی تعریفات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ مملکت اجتماعی زندگی کے خلقی رجحان کے باعث پیدا ہوتی ہے نہ کہ شعوری طور پر ایک دوسرے کی مدد کے خیال سے، تاہم اس سب سے بڑے سیاسی معاشرہ کے نظام کی بدولت روابط باہمی میں معتدبہ ترقی ہوتی ہے۔ اس سیاسی نظم کے برکات سے تمام شہریوں کو یکساں طور پر استفادہ کرنے کے مواقع ملنے چاہئیں اس لئے دستور حکومت ایسا ہونا چاہیئے کہ تمام افراد کو حکومت کے صیغوں میں کام کرنے اور اپنی حسب استعداد ترقی کرنے کا موقع حاصل ہو، اقتدار اعلیٰ کے اہم و پیچیدہ مسئلہ کے متعلق بھی ارسطو نے نہایت واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید کرتا ہے جو محض ایک بڑی تعداد کا مقتدر اعلیٰ ہونا بہتر سمجھتے ہیں یا جو تمول و دماغی قابلیت کی بنا پر معدودے چند افراد میں اقتدار اعلیٰ کو محدود کرنا چاہتے ہیں، اول الذکر طبقہ کے خیال کے مطابق تمام افراد مملکت بحیثیت آزاد ہونے اور سیاسی حقوق سے بہرہ ور ہونے کے اقتدار اعلیٰ ان تمام کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیئے اس کے بالکل برعکس اعیانیہ کے مؤیدین دولت، قابلیت، و نسلی امتیازات کی

بناء پر اقتدار اعلیٰ کی باگ ایک محدود طبقہ کے ہاتھ میں ہونا پسند کرتے ہیں، ارسطو کہتا ہے کہ مملکت ایسا معاشرہ نہیں ہے جس کا مقصد محض دولت پیدا کرنا، تجارت کو فروغ دینا، مختلف قوموں کے درمیان اتحاد کرنا یا اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا ہو یا جہاں لوگ ایک جگہ مقیم ہو کر ایک دوسرے کو نقصان پہونچانے سے بچیں اور باہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہیں، بلکہ اس کا مقصد نہایت اعلیٰ اور بہتم بالشان ہے، مملکت کا نصب العین ایک اعلیٰ معیار کی متمدن وخوشحال زندگی بسر کرنا ہے، اس زاویہ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ سیاسی اقتدار اُن افراد کو ملنا چاہیئے جو اس قسم کی بلند پایہ متمدن زندگی کی ترقی کے ممد ومعاون ہوں، اس لحاظ سے قابلیت، اعلیٰ اخلاق اور انصاف پسندی و بے لوثی جیسے اعلیٰ و پاکیزہ صفات بجائے دولت ونسلی امتیاز کے حصول اقتدار کے لئے معیار بنائے جائیں تو بہتر ہے، اب رہا یہ کہ آیا اقتدار اس معیار سے ایک شخص کو ملنا چاہیئے یا چند اشخاص کو یا بہت سے اشخاص کو، ارسطو کہتا ہے کہ اگر بہت سے لوگوں سے یہ اقتدار وابستہ ہو جائے تو اجتماعی طور پر بہت سی خوبیوں سے ملک استفادہ کر سکتا ہے۔

غرض کہ ارسطو کے خیال کے مطابق عوام کے ہاتھ میں اقتدار اعلیٰ ہونا چاہیئے لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آیا تمام افراد متفقہ طور پر یا ہر شخص علیحدہ طور پر حکومت کے فرائض انجام دے، لیکن ظاہر ہے کہ تمام اہم مسائل قوم کے متفقہ فیصلہ ہی سے طے ہوں گے، اس کو ملحوظ رکھکر وہ کہتا ہے کہ عوام کی جماعت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اُن تمام عہدہ داروں کا انتخاب کرے اور اُن پر نگرانی رکھے جن کے ہاتھ میں انظم ونسق سلطنت کی باگ دیجاتی ہو، ارسطو اُن لوگوں کے خیال کی تردید کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بجائے عام لوگوں کی جماعت کے چند مخصوص تجربہ کار لوگ مفید انتخاب کر سکتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سیاسیات میں عوام کا حکم ہمیشہ جائز و درست ہوتا ہے، مختصر یہ کہ اقتدار اعلیٰ کے معیار متذکرۂ بالا کی رو سے خواہ ایک شخص کی ذات میں یہ اختیار مرکوز ہو یا چند یا بہت سے افراد کے تاہم اس اقتدار پر بھی قانون کا اقتدار حاوی ہونا چاہیئے کیونکہ قانون کی حکومت ہمیشہ اچھائی اور معقولیت پر مبنی ہوتی ہے، البتہ جہاں قانون نامکمل یا مشکوک ومشتبہ حالت میں ہو اور وہاں انسانی اقتدار بے روک ومکمل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ عام طور پر بے روک اختیار ملنے سے ناانصافی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے

تقسیم مملکت یا تقسیم وساتیر مملکت کے متعلق بھی ارسطو نے نہایت مشہور ومعروف نظریہ پیش کیا ہے، اس تقسیم کو اُس نے اس تخیل سے شروع کیا کہ مملکت میں ایک مرکز حکومت ہوتا ہے جس کے ماتحت مملکت کا ہر شعبہ ہوتا ہے، یہ مرکز حکومت مملکت پر خاص اثر ڈالتا رہتا ہے، مملکت کی تقسیم قدرتاً اسی بنیاد پر ہے تقسیم مملکت

میں اُس نے اُن اشخاص کی تعداد کو ملحوظ رکھا ہے جنہیں حکم کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اول تو وہ مملکت کی دو
شقیں قائم کرتا ہے، ایک وہ جو قوم کی بہبودی چاہتی اور اس کی بہتری کی کوشاں رہتی ہے، دوسری شق
میں وہ اُن مملکتوں کو شامل کرتا ہے جو صرف بادشاہ یا حکمراں طبقہ کے مفاد کو پیش نظر رکھتی اور اجتماعی مفاد کو
نظر انداز کردیتی ہیں، اول الذکر کو وہ صحیح یا حقیقی اور موخر الذکر کو غیر صحیح یا غیر حقیقی کا لقب دیتا ہے، لہٰذا ارسطو کے خیال
کے مطابق تین اصلی شکلیں ہیں اور اُن کی تین معکوس صورتیں۔ اب حکومت یا تو ایک شخص کے ہاتھ میں ہوگی یا چند
آدمیوں کے، یہ اختیار جہاں ایک شخص واحد کی ذات میں محدود ہوتا ہے اس کو وہ بادشاہت یا ملوکیت سے
تعبیر کرتا ہے جہاں یہ اختیار چند افراد کو حاصل ہوتا ہے اُس کو اعیانیہ اور جہاں باشندگاں کی عام جماعت حکمراں ہوتی ہے
اس کو دولت عامہ کا لقب دیا جاتا ہے، معکوس صورتوں میں جہاں یہ اختیار ایک واحد شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے
اور وہ محض اپنے مفاد کے لئے حکومت کرتا ہے تو اُس کو غیر آئینی یا خودسرانہ حکومت سے تعبیر کرتے ہیں اور جب چند
افراد محض اپنی ذاتی مفاد کے لئے حکومت کریں تو اس کو عدیدیہ اور جب بہت سے لوگ خودغرضی سے حکومت
کریں تو اس کو عمومیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا ترتیب سے ارسطو کا مقصد یہ تھا کہ اس سے نہ صرف مملکتوں کی تقسیم واضح ہو جائے بلکہ اس سے
حکومت کے ارتقائی دور کا ایک خاکہ بھی پیش نظر ہوسکے، اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ ابتدائی صورت بادشاہ کی
تھی، اس کے بعد حکومت اعیانی وجود پذیر ہوئی پھر وہ عدیدیت و جباریت کے مدارج طے کرتے ہوئے حکومت عمومیہ
کی صورت میں مبدل ہوگئی، غرضکہ ارسطو کے خیال کے مطابق بادشاہت کا زینہ پہلے آتا ہے، اس کی وجہ وہ بتاتا ہے
کہ شہروں کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے موقر و ممتاز آدمیوں کی قلت ہوگی اس وجہ سے وہ بادشاہ بنادیئے گئے
لیکن جوں جوں ممتاز و ذی اقتدار طبقہ میں اضافہ ہوا تو اُن لوگوں نے ایک شخص واحد کی فوقیت و اقتدار سے
نکلنے کے لئے ایک ایسا نظام حکومت ترتیب دیا کہ جس میں چند مختار روشن خیال افراد مل کر حکومت کریں لیکن یہ
طبقہ بھی اجتماعی مفاد سے گریز کرکے اپنے ذاتی مفاد کے لئے حکومت کرنے لگا جس کی بدولت دولت عامہ عدیدیہ
میں متبدل ہوگئی اور رفتہ رفتہ حکمراں طبقہ اپنے ذاتی مفاد و اغراض کے لئے اپنی کثرت کو اقلیت میں تبدیل
کرتا چلا گیا جس کا بالآخر نتیجہ عوام الناس کے اقتدار میں ظاہر ہوا اور اس طرح حکومت عمومی کا وجود عمل میں آیا۔

اب رہی مملکت کی اچھائی اور برائی اس کو وہ بالکل اضافی شئے بتلاتا ہے، حالات و واقعات کے لحاظ سے
ایک مملکت اچھی بھی ہوسکتی ہے اور بری بھی لہٰذا وہی مملکت بہتر ہے جو بہت عرصہ تک اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہو یعنی

انقلابات کی زد سے محفوظ رہے اور افراد مملکت کا ایک معتد بہ حصہ ہمیشہ اس کے نظام حکومت کو قایم و برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہے۔

اس کے بعد ارسطو کردار سازی پر زیادہ زور دیتا ہے اور ملک گیری و خوں ریزی کو مملکت کے نصب العین کے صریح مخالف سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مملکت کے تمام باشندے ایک ایسی روش پر قائم رہیں جو مملکت کے تمام عناصر کے درمیان رابطہ و اتحاد قایم کر کے بحیثیت مجموعی کل انسانوں کو زندگی کی تکمیل کی طرف لیجا سکے۔ اور یہی چیز فی الحقیقت مملکت کے وجود کا نصب العین ہے، ہر حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس غرض کی تکمیل کے لئے انتھک سعی کرے اور جو حکومت ایمانداری سے اس کی کوشش نہیں کرتی اس کو فنا ہو جانا چاہیئے، اس شاندار مقصد کے حصول کے لئے جہاں اُس نے افراد کی پاکیزہ سیرت پر زور دیا ہے وہاں مملکت کی وسعت کے متعلق بھی کافی بحث کی ہے، افلاطون کی طرح وہ مملکت کے حدود کو وسیع کرنا مناسب خیال نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ مملکت صرف اس حد تک وسیع ہونا چاہئے کہ وہ بلا کسی خارجی امداد کے اپنی کل ضروریات زندگی کی تکمیل خود کر سکے، دریا سے قربت ہو تو بہتر ہے تاکہ جن اشیا کی مملکت کو ضرورت ہو آسانی کے ساتھ غیر ممالک سے منگوائی جا سکیں لیکن اتنی قربت بھی بیکار ہے کہ محض اضافۂ دولت کے خیال سے تجارت کو ترقی دینے اور بحری جد و جہد میں حصہ لینے کی تحریص پیدا ہو۔ بیرونی دشمن کے حملہ سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لئے اندرونی استحکام، برجوں اور قلعہ کی تعمیر، فنون سپہ گری کی تعلیم اور اسلحہ کی فراہمی نہایت ضروری ہے۔ باشندگان مملکت کی ذہنی سطح و اخلاقی معیار بلند کرنے کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ میں تعلیم کی نشر و اشاعت ہونی چاہئے، بلکہ تعلیم جبری کا نفاذ حکومت کی طرف سے کیا جائے تو اور بھی بہتر ہے، موسیقی اور جسمانی تربیت کو بھی تعلیم کا لازمی جزو قرار دینا چاہیئے۔

ارسطو جس زمانہ میں موجود تھا اس وقت نظام سلطنت جلد جلد بدلتا رہتا تھا اس کے مطالعہ سے اس نے تقسیم مملکت کا نظریہ پیش کیا افلاطون کے برعکس واقعات و حالات کو بنظر امعان دیکھکر اور ان کا تجزیہ کر کے مملکت کی ارتقائی کیفیت پیش کی اور ان اسباب کو تحقیق کرنے کی کوشش کی جو ملک میں انقلاب پیدا کرنے کے باعث ہوتے ہیں چنانچہ سب سے پہلا سبب انقلاب کا اس کے نزدیک انسانوں کا مساوات کے لئے کوشش کرنا ہے، مساوات کی دو قسمیں قرار دیجا سکتی ہیں ایک قطعی دوسری تناسبی عوام ہمیشہ قطعی مساوات کے لئے کوشاں رہتے ہیں یعنی وہ ان سیاسی حقوق و اقتدار کے حصول کے لئے انتھک جد و جہد کرتے ہیں جو ملک کی چند سربرآوردہ شخصیتوں کو ان کی ذہنی نسلی و مالی امتیازات کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں۔

اس کے بخلاف ان معدودے چند افراد کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مراتب و اقتدار کی حفاظت کے لئے ایسی تدابیر اختیار کریں کہ عوام الناس کی ترقی میں مستقل رکاوٹیں پیدا ہوجائیں۔ اسی آپس کی کشمکش کی وجہ سے حکومت کی ہیئتیں بدلتی رہتی ہیں اور ملوکیت، اعیانیہ، عدیدیہ و عمومیہ کے قیام کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔

انسانوں کے مخاصمانہ و معاندانہ جذبات بھی حکومت کے وجود کے لئے بہت خطرناک ہوتے ہیں مختلف گروہوں کے درمیان جب نفرت، بغض، حسد، خوف اور انتقام کے جذبات پیدا ہو کر زیادہ ترقی کرجاتے ہیں تو مملکت کو انقلاب کے ہولناک دور سے گزرنا پڑتا ہے، ایسے موقع پر انقلاب کی ذمہ داری بڑی حد تک مختلف سیاسی فریقوں کے رہنماؤں پر عاید ہوتی ہے جو عناد و مخالفت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عوام الناس میں انقلاب آفریں جذبات کی تخلیق اسی وقت ہوتی ہے جبکہ حکومت کیجانب سے اُن پر ظلم و زبردستی کیجائے یا ان کو اُن کے جائز سیاسی حقوق سے بالکلیہ محروم کردیا جائے۔ جب حکمراں طبقہ میں نفاق و لالچ پیدا ہوجاتا ہے تو عدیدی حکومت کا وجود باقی نہیں رہتا، جب تک حکمراں جماعت میں اتفاق و اتحاد و رواداری اور عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رہتا ہے اعیانی حکومت کبھی انقلاب کی زد میں نہیں آتی۔ اعیانی حکومت اُمرا کی دراز دستیوں اور حرص و طمع کی وجہ سے عدیدی حکومت میں مبدل ہوجاتی ہے، غریب و مفلس طبقہ کی بیجا خواہشوں اور تمناؤں کی وجہ سے دولت عامہ عمومی حکومت کی شکل اختیار کرلیتی ہے کسی دستور میں اس وقت تک کوئی انقلاب یا تغیر واقع نہیں ہوسکتا جب تک کہ حکمراں طبقہ میں کمزوری، خودغرضی، اور نفاق نہ پیدا ہوجائے۔ مملکت کو انقلاب کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے ارسطو نے جو تدابیر بتائی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی ایک شخص واحد کو مملکت کے سیاہ و سپید کا اختیار نہیں دینا چاہئے، حکمراں طبقہ کو خاص طور پر اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ دستورِ مملکت کے حامیوں کو مختلف طریقوں سے نظامِ حکومت کی محافظت پر آمادہ رکھیں اور حکومت کی برکات کا اُن کے قلوب پر سکہ بٹھاکر ہمیشہ اُن کی تائید حاصل کرتے رہیں، مملکت کے اعلیٰ مناصب و عہدے ہمیشہ نیک، لائق اور قابل افراد کو دیئے جائیں اور رشوت و مالی منفعت کے سارے راستے مسدود کردیئے جائیں تاکہ وہ ذاتی مفاد پر مملکت کے مفاد کو قربان نہ کرسکیں، حکام سلطنت ایسی روش اختیار کریں کہ جس کی وجہ سے تمام باشندگان مملکت کے دل میں اُن کی ذات پر اعتماد و بھروسہ پیدا ہوجائے اور وہ یہ سمجھنے لگیں کہ حکومت ان کی فلاح و بہبود کی دل سے خواہاں ہے اور ملک کی عام ترقی اور مرفہ الحالی کے لئے ہمیشہ ساعی رہتی ہے۔

غرضکہ ارسطو نے انسانی فطرت اور اپنے زمانہ کے سیاسی حالات کا عمیق نظر سے مطالعہ کرکے انقلاب کے

جو اسباب معلوم کیئے ہیں اُن کی صحت و حقیقت میں کوئی کلام نہیں، دنیا میں جس قدر بھی سیاسی انقلاب ہوئے اگر اُن کی تحقیق و تجسس کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اسباب بھی بیشتر اُسی قسم کے تھے جن کو ارسطو نے ظاہر کیا ہے، اُس کے بعض اصول ایسے ہیں کہ اُن پر ہر مملکت میں اب بھی بآسانی عمل کیا جا سکتا ہے' اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس نے افلاطون کی طرح اپنی پرواز خیالی دنیا تک محدود نہیں رکھی بلکہ حالات و واقعات کا دوربینی و عمیق نظری سے مطالعہ کر کے قابل عمل نظریئے بنائے لیکن ساتھ ہی ارسطو کے سیاسی تصانیف میں خامی یہ ہے کہ اگرچہ اُس نے گزشتہ اور اپنے زمانہ کے دساتیر حکومت کی خامیاں معلوم کیں اپنے پیش روں کے سیاسی اصولوں کو تنقید کی نگاہ سے دیکھکر اُن کی خامیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب کیا' لیکن خود بہت کم اُس نے اپنی طرف سے مملکت کے نصب العین تک پہونچنے کی عملی تجاویز پیش کی ہیں' اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو کا کام زیادہ تر تخریبی تھا کہ تعمیری' افلاطون کی جمہوریہ میں اچھے لوگوں کی جماعت وغیرہ پر جو اعتراضات اُس نے کیئے ہیں اُن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ افلاطون ایک ایسا نصب العین بنا رہا تھا جسے وہ خود نا قابل عمل سمجھتا تھا اور ارسطو نے اُن کو عملی تجاویز سمجھکر اعتراض کیا' افلاطونی اشتراکیت پر اس نے بہت وزنی اعتراضات کیئے ہیں اور واقعی اُس کے دلائل و براہین جو اُس نے اپنی رائے کی تائید میں پیش کیئے ہیں بہت ہی معقول ہیں' آجکل جسے ملکیت کا طلسم کہا جاتا ہے اُس کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ جو چیزیں بہت سے لوگوں میں پائی جاتی ہیں اُن کی بہت کم پروا کیجاتی ہے کیونکہ انسان کو اپنی چیز کا خاص طور پر خیال رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے محبت ہرگز عارضی نہیں ہے بلکہ فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے۔

مملکت کی جو اُس نے تقسیم کی ہے اُن میں بعض باتیں موجودہ دور کے لحاظ سے بے سود و بیکار ہیں اول تو ارسطو نے عمومیت کا جو مفہوم لیا ہے اُس میں اور اس لفظ کے جدید مفہوم میں بہت بڑا اختلاف ہو گیا ہے' موجودہ دور میں اس کا مفہوم وہی ہے جو ارسطو کے عہد میں دولت عامہ کا تھا۔

ارسطو کے قائم کردہ دور سیاسی کے تغیرات کے نظریہ کی تائید زمانہ قدیم کی یونانی شہری سلطنتوں و نیز اٹھارویں صدی میں انقلاب فرانس کی سیاسی تاریخ سے ہو سکتی ہے لیکن بایں ہمہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ارسطو کا قائم کردہ نظریہ دور سیاسی کے تغیرات کی شرط لازمی ہے' لازمی ہی کیا اس کو معمولی حالت بھی نہیں کہہ سکتے خود ارسطو اسکو معمولی شکل سمجھتا ہے اسی طرح ارسطو کی تقسیم مملکت بھی عہد جدید کی مملکتوں کے اعتبار سے نامکمل رہجاتی ہے کیونکہ دنیا میں ایسی بہت سی مملکتوں کا وجود پایا جاتا ہے جو اُن تینوں قسموں میں سے کسی میں بھی داخل نہیں ہیں' اس کی ایک

بدیہی وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ارسطو کا طریق تقسیم اعداد کی بنا پر تھا، دوسرے یہ کہ ہر ایک ملک کے باشندوں کی بود و باش، طرز معاشرت و دیگر حالات کا دستور حکومت پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اور انہی اثرات کے تحت ہر ملک کا دستور جدا ہوتا ہے، اس لئے ضرورت اس امر کی داعی ہوتی ہے کہ ارسطو کی ترتیب میں معتدبہ ترمیم و وسعت پیدا کردی جائے، اول تو شاہی اور عمومیہ کے الفاظ ہی سے خلط مبحث پیدا ہوجاتا ہے، اگر ارسطو کی دولت عامہ کے مانند عمومیہ کے معنی یہ ہیں کہ حکومت بہت سے افراد کے ہاتھوں میں ہو تو برطانیہ کی سلطنت اسی نوع میں داخل ہوجاتی ہے جس میں ممالک متحدہ امریکہ داخل ہے حالانکہ دونوں کی ظاہری ہیئت میں نمایاں فرق ہے، ایک کی ظاہری ہیئت ملوکیت کی ہے تو دوسری کی جمہوریت کی، اس کے برخلاف کسی ایک شخص کو بادشاہ کے لقب سے ملقب پاکر برطانوی حکومت کو شاہی کہدیا جائے تو یہ ایک صریح غلطی ہوگی کیونکہ یہاں بادشاہ کے اختیار پر گونا گوں آئینی قیود و پابندیاں عاید کردی گئی ہیں اس سے ظاہر ہے کہ ارسطو کی قدیم تقسیم میں موجودہ دور کی انہی مشروط بادشاہیوں، متحدہ و غیر متحدہ حکومتوں و نیز مجلس وضع قانون اور جماعت عاملانہ کے آئینی فرق کے اعتبار سے بھی حکومتوں میں تمیز نہیں کی گئی ہے، اس لئے اب ضرورت ایک جدید تقسیم کی ہے۔

غزل

از جناب ابو السخا محمد سعید صاحب "باشمیل" سالار حیدرآبادی

وہ طوفاں اٹھے چشم تر بیٹھے بیٹھے — مجھے غم نہیں گر یہ گھر بیٹھے بیٹھے
ادھر اس نے تاکا کسے جاتے جلتے — ادھر ہم نے تھاما جگر بیٹھے بیٹھے
نئی کیوں کریں ہم کسی سے محبت — یہ کیوں مول لیں درد سر بیٹھے بیٹھے
اٹھا چپکے چپکے تو فتنے ستمگر — فراہم کر اسباب شر بیٹھے بیٹھے
صبا کا یہ چلتا ہوا چٹکلہ ہے — ہوئی گل جو شمع سحر بیٹھے بیٹھے
تصور جو کرتے ہیں ہم لامکاں کا — پہنچ جاتے ہیں عرش پر بیٹھے بیٹھے
یہ کیوں آنکھ غیروں سے تم نے لڑائی — یہ کیا خانہ جنگی ہے گھر بیٹھے بیٹھے
کسی طرح ٹالینگے ہم روز فرقت — ادھر بیٹھے بیٹھے ادھر بیٹھے بیٹھے
نیا تم کو سوجھا ہے سالار نغمہ — غزل خوب ہے مختصر بیٹھے بیٹھے

ابوالفضل

(از جناب سید عبدالعزیز صاحب)

ہندوستان کے لئے سولہویں صدی بھی کیا مبارک صدی تھی۔ ہر طرف امن وامان کا دور دورہ تھا۔ اور رعایا اکبر جیسے شہنشاہ کے نیر اقبال کی ضیا پاشیوں سے نئی زندگی حاصل کر رہی تھی۔

ہند کے چاروں گوشوں میں اطمینان وشادمانی کا ڈنکا بج چکا تھا۔ اسی مسرت وانبساط کے زمانہ میں ایک ایسی ہستی عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف لوٹتی ہے۔ جس کے وجود نے ادبی دنیا میں وہ شہرت ونا موری حاصل کی کہ ادبی کلیہ سے بقائے دوام کی سند اس کی خدمت میں پیش کی گئی۔ جس پر سنہری حروف سے یہ منقش تھا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سنہ ۱۵۵۱ء کی مبارک ساعت شیخ مبارک ناگوری کا مصیبت کدہ اس ادبی آسمان کے آفتاب کے طلوع ہونے کی وجہ جگمگا اٹھا۔ اور اس کی ضیا پاشی مطلع ابر آلود میں پنہاں ہونے تک برابر جاری رہی۔

پیدائش کے بعد اس ماہ چرخ سخن کا نام ابوالفضل رکھا گیا۔ ابوالفضل کے پدر بزرگوار کے استاد کا نام بھی یہی تھا۔ انہوں نے اپنے استاد کے نام کو مبارک سمجھ کر اپنے فرزند کو بھی اسی نام سے موسوم کیا۔ ہونہار برواکے چکنے چکنے پات، کے بمصداق وہ عالم طفلی ہی میں اُن مسائل کو حل کر رہا تھا۔ جو اس سے دگنی عمر والوں کے لئے چیتاں تھے۔

ابتدائی تعلیم باپ کے خزانۂ علم سے حاصل کی۔ اور پھر درسگاہ نے اپنی علمی گہر افشانیوں سے اس کے دُرج دماغ کو منور کیا۔ پھر کیا تھا، صدف دہن کے کھلتے ہی دُرہائے بے بہا نکل پڑتے تھے۔ جن کو سینہ کے صندوق اور دل کی خوبصورت مخزوطی ڈبیہ میں جگہ دی جاتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ قابلیت حاصل کی کہ آزاد کی ہستی بھی آخر یہ کہے بغیر نہیں رہی کہ" پدر بزرگوار کے خزانۂ عقل کا خزانچی اور جواہر معانی کا پہرہ بردار ہو گیا"۔

ابھی اس کی عمر اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ تنقیدی میدان میں شہ سواری کرے لیکن یہ وہ شخصیت نہیں تھی جو خاموش رہتی۔ طالب علمی کے زمانہ میں جو اعتراضات کہ سعد الدین اور میر سید شریف پر کئے تھے لکھ رکھے تھے۔ مطول کے حاشیہ پر خواجہ ابوالقاسم نے بھی وہی اعتراض کئے تھے۔ جس کو دیکھ کر لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ فیضی اور مبارک دونوں نے اس کو اکبر کی خدمت میں حاضر ہونے کی صلاح دی۔

چنانچہ ان کی صلاح کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی فراست ودانائی کی وجہ اکبر کے دل میں جگہ کر لی، پھر کیا تھا! اس کا مصیبت کدہ دولت کا گہوارہ بن گیا۔ قابلیت کے نشہ میں بڑے بڑے مجتہد ذو

نظر آتے تھے۔ اکبر نے کئی ایک انجمن ہائے مباحثہ قائم کئے تھے جن میں علمی مباحث پر تقاریر ہوا کرتی تھیں۔ اثنائے بحث میں اگر کوئی معترض کسی مجتہد کا کلام سند میں پیش کرتا تو ابوالفضل کہدیتا " فلانے حلوائی۔ فلانا موچی، اور فلانے چرم گر کے قول پر ہم سے بحث کرتے ہو۔"

یہہ الفاظ ملا عبدالقادر بدایونی کے ہیں جو اس کی علمیت اور شہرت پر کباب بنا جاتا تھا۔ ابوالفضل کی قابلیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ دارالانشا کا عہدۂ جلیلہ سرفراز کیا گیا جس کی اس نے تسلی بخش خدمت کی۔

اکبر نامہ اور آئینِ اکبری اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ موخرالذکر بجائے خود ایک مکمل کتاب ہے۔ جو اکبر نامہ کے ضمیمہ کے طور پر لکھی گئی ہے۔

مکاتباتِ علامی کے تین دفتر ہیں۔ دفتر اول میں بادشاہ کی طرف سے سلاطین ایران و توران کے نام مراسلات و فرامین ہیں۔ جو امرائے دولت کے لئے جاری ہوتے تھے۔ اس میں الفاظ کے شکوہ، معانی کا انبوہ، فقروں کی چستی۔ مضامین کی بلندی، کلام کی صفائی، سلطنت کے مطالب، ملکی مقاصد۔ اُن کے فلسفی دلائل۔ آیندہ نتائج کی ساری دلیلیں ہیں۔

دفتر دوم میں اپنے خطوط اور مراسلے ہیں۔ جو انہوں نے امراء، واحباب واقربار کے نام لکھے ہیں۔

دفتر سوم میں بعض کتابوں کے دیباچے ہیں۔

کشکول، یہ شیخ کی بیاض کا نام ہے۔ جس میں مختلف کتابوں کے جو اُن کے مطالعہ میں آئیں دلچسپ اور مفید اقتباسات ہیں۔

جامع اللغات۔ لغت کی ایک مختصر کتاب ہے۔

رزم نامہ، مہابھارت کا ترجمہ ہے۔ ساتھ ہی اس کے ایک دیباچہ بھی لکھدیا ہے۔ جس سے اسکی انشاپردازی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان علمی کارناموں کے علاوہ وہ سیاسیات اور معرکہ آرائی دونوں میدانوں میں گوئے سبقت لیگیا۔ جس وقت اس کا دماغ ادبی خدمت کی انجام دہی میں مشغول ہو جاتا تھا تو عبارت کی سیاہی ستاروں میں متبدل ہو جاتی اور ناظرین کلام کے دل ودماغ کو مجلی کر دیتی تھی۔

جس وقت وہ کرسئی وزارت کو زینت دیتا تو دنیا کا زبردست مدبر اور سیاست داں بھی آگے پانی بھرتا۔ جس وقت میدانِ کارزار میں قدم رکھتا رستم واسفندیار کے دل سینوں میں دہل جاتے۔ یہہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعات ومشاہدات ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ کسی کو اس میں کلام نہیں کہ اس میں بہت سی خوبیاں یکجا مجتمع ہو گئی تھیں۔ خدائے سخن وہ تھا۔ سیاست و تدبر کا مجسمہ اس کی ذات تھی۔ اور اس کی ہستی میدان جنگ کیلئے

بھی بنائی گئی تھی۔

تاریخ بہت کم ایسی مثالیں پیش کر سکیں گی جس میں متضاد قابلیتوں کا حامل ایک واحد دماغ ہو۔
جو لوگ انشاء کے میدان میں چکر لگاتے ہیں اُن سے یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ وہ سیاست کے دشوار گذار راستہ میں قدم رکھیں گے۔ اور جو سیاسیات کے نشہ سوار ہوتے ہیں اُن سے ہم کیا امید رکھ سکتے ہیں کہ نپولین کی طرح میدانِ شجاعت میں اپنی بہادری کی داد لیں گے۔ لیکن ابوالفضل ہی کی واحد شخصیت تھی جس میں متذکرہ بالا قابلیتوں کا اجتماع ہو گیا تھا۔ شاید وہ خصوصیات جو اس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوں اپنے لئے باعث فخر خیال کرتی ہوں۔ بھلا حاسد کب اِن قابلیتوں کے پتلہ کو ٹھنڈے دل سے دیکھ سکتے تھے۔

سلیم کے دل کو اس کی مخالفت کی آگ نے بھڑکا دیا۔ اور وہ آگ اسی وقت فرد ہوئی جب ابوالفضل کے خون سے اس کو بجھایا گیا۔

وہ ہستی جو اپنے عنایت فرما شہنشاہ کی طلب پر۔ فرماں برداری کا دم بھرتی ہوئی تیز گامی کیساتھ معہ اپنے چند جانبازوں کے دکن کے دشوار گذار راستہ کو عبور کر رہی تھی۔ سردار بندیلہ کے لشکر سے گھر جاتی ہے۔ ساتھی جان بچا کر بھاگ جانے کی رائے دیتے ہیں۔ لیکن اس کی شجاعت اس بزدلی کے ساتھ جان بچانے سے میدانِ جنگ میں جان بحق ہونا مناسب خیال کرتی ہے۔ آخرکار شدید معرکہ آرائی کے بعد ۱۶۰۲ء میں واصل بحق ہو جاتی ہے۔

زخموں سے خون کی ندیاں بہتی ہوئی اس سمندر میں جا ملتی تھیں جس پر دوسرے جانباز قیامت کی نیند لے رہے تھے۔

اگرچہ اُسے گذرے ہوئے ایک زمانہ ہوا لیکن ابھی تک ہمارے دلوں میں اس کی یاد تازہ ہے اس کی بہادری کا تصور ہمارے کمزور قلوب کو طاقتور بنا دیتا ہے۔

سچ ہے ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

شبرات و آتشبازی

از جناب ابو الضیاء عمر عبد الکریم صاحب گلؔ حیدر آبادی

انقلابِ دہر سے عالم میں ہے اک انتشار
روز لاتا ہے نیا اک دور دورِ روزگار

آج ہم اسرافِ بیجا کو سمجھتے ہیں کرم
ہو گئے افعالِ بد حق میں ہمارے نیک کار

شوق ہی ہمکو تو اک کھیل اور تماشہ کا ہی شوق
مشغلہ ہم کو یہی ہے اور یہی ہے کاروبار

خوب گلچھرے اڑائے آئی جب دم شبرات
چھوڑی آتشبازی اتنی ہو گیا گھر نور بار

اک طرف کچھ ہو چچھندرا اور ڈھیلوں کی تڑپ
اک طرف روشن ہوئے مہتاب و گلریز و انار

فرشی انڈے کی ہیں کیا کیا فرش پر گلریزیاں
چرخ پر پتنگن ہوائی تارہ منڈل کی بہار

وہ پٹاخوں کی تڑاتڑ کی صدائیں دلخراش
کان بہرے ہو گئے اور ہو گیا دل بیقرار

کھل گئی پونجی گرہ سے پھر تو آنکھیں کھل گئیں
جب کمائی جل گئی نکلا ہمیں دل کا بخار

صرفِ بیجا کی بدولت لٹ گئی دولت تمام
ہو گئے مقروض ہم لے لے کے اوروں سے ادہار

جیب خالی ہو گئے اور ہاتھ خالی ہو گئے
ہو چکے قلاش تو پھرنے لگے مستانہ وار

لاکھ ہوں محتاج تو کیا دل ہے سینے میں غنی
مفلسی میں بھی ہے پاس وضع اپنی برقرار

جل گئی ہے بان لیکن تاؤ باقی رہ گیا
اینٹھنا جاتا نہیں گو ہو گیا ہے حالِ زار

بات تو یہ ہے برائی کا نتیجہ ہے برا
اب بلا سے میری اے گلؔ ہو اگر یہ ناگوار

ایک تو شرعی گنہ اور دوسرے نقصانِ مال
تیسرے خلقت میں خفت اور چوتھا دل پہ بار

آخری خط

قدسیہ!

تسلیم۔ اور آخری تسلیم!!

قدسیہ!!! میں اب تمہیں کس طرح "پیاری قدسیہ!" کہہ کر مخاطب کروں؟

آہ! میں اب کیسے تمہیں وہ محبت بھرے الفاظ لکھوں؟ جن کے لکھنے سے ایک مسرت، ایک قلبی سرور حاصل ہوتا تھا۔ وہ محبت کی باتیں لکھنی لاحاصل ہیں؛ تم اب وہ "قدسیہ" نہیں رہیں جو پہلے تھیں۔

یہاں سے جاتے ہی تمہارا رنگ بدل گیا، خیالات تبدیل ہوگئے۔ تم اب میری نہیں رہیں کسی اور کی ہوگئیں؛ کسی کی شیفتہ کسی کی دیوانی۔ لیکن مجھ سے بے اعتنا — میں آئندہ تمہیں کچھ نہ لکھوں گا۔ اور نہ لکھ سکتا ہوں، کیوں کہ میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔

میری روح نکلنے کے لئے تڑپ رہی ہے، میرا دل سوختہ ہوگیا ہے نہ اب طاقت ہے نہ سکت — یہ میرے آخری الفاظ ہیں۔ اور پھر تم اس کے بعد سنوگی کہ:—

"مسعود! — حرماں نصیب مسعود!! — اس دنیا سے چل بسا!"

"قدسیہ!" میں نے اس دو سال کے عرصہ میں کتنے خط لکھے۔ مگر تم نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ:—

"مسعود زندہ ہے کہ مرگیا —؟"

میں نے کس قدر منت سے التجا کی تھی کہ:—

"مجھے بھول نہ جانا — ورنہ میری زندگی برباد ہو جائے گی!"

لیکن تم نے جاتے ہی مجھے فراموش کر دیا۔ راہ امید میں آنکھیں بچھائیں۔ اُف انتظار — اس قدر کیا کہ انتقال کا وقت قریب آگیا، آہ! اب دل مایوس ہوگیا، جگر جل اٹھا، جسم لاغر ہو چلا — میں تمہاری محبت میں برباد ہوا — رسوا ہوا — مگر تم نے کوئی التفات نہ کی۔

"قدسیہ!"

سچ جانو! میں اب بھی تمہاری محبت کا بھوکا ہوں۔ اور اُس وقت تک میری زبان تمہارے نام کی تسبیح خوانی کرے گی، جب تک کہ میری روح نکل نہ جائے!

"قدسیہ!"

میں اب تھوڑی دیر کا مہمان ہوں ––– میں مر رہا ہوں۔ تمام حسرتوں ––– ارمانوں کو۔ لے کر دنیا سے اُٹھ رہا ہوں ––– ہائے میری آرزوؤں کو تم نے مسل ڈالا۔ امیدوں پر پانی پھیر دیا –––'

یہ آخری ––– اور سب سے آخری خط ہے۔ تم جیتے جی میرا نام نہ لینا! اور نہ یاد کرنا ––– میں اس دنیا سے اُکتا گیا ہوں ––– میں ایک بے وفا ––– "ق ––– د ––– س ––– ی ––– ہ" ––– کی محبت کا برباد کردہ ہوں!

فرشتے –––

بلا رہے ہیں اور میں اُن کا منتظر ہوں موت سر پہ کھڑی ہے، جب وہ آئے گی تو میں ایک میٹھی ابدی نیند میں ڈوب جاؤں گا –––'

موت!

آہ پیاری موت! تو آ!! اور مجھے دوسرے جہاں میں لے چل کہ اس بے وفا دنیا سے نجات ملے!

تو مجھے ایک ایسے گوشہ میں چھپا دے جہاں نہ کوئی فاتحہ خواں ہو اور نہ نوحہ خواں –––'

اے شعلہ محبت!

تو میری روح کے ساتھ بھڑک کر، خرمن ہستی کو آگ لگا دینا۔ ہاں۔

اے جنگل کے پتّو!

تم میری راکھ کے تودے کو ڈھانپ کر ہمیشہ اور ہمیشہ کیلئے نظروں سے روپوش کر لینا۔

کیا قدسیہ! وہ دن یاد ہے؟

تو نے کہا "مر" ۔ تو مر گئے ہم! فقط

تمہارا بھولا ہوا

مسعود

(قیس حیدرآبادی)

یادِ دکن

(حکیم الحکما، نواب صحت طلب خاں بہادر شرر حیدرآبادی)

نواب عالی رفاعی نے اپنے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"محمد اکبر خاں نام، اور حکیم الحکما نواب صحت طلب خاں، خطاب، خاندانی طبیب شاہی اطبا میں تھے، لیکن مہاراجہ چندو لال شاداں (دیوان دکن) نے سرکار کی اجازت سے اپنے رفقا میں شریک کرلیا اور پچھلے آبائی منصب کے علاوہ اپنے پاس سے بھی دو سو روپے ماہوار مقرر کردی تھی، راجہ چندو لال شاداں سے کسی بات پر ناراض ہوکر شرر اپنے گھر آگئے، مہاراجہ شاداں نے عذر خواہی کرکے بہت کچھ کوشش کی کہ شرر کا غصہ اتر جائے مگر ان کی نازک طبیعت نے پھر شاداں کے پاس جانا گوارا نہ کیا اور ماہوار بھی واپس کردی تو شاداں نے شرر کے بھائی محمد اصغر خاں المخاطب نواب عافیت طلب خاں، طلب تخلص کو اپنا استادِ سخن بناکر دو سو روپے تنخواہ مقرر کردی اور شرر کی ماہوار بھی اُن کے ہاتھ گھر بھجوا دیا کی"

(اقتباس تذکرۂ قلمی)

نواب عافیت طلب خاں ایک مشہور شخص تھے جن کا مختصر حال اکثر تواریخ دکن میں ملتا ہے یہ بھی بھائی کی طرح نازک مزاج تھے چنانچہ گلزار آصفیہ (ص ۱۱۴۲) میں لکھا ہے کہ "خوش اخلاق ممتاز و درنجی اش مشہور تر است" "تذکرۂ نقش" (قلمی) میں بھی شاعر کی حیثیت سے ان کا حال لکھا ہے:-

طلب تخلص، حکیم عافیت طلب خاں مرحوم، از وست

ہے چشم کے پیالہ میں غضب سرمہ کی رنگت
قاتل یہ طپنچہ ہے شرر بار نگہ کا"

لیکن یہ شعر شرر کے دیوان میں شرر کے نام سے ہے!

اور خود شرر کا حال بھی تذکرۂ نقش میں اس طرح لکھا ہے کہ:-

شرر تخلص، صحت طلب خاں، برادر حکیم عافیت طلب خاں، طلب کہ از کمال نامداران بلد بودند، بلند فکر، خوش طبیعت، اکثر مائل باہاجی ریختہ می بودہ، از وست

منہ ترا دیکھے سو اتن سے نہیں جانے کی روح
یاد میں زلفوں کی اٹکی ہے جو دیوانے کی روح"

مولفِ تذکرہ نے شرر کو "مائل با ہاجی رکیکہ" لکھا ہے، میرے سامنے شرر کا جو دیوان ہے
اُس میں ایک شعر بھی "ہجویہ" نہیں ملتا۔

شرر کے والد کا نام حکیم شفا طلب خاں، بندر سورت کے رہنے والے، مرشد زادہ آفاق، عالی جاہ
(میر احمد علی خاں) خلف حضرت غفراں مآب (آصف جاہ ثانی) کے ہمراہی طبیب، اپنے عہد کے
جملہ حکما میں ممتاز، شعر بھی کہتے تھے، ارسطو جاہ کی مدح میں ان کا ایک قطعہ میری نظر سے
گزرا ہے۔ شرر اپنا تعارف ایک شعر کے ذریعہ اس طرح کراتے ہیں ؎

شرر تخلص ہے جانتے ہیں یہ سار معشوق اور عاشق　　　سراج و پروانہ ساں ہے روشن ہر ایک مجلس میں نام اپنا

"سراج و پروانہ" کے لفظی لطائف ملاحظہ ہوں، شاہ سراج اورنگ آبادی ولی کے معاصر
مشہور شاعر ہیں پروانہ شاہ پروانہ اُن کے شاگرد بھی مرید بھی۔ اُستاد و شاگرد، اور مرشد و مرید
کے مراسم قلبی پر معشوق و عاشق، سراج و پروانہ، روشن و مجلس کے الفاظ متجانسہ سے روشنی ڈالتے
ہوئے شرر نے اپنی مثال پیش کی ہے

شرر کو ریختہ میں میر اسد علی خاں تمنا (حیدر آبادی) سے تلمذ تھا، خان تمنا میر و مرزا کے معاصر تھے
شرر اپنے تلمذ کا اشعار میں صاف صاف اقرار کرتے ہیں ؎

کہنے لگا ہوں ریختہ اُن کی صلاح سے　　　فیضِ سخن ہے مجھ کو تمنا سے اے شررؔ

ریختہ خانِ تمنا سے بنا نا سیکھا　　　ای شررؔ شعر کے کہنے کا ہوا دل کو شوق

حضرت خانِ تمنا ہی سے اشعار کے ڈھب　　　ای شررؔ ملکِ دکن سے ہے مروج تا ہند

شعر و شاعری کی عظمت، لوازم شعر کی ضرورت اور آداب شہرت پر، شرر کی شرر فشانیاں
دیکھنے کے قابل ہیں ؎

جیسے سحر سامری کی دھوم ہے　　　جگ میں شعر و شاعری کی دھوم ہے

شاعری کو نقص ہے لیوے جو عالم کی صلاح　　　ایک ہو اُستاد کامل جس کے ہوں شاگرد لاکھ

ہم نے اپنے شعر پر ہر آن، ہر دم کی صلاح　　　ہر گھڑی، ہر آن لازم ہے شررؔ غور سخن

اشعار جمع کیجے دیوان کے برابر　　　تحریر میں سخن کی دل ہے شررؔ پریشاں

کرے ہے صرف تو بے جا شررؔ دماغ افسوس　　　کوئی جہاں میں سمجھتا نہیں سخن کی قدر

شررؔ مشہور عالم میں ترے اشعار ہوتے ہیں　　　بناتا ہے زباں سے تو مزے کی کچھ عجب باتیں

حیدر آباد دکن کی وطنیت اور اس کے باشندوں کی چہل پہل کو شرر دیکھتے ہیں اور ضبط نظم

مجلۂ مکتبہ

کرتے ہیں ۔

آئنے لوگ یسے شہر کہن میں چل کر　　حیدرآبادی کرتے ہیں صفت پیر و جواں

اس شہر پہ کشمیر اور کابل نثار　　کیجئے، حیدرآبادی مغل بچے بسنتی پوش ہیں

شرر کا زمانہ گو مہاراجہ شاداں (وفات ۱۲۶۱ھ) کے دور سے تعلق رکھتا ہے لیکن شرر نے اپنے جن معاصرین کا ذکر کیا ہے ان میں کے اکثر "دربار شاداں" سے پہلے ہی گذر چکے ہیں۔ ان میں بعض شرر کے دوست تھے اور بعض اُستاد بھائی اور یہ دور بارھویں صدی کا نصف آخر تھا، اس اعتبار سے یہ رائے قائم کرنی پڑے گی کہ مہاراجہ شاداں کا دورِ شرر کا بالکل آخری زمانہ ہوگا۔ معاصرین میں صرف شرر نے شوق، مہر اور ایمان کا ذکر کیا ہے ۔

"ہے تجھ کو مے کشی کے سوا کام اور بھی؟"　　اس شوخ بادہ خوار سے پوچھا میں ایک روز

"ساقی! نشہ میں چور ہیں اک جام اور بھی"　　کہنے لگا یہ قال ہی اپنا بقول شوق

"دیوانے! مبارک ہو زنجیر بہار آئی"　　پابند کیا دل کو یہ مہر کے مصرع نے

دوستو لے کے یہ اشعار چلا آتا ہے　　واسطے حضرت ایمان کے جلسہ میں شرر

شوق (غالباً) ان کے اُستاد بھائی، محمد علی نام، اورنگ آباد وطن، جنھوں نے ۱۲۱۲ھ میں میر امن دہلوی کی (باغ و بہار ۱۲۱۸ (چہار درویش) سے پہلے اس کے مشہور قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ جس کا ایک مکمل نسخہ میرے پاس بھی ہے رسالۂ تاج حیدرآباد جلد (۳) نمبر ۲ بابتہ تیر ۱۳۳۴ف میں بھی اس پر مضمون چھپ چکا ہے۔

(۲) مہر علی شاہ مہر، ان کے والد حضرت آصف جاہ اول کے ساتھ دہلی سے دکن آئے، اور فتح دکن کے بعد اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے۔ مہر تبدیل لباس کر کے اپنے مرشد کی قبر پر بیٹھ گئے۔ شرر کے اُستاد حضرت تمنا کے ہم مکتب ہونے کے علاوہ روحانی اختلاط بھی رکھتے تھے (تذکرۂ تمنا قلمی و چمنستان شعرا ص ۳۰۲)

(۳) ایمان، شیر محمد خاں نام، دکن کے مشہور اُستاد، مجلہ مکتبہ جلد (۱) نمبر (۱ تا ۶) میں بادۂ دکن کے عنوان سے ان کے حالات اور کلام کا انتخاب چھپ چکا ہے۔

اب شرر کے حالات و واقعات معلوم کرنے کا ذریعہ اُن کے کلام کے مطالعہ کے سوا کوئی اور میسر علم میں نہ آسکا۔ زیادہ سے زیادہ اور مطالعہ کلام سے اُن کے معتقدات مذہبی کا اندازہ اشعار ذیل سے کیا جا سکتا ہے ۔

فلک پر مہر تیرے یا علی ہی سوز سے روشن — مہ نو پر ہی تیرا عکس تیرے نعل دلدل کا

صدقے نبی پہ جان، علی پر نثار دل — دونوں جہاں میں تجھ کو شرر آسرا ملا

اے نسیم بہار خاک شرر — روضۂ بوتراب تک پہنچا

یا مرتضیٰ علی ہے پریشاں شرر غلام — تم کردو اپنے بندۂ احقر کا بند و بست

پنجتن کے فضل سے امید ہے — اے شرر! آسان ہو مشکل کی بات

علی کا نام ہر اک دم میں لیجئے سو بار — ہمیشہ کیجئے ایسے امام کی تسبیح

اے شرر! دل میں ہی عشق پنجتن — ریختہ میں پانچ ہی ابیات بس!

اے شرر! ہو تی وہاں دل کی پذیرا التماس — بھیجتا ہوں لکھ کے عرضی شاہ مرداں کی طرف

کچھ نہیں رکھتا تعلق، اس جہاں کا اے شررا — کام میرا ہی سدا وصف شہ مرداں کروں

شرر! بندہ ہوں جان و دل سے احمد و محمد کا — غلام شاہ مرداں خانہ زاد آل اطہر ہوں

ہی شرر بہت پریشان لو خبر شتاب اس کی — کروں کس سے عرض میں بجز شہ ذوالفقار تجھ بن

ہی دل میں شرر میرے شب و روز تمنا — جا کر نجف میں حیدر کرار کو دیکھوں

ہی ورد زباں مجھ کو شرر نام علیؑ کا — گر دیو مرے روبرو آوے تو ہٹا دوں

شرر کا دیوان نواب عالی رفاعی (معتمد انجمن ارباب اردو) کے کتب خانہ میں موجود ہی اور یہ انتخاب اسی سے منقول ہی۔

عمر یافعی

نکتہ محیط ہی۔ فہم خاص و عام کا — ہر حرف ہی نشان ہی اللہ کے نام کا

مسطور راہ نعت ہی اور آفتاب جیسے — یہ دید صبح کی وہ تماشا ہی شام کا

دروازہ دل کا الفت اصحاب سے کھلا — رستہ یہی ہی عشق کے دار السلام کا

یا فاطمہ حسین و حسن بندہ ہی شرر — ہو دو جہاں میں نام تمہارے غلام کا

ساقی اب حشر تلک دل ہی داغ مینا — تا قیامت رہے روشن یہ چراغ مینا

درد دل ظالم ہی تو کس نے ورد کا — حال تیرا کیجیے جیسا چور کا

کس نے دیکھا ہی مثل مشہور ہے — ناچ گر جنگل میں ہوئے مور کا

اس قدر غفلت شرر کیا کام کی — خوف اب کچھ بھی تجھے ہی گور کا

ہم نے تو باطن کی آئینہ سا صفا کیا — اے بدگماں تیرے دل ہی غبار نکلا

رات دن کی یہ مصیبت کیسے خوش آئی ہے — زلف و رخسار کا ماحق میں گرفتار ہوا

ناحق جو تو نے پیچ میں دل کو پھنسا دیا — اے زلف بول ہم نے ترا کیا بگاڑ دیا

دو روز بھی نہیں جان تجھے درد کی قدر — ہی قیامت دل بیمار کی توبہ تلا

ریختہ لکھ دیا اک یار کی خاطر سے شرر — عقل کرتے رہی اغیار کی توبہ تلا

بزنگ زر گر شرر میں ہر آن ملکے کانے میں ان کو — مزاج دلبر کی ہو رہی ہی گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ

ایک شب گھر مرے آتا نہیں وہ خانہ خراب — کوچۂ غیر میں جس روز سے جانا دیکھا

اے دشمن جاں تری دوستی کو — صد آفریں مرحبا واہ دیکھا

دل گیا ہی کدھر نہیں آتا — اس کی کوئی بے خبر نہیں آتا

جس طرف دیکھتا ہوں کرکے نگاہ — تجھ سوا کوئی نظر نہیں آتا

چاک کو دل کے جو کرے ہی رفو — وہ نظر بخیہ گر نہیں آتا

جب سرک گئی رخ سے تیرے شام زلف اے نگار — صبح ہو گئی دن نکل آیا اجالا ہو گیا

آہ آتش بن گئی اور اشک تارا ہو گیا   بیقراری سے دل صد چاک پارا ہو گیا

زندگانی میں چکھا ہی موت کا جس نے مزا   اے شرر اس شخص کا مرنا گوارا ہو گیا

مجھ کو سوائے پند کے کچھ سوجھتا نہیں   آنکھوں میں پھر رہا ہی مرا یار ناصحا

بیزار ہی شرر ترے اس غلط و پند سے   چل سامنے سے دور ہو تو اے ناصحا

یہ جیسی صورت تمہاری دیکھی وہ نہ یہ جیسا اے یار دیکھا

نہ ایسا غنچہ کا رنگ دیکھا نہ ایسی گل کی بہار دیکھا

ہیں صدقے یاقوت ان لبوں پر ہیں موتی دندان پہ تیرے قربان

چمک نے الماس میں تو دیکھی نہ لعل یوں آب دار دیکھا

شرر ان کا خون کے عشق میں سوا ہوتی   کہ تیرے تنگ ڈھنگ اب دیکھ کر کنّے ہیں عاشق

شراب عشق کے پینے سے داغ گرم ہوا   کہ جیسا تیل سے روشن چراغ گرم ہوا

ہزار شکر اے بلبل خزاں کو آگ لگی   بہار آتش گل سے یہ باغ گرم ہوا

اشک سے پوچھنے ملنے کی رسائی ہے   تارے افلاک کے اک آن میں شب گن آیا

وہ غنچہ لب ہوا ہی ہم آغوش باغ میں   اللہ نے شگفتہ گل مدعا کیا

اس بیوفا کو کیوں دیا اس دل کا اختیار   کرنا نہ تھا یہ کام شرر تو نے کیا کیا

یہ دل صد چاک اتوں کو خیال خم آیا   زلف کے کوچہ میں تیرے مثل شانہ بہر گیا

ہمیشہ شام و سحر دل میں چھوتے ہیں   چلا ہی جاتا ہے یہ دل کا روز و شب چھولا

ہے بندہ لطف فراموش کا فی نعمت   کرم ہے یاد تمہارا شرر نہیں بھولا

میں مروں ہجر میں در دل میں ترے کینہ تھا   پر بامید وصال اور مجھے جینا تھا

ساقیا ہم تری الفت کی یہ پیتے میں آ   تو اگر زہر بھی دیتا تو ہمیں پینا تھا

نسیم جا کر چمن میں کہیو تو بلبلوں کو سلام میرا

در و دیوار پڑھتا ہوں رو گل پہ یہی قفس میں ہے کام میرا

ہمیشہ مخمور و مست ہوں میں ہے خواب میں بھی خیال ساقی

شراب الفت خمیر شیشہ یہ دیدۂ تر ہے جام میرا

بنا گیا ہوں عمارت بے ستون سخن کی میں وہ ہوں خسرو

زبان تیشہ ہے کوہکن دل دہن ہے شیریں کلام میرا

شرر تخلص ہو جانتے ہیں یہ سارے معشوق اور عاشق

سراج پروانہ سان ہے روشن ہر ایک مجلس میں نام میرا

جب سے دیکھا ہوں میں چال ترا   ہو گیا عاشق کمال ترا

ڈھیر پر عاشق کے تجھ کو ڈالنا لازم ہے پھول

تربت پروانہ پر اے شمع روشن گل چڑھا

صد شکر میرے دل کا سہی عا ملا   دلبر ملا و جان ملا دلربا ملا

خود بیں ہے خود پسند ہے خود رائے خود مزاج   آئینہ رو ملا یہ عجب خود نما ملا

شمشاد و فاختہ سے ملے بلبلوں سے گل   پر مجھ سے تو نہ ہائے رے وہ بیوفا ملا

تری ہر ستم کو میں کیا نہ کہوں نہ جفا ہی کیا نہ وفا ہی کیا

تجھے کون کہتے کہ برا ہے کیا یہ جو تو نے کیا سو بھلا ہی کیا

اس دہر کے گلشن میں یہ رنگ نظر آیا

جو غنچہ نظر آیا دل تنگ نظر آیا

واں کچھ نہ نظر آیا جہاں قصر فریدوں تھا

یا خاک نظر آئی یا تنگ نظر آیا

نامہ بر کہیو یاں کہ بامید وصال   شرح الفت کا لکھا یا ہوا مکتوب رہا

پردۂ زلف کو چہرے سے اٹھایا نہ کبھو   اس قدر شام و سحر سے وہ محجوب رہا

عشق میں ایک ہی حالت پہ نہیں حال کبھو   کبھو سالک رہا یاد اور کبھو مجذوب رہا

آہ کا شعلہ تا بتا پہنچا   یہ دھواں آفتاب تک پہنچا

چشم بینائی اس نے پیدا کی   جو کہ قطرہ حباب تک پہنچا

جس نے دیکھا وہ دیدۂ بیدار   نہ خیال اس کا خواب تک پہنچا

گرمی سے آہ کی شرر آنسو بھی خشک ہے   نالے نے اشک دیدۂ غماز کی پی گئی

یہ وہ خیال دختر زر ہی کہ خواب میں   زاہد کو گھر سے آ در میخانہ لے گیا

جس نے مزے سے بادہ کشی کے ہو بار کا   وہ خط شیشہ لذت پیمانہ لے گیا

اس شمع رو کے حسن کا عاشق ہوں اے شرر   دل کو مرے بنا کے جو پروانہ لے گیا

کیفیت آہ میں لب گلگوں کی کیا کہو   اس سبز خط کو دیکھ کے دل داغ ہی رہا

گل جل گیا ہی آتش رخسار سے ترے غنچہ دہن کو دیکھ کے دل تنگ ہی رہا

میخانہ ہوئے قفس ہو یا سیر باغ ہو جس جا بے تو رہا تو وہاں ننگ ہی رہا

جس دم کیا خیال تھا نزدیک ہی مرے گو مجھ سے دور تو کئی فرسنگ ہی رہا

کئے سب سے آشنائی کوئی آشنا نہ پایا اس بیوفا جہاں میں کوئی باوفا نہ پایا

ایسی ہی کچھ کدورت عالم میں ہم نے دیکھا آئینہ کے بھی دل میں رنگ صفا نہ پایا

مہر و تیر افلاک پہ ہی شام و سحر داغ کیا حسن کا غرور ہی اللہ روز و شب

انے ماہ بر تو یار کے کوچہ سے جلد پھر میں دیکھتا رہوں گا تری راہ روز و شب

نیکوں کے نام سے تجھے از بس کہ ننگ ہے ہمراہ تیرے رہتے ہیں بد خواہ روز و شب

اُس لعل رخ کا ہوں میں گرفتار روز و شب شام و سحر سے ہی مجھے تکرار روز و شب

دیکھا تھا میں وہ طرۂ دستار آپ نے آنسو مرے گلے کے ہیں ہار روز و شب

بلبل مجھے اب گل سے اور خار سے کیا مطلب گلرو کا دیوانہ ہوں گلزار سے کیا مطلب

اس کفر اور ایمان کے کر قطع تو رشتہ کو تسبیح سے کیا مطلب زنار سے کیا مطلب

تم جھوٹ کہو پر ہم سچ اسکو سمجھتے ہیں تقریر سے کیا کام اور تکرار سے کیا مطلب

جس جا وہ شرر ہو دل اپنے سے وہیں جا کر اُس یار سے مطلب ہی اغیار سے کیا مطلب

یہ تواضع میں جھکے وہ بسلام و تسلیم شیشہ ساغر کا کرے ساقی کا میخوار ادب

شیخ کے تن پہ سراپا ہی ادب کی پوشاک جبہ ہی شکل ادب صورت دستار ادب

راز دل کا اے شرر ہوئے ظاہر کیونکہ آہ جاں سوز ادب دیدۂ خونبار ادب

فصل گل آخر ہوئی پھرتی ہے گریاں عندلیب ہے خزاں کے ہاتھ سے کس طرح نالاں عندلیب

کس کی خونی آنکھ سے یہ تختۂ لالہ ہے سرخ سبز کس کی چشم سے ہے یہ خیابان عندلیب

اب چمن میں حسرت گل کی جگہ ہیں خار ہا باغ و بستاں میں مگر تھی سیر یاراں عندلیب

لکھے ہی کیا مری قسمت میں ہجر آہ نصیب نصیب وصل اگر ہو تو واہ واہ نصیب

یہ دل کو اس نگہ لطف کی تمنا ہے کرم کی چشم سے مجھ پر کرے نگاہ نصیب

قلم سے کاتب قدرت نے جو لکھا سو لکھا نہ سر براہ خرد ہی نہ رو براہ نصیب

اور کیا ہی کہے ساقی اس سے بہتر خوب ہے مئی ہو پینے کیلئے آغوش میں محبوب خوب

[illegible] جو گلرو تو ایک بار شراب ہزار رنگ کی لاؤں ہزار بار شراب

شراب فرحت دل ہی شراب راحت جاں شراب دوست ہے دلبر شراب یار شراب

مجھے چمن میں کہا ایک دن گلرو نے لے آ شراب جو خوشبو ہو خوشگوار شراب

یہ بات سنتے ہی میخانہ کی طرف پہنچا کیا خرید وہاں جا کے بے شمار شراب

شراب لا کے کیا عرض اسکی خدمت میں نہ بھولے جو پئے یہ ہی یادگار شراب

نیند آتی ہی مجھے دام تصور میں ترے ہی خیال زلف تیرا رات کو زنجیر خواب

ہر سخن رمز کنایہ ہی ہر اک بات ٹھٹول ہم سمجھتے ہیں تری شوخی گفتار کو سب

رنگ دیکھا اس زمانہ کا شرر ہے نظر میں کیا فراز اور کیا نشیب

ہی تعجب ہی تعجب اس چمن میں دہر کے گل عجب بلبل عجب غنچہ عجب نکہت عجیب

بے سبب دشت میں رہتا نہیں لیلی مجنوں اپنے ویرانہ کو کرتا ہی یہ آباد غریب

اُس نے کیا عشق کی لذت کا مزا دیکھا آہ جان شیریں سے گذر ہی گیا فرہاد غریب

اُس لب و رخ کے سامنے کیا آئے آفتاب شرما کے بلکہ ابر میں چھپ جائے آفتاب

دیکھے جو اسکے چہرہ انور کی اک جھلک بے ہوش ہو کے گر پڑے غش کھائے آفتاب

جذب کر اتنا تو شرر آہ دل بیتاب شتاب جس طرح آگ پہ اڑ جاتی ہی سیماب شتاب

باغ ہی سیر ہی اور ابر و ہوا موسم گل بول ساقی کو شرر لائے مئے ناب شتاب

میں اس شمشاد قد کو ایکدن تجھکو دکھا دونگا بہت مغرور ہے تو باغ میں سرو چمن جب تب

دام سے زلفوں کے ہو مرغ دل آزاد کب چھوڑ دیتا ہی پکڑ کر صید کو صیاد کب

بھول جانا پھر مکرنا ہی تری وضع کہن بات رہتی ہے فراموشی سے تجھکو یاد کب

اسکا نے کیا داد چاہی دل کی کہہ سکتے نہ آہ روبرو تیرے مرے نالے کی فریاد کب

اب تو میرا آتش فرقت سے دل جلتا ہے آہ اے شرر آتا ہے دیکھیں وہ ستم ایجاد کب

جلے دل کے آنسو چھلکتے ہیں چشم ہے یاقوت میں آگ گوہر میں آب

نذر کر دے جان تجھے ہیں نہ بد اتفاق مہر سے دل کو کر دلے مہ اخلاق طلب

جس کو کیا اسیر نہ چھوٹا وہ قید سے ہے کس بلا کا زلف معنبر کا بند و بست

وہ صنم کی ادا کے نثار ہوں میں کہوں کیا بت ہوش ربا کی صفت

وہ خدا کی قسم ہے خدا کی صفت وہ خدا کی قسم ہی خدا کی صفت

. . . .

آگ لگ جاوے رقیبوں کے دلوں کو مثل شمع گر کہوں آ شعلہ رو اس جان جاں کی حدیث

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

پھنسا دام میں عشق کے آہ یہ دل ترا دیکھ کے حسن دیوانہ ہوا
تری چشم سیاہ ہے سحر نگہ تری زلف رسا ہے بلا کی صفت
ہے یہ داغ کی اور یہ دل کی صفت مری آہ شرر کے اثر کی صفت
نہ چمن کی صفت نہ گلوں کی صفت نہ گل کی صفت نہ صبا کی صفت
جو تجھے چاہیے اے دل سو جہاں میں لے یہی بازار میں بازار ہے اور ہاٹ میں ہاٹ

. . . .

گل ہنسے غنچہ تبسم میں رہے کیا سیر ہے روتی شبنم اور کرتی فریاد ہے بلبل کو بہ آت
آ دیکھ لے اے شیخ خرابات کی صورت ہے گل کرشمہ کی کرامات کی صورت
جب آئیں تصور کا ترے کھینچوں ہوں نقشہ نالے بھی نہ کھینچے یہ خیالات کی صورت
اے اشک ترے ہاتھ سے ہم مر گئے بھلا گو جان بھی تو لے ہی تو لے آبرو کے ساتھ
اے سرو خراماں ترا قامت ہے قیامت رفتار تری آہ قیامت ہے قیامت
آنکھوں کی نمی اور نہ چھپے چہرے کی زردی یہ عشق کی اب میر علامت ہے قیامت
آنکھوں نے کیا ہے تری بیمار محبت لیویگا مری جان یہ آزار محبت
عشق میں دل کے پھنسانے کے ہیں سامان بہت شوخ کافر ہیں کئے زلف پریشان بہت
گر ہے دل لینے کا ارمان تمہیں ہی میرے لو یہ حاضر ہے نہیں تم سے مری جان بہت
اے دل مژہ کے تیر کا ہے امتحان سخت ہے اس سپاہی زادے کی ابرو کمان سخت
جاتا نہیں ہے جی یہ مرے تن سے تجھ بغیر دل آہ سخت ہے کہ مری آہ جان سخت
مچ رہی ہے جا بجا دیوانوں کی دھوم کون سنتا ہے کوئی عاقل کی بات
دیوانہ جامہ زیبوں کا ہوں میں گلشن سے نہیں کیا مجھے صحرا سے کیا اور کوہ کے دامن سے نسبت کیا
نظر کر چشم کے پردے کے اندر کون بیٹھا ہے نہیں معلوم اے دل جان کو ہے تن سے نسبت کیا
نہیں بنتا ہے تشبیہ اس کو اے شمس ہرگز ضیائے مہر کو نور دل روشن سے نسبت کیا
کیا کہوں اس منہ سے اپنے وصل جاناں کی حدیث کب وہ سنتا ہے ہمارا حال ہجراں کی حدیث

پان سے منھ سرخ ہی ہے چشم اور مہندی سے ہاتھ لعل یاقوت شفق صد ہیں یہ لالی آج
اے شرر یہ بیت جب گاتا ہے وہ مطرب پسر وجد آتا ہے مجھے اس مصرع حالی پہ آج

کی پست سیل اشک نے قدر بلند موج پہنچی ہے یہ زمیں سے فلک تک کمند موج
آنسو کی بوند ٹپکے جو عاشق کی آنکھ سے اک قطرہ اشک کا کرے کار دو چند موج
آتا ہے باغ میں وہ صبا او بہار آج بلبل ہو صدقے غنچہ فدا گل نثار آج
اے دل تڑپ رہا ہے کس ابرو کماں پہ تو ہے تیر نگہ کا کس کے ہوا ہے شکار آج
کر اشک و لخت دل کو مسلسل اے چشم تر گجرے ہو موتیوں کے جواہر کے ہار آج
کل جس گلی میں عدو نالاں تھا اے شرر جو دل رہا اس کے کوچہ میں چل اشکبار آج
ہے قدیم آپ کے وطن کی سج یا غریبوں پہ بانکپن کی سج
سرخ دوپٹہ منہ پہ کھلتی ہے بن گئی اور ہی چمن کی سج
تو محبت کا ایک پتلہ ہے ہے تری زور سحر و فن کی سج
بندہ بے زر ہوں اس کا اے شرر ہے سجیلی وہ سیم تن کی سج
جو ڑکے ہیں دل کے داغوں کے بیچ یہ شعلے نہیں ہیں چراغوں کے بیچ
شب و روز ہے مجھ کو دل کی تلاش میں گم ہوں اسی کے سراغوں کے بیچ
شرر ہم ہیں دیوانہ گلرخاں بہاروں میں رہتے ہیں باغوں کے بیچ
اے طبیبو عشق کے بیمار کا کیا ہے علاج اس محبت کے کہو آزار کا کیا ہے علاج
بے طرح یہ دل مرا بسمل ہوا ہے اے شرر زخم تیغ ابروے خمدار کا کیا ہے علاج
شعلہ رویوں نے لگائی دل بیتاب کو آنچ دے کہیں کوئی جس طرح سے سیماب کو آنچ
مری جان زلفوں سے تو پوچھنے مرے دل کے حال پریشاں کی شرح
مجھے یاد ہے درس علم جنوں مرے ہاتھ میں ہے گریباں کی شرح
گلی کو تو نے گلستاں بنا دیا قاتل لہولہان کوئی بسمل پڑا ہے کوئی مذبوح
اشک کے تارے ہیں روشن آج دیکھ ہے بجا گر کہئے چشم تر کو چرخ
اشک و لخت دل کو میرے دیکھ چشم لعل کو گردش ہے اور گوہر کو چرخ
افشاں رخ پہ لب پہ مسی پان سے ہے لال ہے یہ عجب سنگار سیاہ و سفید و سرخ

کس کو ہے لعل و نیلم و الماس کی ہوس — پتھر ہیں بے شمار سیاہ و سفید و سرخ

ہو گئی سب ہنر کی بے ہنری — عیب ظاہر ہوا کمال کے بعد

اے شرر پہلے سن لے پھر کچھ کہہ — ہے جواب سخن سوال کے بعد

جب نکلتا ہے عرق آلودہ وہ خورشید رو — تارے چھپ جاتے ہیں اور بے نور ہو جاتا ہے چاند

تم رہو گلشن میں خرم بلبلو آباد و شاد — اپنے ویرانہ میں ہم ہیں مرغ باغ آباد و شاد

نکل ہی آئے ہے منہ پر جو بات دل میں ہو — دہن میں غنچہ کے کب تک رہے نہاں فریاد

حرام ہو گئی حق میں مرے شراب کی بوند — گلے اتری ترے بن صنم یہ آب کی بوند

شربت وصل کی ہے دل کو تمنا اے شرر — ہاتھ سے یار کے ہے زہر کا بھی جام لذیذ

ہزاروں نامہ بر اس راہ میں ہوئے ہیں قتیل — پڑے ہیں شہر سے لے کو مینار تک کاغذ

روبرو زاہد تو آ سکتا نہیں ہے خوف سے — اس قدر غصہ ہے اس بنت العنب کا اک پر

تو نظر آئے تو آرام نظر آتا ہے — ورنہ دل کو کہیں آتا نہیں آرام نظر

کچھ آہ کا معلوم ہوا دل پہ اثر پھر — گرتے ہیں مری چشم سے اب لخت جگر پھر

سب مسافر ہیں اس جہاں میں شرر — یاں کسی کو نہیں وطن کی خبر

زلف کی کالی گھٹا نظروں میں پھرتی ہے مگر — چھا گیا خانۂ دل کے در و دیوار پہ ابر

داغ دل سے تو مرے آفت نہیں اتنی عید — یہ تماشا اور ہے سیر اور ہے گلزار اور

تھامتا ہوں اے شرر ہر چند جوش اشک کو — آگ کا برسائے ہے مینہ آہ آتش بار اور

اپنے گھر میں تو مجھے ملتا نہیں — لکھ کے جاتا ہوں در و دیوار پر

آہ نکلی ہے کلیجا چیر کر — دل پہ اس ظالم کے کچھ تاثیر کر

باغ میں دیکھے اگر تجھ کو تو ہو بلبل نثار — رخ پہ تیرے گل ہو صدقے زلف پر سنبل نثار

میر سے ہیں مینائے دل پر تیرے جام چشم پر — ساغر لبریز قرباں شیشۂ پر مل نثار

ہے فدا اس داغ دل پر اے شرر باغ و بہار — لالۂ گلزار صدقے غنچہ قرباں گل نثار

رخ اصفر عاشق کے ہے یوں تیر اشک خون — کوئی سرخی سے جیسا خط لکھے ہے زرد کاغذ

آج اے یار کریں سیر چمن میں چل کر — مے پئیں خوب سی انگور کی بن میں چل کر

گل وہی خار آ گیا سے دل میں خلش ہنوز — اس آتش جگر کی ہے ہے تپش ہنوز

نہ ساقی شیشۂ مے تو مجھے دکھا لبریز — شراب عشق سے ہے جام دل مرا لبریز

جو دیکھے ساقی تری چشم کو تو ہو کے مست — زمیں پہ پھینک دے ساغر شراب کا لبریز

چشم تر کیوں نہ ہو آنسو کا میرے تار دراز — ہجر کا روز ہے سخت اور شب تار دراز

شربت وصل سوا دل کا علاج اور نہیں — ہو گیا ہجر کے بیمار کا آزار دراز

مست ہے جام محبت سے شرر روز و شب — عمر ہو تیری اے ساقی میخوار دراز

ہو جائے جدا بندہ گر بندگی حق سے — لیکن نہ جدا ہووے بندے سے خدا ہرگز

ہمسایہ ترے زلف کا دل چھوڑتا نہیں — رہتا ہے یہ دیوانہ ہمیشہ بلا کے پاس

آرزو ہے ایک ہی سرو رواں — دل رہے قدموں کے تیرے رات بس

کر دیا مستوں کے تئیں خانہ خراب — دختر رز ہے عجب بد ذات بس

بن ترے مارے ہی قاتل مر گئے — کھینچ مت تلوار رکھ لے ہاتھ بس

ہو گیا عکس جبیں کافر ترا پانی پہ نقش — موج کا قشقہ ہے زنار کی بیتابی پہ نقش

اے شرر دھو ڈال دل سے خانۂ غفلت کی مشق — تو نے ساری عمر کھینچا لوح نادانی پہ نقش

ورق پہ دل کے لکھ رکھتے ہیں باتیں — سخن کرتے نہیں عاقل فراموش

شرر کو یاد ہے ہر دم یہ مصرع — "فراموشی شدہ از دل فراموش"

دست رنگیں کو جو دیکھے نظر بد سے ترے — آگ تلوؤں سے لگا دیجے حنائی آتش

تیر سخن جگر میں چبھے ہے چھری کی طرح — دل سے کہے ہے بات نئی دم بدم تراش

اپنا نیا ہے سب سے شرر قافیہ کا طور — کرتے ہیں ہر ردیف میں اک تازہ ہم تراش

دوستی پر ہر کسی کی مت شرر کر اعتبار — ہم نے دیکھا ہے بہت سے آشنائے خود غرض

آنکھوں میں ہے تصویر کھنچی عارض خط کی — ہے دل پہ مرے نقش و نگار خط عارض

کیا بہار حسن کی تائید کو آیا ہے خط — دیکھ کر عارض کی سرخی سبز ہو جاتا ہے خط

جب تو چمن میں ہو تو نظر آئے کچھ بہار — تجھ بن کروں میں سیر گلستاں نہیں ہے حظ

کیا ہی آپ کے بانکے سلام نے مخلوط — اکڑ نے بل نے لٹک نے خرام نے مخلوط

کرے ہے دیدۂ تر کو تو آج کا لحاظ — نہیں ہے اشک تجھے آبرو کا لحاظ

نہیں ہے یار کا غصہ شرر کم آتش سے — ہمیشہ کرتا ہوں اس شوخ شعلہ خو کا لحاظ

ویسی صورت بھی کہیں دیکھی ہے بلبل تو نے — خون حسرت گل ہے اور شاخ جگر کا ہے داغ

کالی گھٹا چمن پہ ابھی آئے جھوم کر — گر رخ پہ اپنے کھول دے وہ نوبہار زلف

یہ تیری صورت پہ سرو قد ہو دل ایک جاں سے ہزار قرباں

نثار گل ہیں ہیں صدقے غنچے، فدا ہی لالہ، بہار قرباں

شرر کو ہی ورد نام احمد احد بلا میم حق ہو احمد

ہیں جان و دل تم پہ یا محمد ہمیشہ لیل و نہار قرباں

مجلس میں یار شمع شبستاں کو گل کرا دوں   تعریف تیرے رخ کی پڑھا مہ کو گھٹا دوں

دنداں و لب یار جو بد نظری سے دیکھیں   الماس کھلا دوں انھیں اور زہر چکھا دوں

مختار جو اس حق کے خزانہ پہ ہو بندہ   جب چاند ہو غرہ ہی کو تنخواہ بٹا دوں

گرا ہی عشق کی جا کر دل دیوانہ آتش میں   سمندر کی طرح ظالم کیا کاشانہ آتش میں

مزا ہی آگ میں الفت کی جلنا شمع سے پوچھو   جلے ہی بے تحاشا کس لیے پروانہ آتش میں

زباں نکلی رہی نہ اس کی نہ پا تو نکلا نہ ہاتھ نکلا

ٹھہرتی جس کی ہی بوٹی بوٹی قیامت آنکھیں مٹکا رہی ہیں

اثر ملک ای شرر کسی دن نہ ایک نالہ ہمارا پہنچا

خدا ہی جانے کدھر یہ راتوں کو اپنی آہیں بھٹک رہی ہیں

چھپے جو رہتے ہیں شرم و حیا کے پردہ میں   وہ اپنے گھر میں پڑے بے حجاب پھرتے ہیں

دھڑی مسی کی ہونٹوں پر نہیں جمتی یاں اکثر نکلی ہے   یہ افسوں گر ہیں کافر لعل کو نیلم بناتے ہیں

لعل اپنے رنگ میں یاقوت و گوہر رنگ میں   رنگ تیرا مجھ کو آتا ہی نظر ہر رنگ میں

فصل گل آتی ہی بلبل یہ خبر ہی کہ نہیں   آتش گل سے ترا سوختہ گھر ہی کہ نہیں

کوئی جاتا نہیں گھر و کی گلی تک قاصد   ای صبا اس جگہ تیرا بھی گذر ہی کہ نہیں

شعلہ رو کیا کہوں میں آتش الفت سے تری   دیکھ لے دل مرا جل جل کے شرر ہی کہ نہیں

سر لگا دیں ابروے خم دار سے ایسے بھی ہیں   منہ نہ پھیریں جو دم تلوار سے ایسے بھی ہیں

آرزو رکھتے نہیں ہیں ابر گوہر بار کی   خوش ہیں اپنے اشک چشم زار سے ایسے بھی ہیں

منحصر دنیا کا ہی سب سیم و زر پر کاروبار   بے غرض ہیں ہم و دنیا دار سے ایسے بھی ہیں

ای شرر کر دیں گل و گلزار کوے یار کو   اشک تیر دیدہ خونبار سے ایسے بھی ہیں

بہار رخ کے دیوانے گلستاں کیا سمجھتے ہیں   ترے آزاد قد کے سرو بستاں کیا سمجھتے ہیں

نہ کعبہ کی ہوس ان کو نہ بت خانے کی خواہش ہے   تری الفت کے بندے کفر و ایماں کیا سمجھتے ہیں

یہ گل ہنستے ہیں بلبل او غنچے مسکراتے ہیں   بہار بوستان روے خنداں کیا سمجھتے ہیں

شرر باتیں ہیں سب ان شاعروں کی گوہر معنی   سخن کی قدر یہ ناقدرداں کیا سمجھتے ہیں

ای شرر تیرے مقابل شعر میں سبقت نہ ہو   یہ سخن تیری زباں کے کاٹتے تلوار ہیں

میے گلگوں نہیں دیتا ہی ساقی بادہ خواروں کو   پلاتا ہی شراب خون دل ساغر میں یاروں کو

جلیں تیری محبت میں نہ کیوں دل بیقراروں کے   کہیں بھی آتش گل سے لگی ہی آگ خاروں کو

مرا دل غنچہ ساں ہنستا ہی اور شبنم سا روتا ہے   دیوانہ بن گیا ہی دیکھ کر ان گلعذاروں کو

لٹکا اس سرو قد کی یاد آجاتی ہی گلشن میں   ہلاتی ہی صبا جس دم گلوں کے شاخساروں کو

شرر آہ دل سوزاں جلا دے ایک ہی دم میں   زمیں کو آسماں کو مہر کو مہ کو ستاروں کو

سلام شوق کہیو ای صبا اس یار گلرو کو   نگہ کو چشم کو مژگاں کو دل کو خال کو ابرو کو

ادھر گر محتسب آوے تو ای ساقی چھپا دینا   گلابی کو سبو کو جام کو مینا کو دارو کو

بہار فصل گل میں ہم تم اک دن چل کے دیکھینگے   چمن کو نہر کو شمشاد کو سنبل کو شبو کو

رہے مدام یہ ساقی ترا چمن آباد   ہی جام صورت گل شیشہ انجمن میں سرو

نثار قمری تحسیں ہی اس غزل پہ شرر   ہر اک ہی شعر ترا گلشن سخن میں سرو

اشک نکالے ہی یوں دیدہ تر ایک دو   دیکھے صدف میں نہیں ایسے گہر ایک دو

اس کا رخ بے نقاب سرخ ہی جوں آفتاب   پیتا ہی جام شراب وقت سحر ایک دو

دل کے جلے میں نصیب کیا کہیے جان غریب   رہتے ہیں اس کے قریب ساتھ شرر ایک دو

مجھے بھاتی ہیں باتیں اس شکر لب کی ای یارو   وہ شیریں کی کہانی قصہ فرہاد رہنے دو

یاقوت کہیں ہی تو لعل کہیں ہی کہیں عقیق   قاتل پٹ گیا ہی مرا جابجا لہو

گاہ بے گاہ تو مل مہر جبیں ماہ لقا   دن کبھو رات کبھو صبح کبھو شام کبھو

کام تیری چشم کا گر مردم آزاری نہو   عشق کی ہرگز کسی عاشق کو بیماری نہو

قتل پہ گر مزاج ہی پیارے یہی علاج ہی   روز قیامت آج ہی حشر جو ہو تو ہونے دو

دل ہیں خیال میں بسے جان کے آگ میں پھنسے   جام کی طرح جو ہنسے شیشہ کی طرح رونے دو

ای شرر اشک کے قطرہ میں شب و روز ہی غرق   دل نے مارا ہی عجب آب گہر میں غوطہ

ایک صورت ہی نقش آب میں دیکھ   بحر میں موج میں حباب میں دیکھ

کس کی نکلی ہی یہ صدا دم ساز   تان میں تار میں رباب میں دیکھ

نظر آتا ہے عالم مستی — جام میں شیشہ میں شراب میں دیکھ

ہلال ابرو کا شہرہ ہے جہاں میں — زمیں تا آسماں اللہ اللہ

شرر فصل نبی سے وقت آخر — رہے گویا زباں اللہ اللہ

اگر وہ صنم سوئے دیر و حرم کھینچ قشقہ جبیں — اسی شان سے گذرے

تو دیکھے برہمن نہ پھر بت کی صورت — خدا کی قسم شیخ ایمان سے گذرے

دن بدن عمر گھٹی جاتی ہے — زیست حسرت میں کٹی جاتی ہے

بزم رنداں سے وہ جب ساقی سرشار اٹھے — جام اٹھے شیشہ اٹھے مے اٹھے میخوار اٹھے

آگ میں برق جلے ابر کا اڑ جائے دھواں — دل سوزاں سے اگر آہ شرربار اٹھے

نہ آنے کا بہانہ خوب اس کے ہاتھ آیا ہے — وہ کیوں کر پاؤں سے اپنے حنا کو باندھ کر کھولے

بے سبب لڑتا نہیں وہ دوستو! — کچھ کسی دشمن نے سکھلایا بھی ہے

مری فغاں سے ہے کوچہ ترا اسد آباد — نہ میں ہوں تو رہے تیری یہ گلی سونی

در زنداں کی جا جس کو دکھائی ہوگی — تم نے ہیرے کی کنی اس کو کھلائی ہوگی

دیکھ لو ماہ کے چہرہ پہ کلف ہے کہ نہیں — عیب رکھتا ہے وہی جو کہ ہنر رکھتا ہے

بلبل چمن میں کر لے تو آرام اور بھی — کچھ فصل گل کے باقی ہیں ایام اور بھی

ساقی عوض شراب کی پیتا ہوں خون دل — ہے نشہ بخش یہ مئے گلفام اور بھی

اس جام دل سا یہ غرض جم کو کروں نثار — ایسا جہاں میں ہے کوئی جام اور بھی

سمجھا ہے اپنے دل میں خدا جانے کیا شرر — مل کر ہوا بتوں سے تو بدنام اور بھی

برق وش یار کی صورت جو نظر آئی ہے — بارش اشک عجب چشم نے برسائی ہے

بیٹھے جو تیرے کوچہ میں کیوں کر ضعیف ہم — ممکن نہیں زمیں سے نقش قدم اٹھے

ماتم کے واسطے چلے یہ طفل اشک ساتھ — لخت جگر جب آہ کے لے کر علم اٹھے

اور تو کچھ نہیں آتا ہے یہ جلادوں کو — مگر اک کاٹنا عاشق کا گلا آتا ہے

فدا خوبان عالم ہیں تمہارے حسن دلجو کے
نثار آنکھوں کے، قرباں زلف و رخ کے، صدقہ ابرو کے

ساغر مے میں کہاں مستی ہے اور یہ جوش کہ — جس نے دیکھا ہے تری آنکھوں کو وہ مدہوش ہے

بات گر کہتا ہے کوئی سنتا ہوں میں بھی کان دھر — ای شرر یہ لب نہیں میرا سراپا گوش ہے

ای شیخ مت جھگڑ تو دیر و حرم میں جا کے — کیا کافر و مسلماں بندے ہیں سب خدا کے

ساقی قسم ہے تیری آنکھوں کی مستیوں کی — بے ہوش کر دیا ہے دو جام مے پلا کر

ای شرر کس نے کیا آب جگر آتش کا — تیرے نالوں سے ہوئے ہیں دل خارا پانی

وہ نرگس کی آنکھوں میں ہم خاک ڈالو — جو دیکھے تمہاری طرف بد نظر سے

بعید از ادب ہے ای خورشید خوبی — ترے رخ کو تشبیہ کر دوں قمر سے

تری جنبش لب ہے بس گالیاں کیا — نہ دے زہر اس کو مرے جو شکر سے

جا تو گلرو کے آگے کہہ دے نسیم — کوئی روتا ہے باغ کے پیچھے

نہیں پاتا کہیں نشاں اس کا — مر گیے اس سراغ کے پیچھے

تیرے کوچہ سے گرد عاشق کی — اٹھتی ہے اور بیٹھ جاتی ہے

بتی الفت کی یہ ہوائے عشق — کیا لگاتی ہے اور بجھاتی ہے

نہ سکندر سے غرض ہے نہ مجھے دارا سے — دل مرا شاد ہے اس جان جہاں آرا سے

دل عاشق سے نہیں بات دوئی کی ہوتی — ایک نکلے ہے صدا شیشہ صد پارا سے

جلوہ گر ایک نور اس کا ہے — چو طرف سب ظہور اس کا ہے

جس کے عاشق ہیں حضرت موسی — دل مرا کوہ طور اس کا ہے

پروانہ سا دل کیوں نہ ترے عشق میں جل جائے
گر شمع بھی صورت تری دیکھے تو پگھل جائے

شب خیال زلف میں آنسو کے یہ نالے بہے — موج میں آب رواں کی سیکڑوں کالے بہے

ای دل اس آب رواں کا زور ہی کچھ اور ہے — عشق کے دریا میں لاکھوں تیرنے والے بہے

تم نہ آئے ہم سے ملنے ساون بھادوں بھی چلا — یہ چلیں آنکھوں سے ندیاں اشک کے نالے بہے

صبا کہہ زلف مشکیں سے کہ دیوانے یقیں ہم تھے
گرہ سے، پیچ سے، بل سے، ترے واقف نہیں ہم تھے

جلایا ای شرر پیراہن دل جیب و داماں تک
بھڑکتے عشق کی آتش سے ہردم آستیں ہم تھے

ہے نالہ آہ دل سوزاں کا مرے دود — آتی ہے نظر دور سے کہسار کی چوٹی

مسیحا نام ہے جاں بخش تیرا یار گر حق ہے — تو مر کر زندہ ہونا عاشقوں کا کام ہی ہے

میں اس سال کی بیس سورۂ اخلاص پڑھتا ہوں ہو اللہ احد۔ دل جانتا ہے ای شرر حق ہے
جنگ میں بے ہمتوں کا نقارا کچھ عجب بے وقار بجتا ہے
ای شرر یہ رباب نالۂ دل شکر حق سازوار بجتا ہے
اللہ اسے دام سے زلفوں کے نکالے یہ مرغ دل اب جا پڑا صیاد کے پالے
کیا قہر کیا تو نے شرر اس کو یہ دل کرتا ہے کوئی دوست کو دشمن کے حوالے

دیکھ کر چشم گلابی تری گل لوٹ گئے جام بے خود ہو گئے اور شیشۂ مل لوٹ گئے
ہر ایک گل کی کلی میں رنگ کچھ ہے اور بو کچھ ہے
کسی کی گفت و گو کچھ ہے کسی کی گفتگو کچھ ہے
شرر فانوس میں سینہ کے شمع عشق ہے روشن
جلاتا ہے مرے دل کو وہ ظالم شعلہ رو کچھ ہے

---

(۱)

محبت کا راگ

اے محبوب! جب کہ چاند سرو کے قدآور درخت سے سرگوشیاں کرتا ہے تو نے بلبل کی آواز کو نہیں سنا۔
کیا تو نے اس کے گیت کو تیری شان میں گاتے نہیں سنا جسے اس نے گلوگیر آواز سے گایا تھا۔
گیت کی پُرمسرت لہریں جب کم ہو جاتی ہیں تو کیا تو نے دمشق کے گلاب کو روتے نہیں دیکھا
اور شام کی ہلکی تاریکی میں کیا تو نے بلبل کی سینہ کوبی کو غور نہیں کیا۔

اے محبوب! تو نہیں جانتا کہ ——
آہ بلبل کی دکھ بھری آواز میرا سسکتا ہوا اگ محبت ہے اور گلاب کے آنسو میری تمنا بھری
آنکھوں کے تارے ہیں جو میں نے تیرے انتظار میں رات بھر بہائے تھے۔

(ماخوذ)

(۲)

"محبوب سے خطاب"

نغمہ میں وہ لطف نہ رہا۔ بلبل کے گیت سے دل اُچٹ گیا۔ پھول روکھا پڑ گیا۔ چاند نظروں میں پھیکا کیوں پڑ گیا حسن حسین ترین حسن، آنکھوں سے اُتر گیا۔ کیوں؟ یہ میری نظر کا فرق ہے۔ ہاں وہ ایک ——
صرف ایک حسن ہے جس کا میں پرستار ہوں —— وہ تیرا ہی حسن ہے اے محبوب!
میری تمام مسرتیں تیرے ایک تبسم میں مضمر ہیں۔ میری سب آرزوئیں تیری ایک "ہاں اور نہیں" پر منحصر۔ تیری ایک آواز سر بسر موسیقی ہے مگر یاد رکھ کہ تیری "ہاں" خوشی کی موج ہے اور "نہیں" موت کا پیغام، میرے قلب میں جان ڈالنا اور روح نکالنا تیرے ہات میں ہے میں تیرا ہوں، ہمہ تن تیرا، میں تیری محبت کا پیاسا ہوں۔
اے محبوب تو ہی میری بلبل ہے۔ تو ہی میرا گل ہے۔ تو ہی میری مہ لقا، اور تو ہی ان سب کا راز ہے، ان سب کا مجموعہ تجھ میں ان سب کا حسن کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے جب تو میرے پاس ہو تو یہ سب حسن ترے سامنے مبہم ہیں۔

کج دار و مریز

از

جناب مسعود صدیقی صاحب م س سٹی کالج

حیدرآباد کے جاگیرداروں میں یوں تو عام طور پر جدت و روشن خیالی پیدا ہو چلی تھی مگر نواب غضنفر اللہ خان کا گھرانہ اپنی اعلیٰ سوسائیٹیوں اور مغربی دلچسپیوں کی وجہ سے بالکل ہی مسحور تجدد ہو چکا تھا۔ غضنفر اللہ خان کا پیارا بیٹا جمیل ابھی سات ہی سال کا تھا کہ اپنے دوست مسٹر گارڈن کی رائے کے مطابق اسے نینی تال کے مشہور سینٹ پاؤلس گرامر اسکول میں بھجوا دیا۔ چند سال بعد جمیل جب تعطیل سرما میں گھر آیا تو اس کی وضع قطع عادات و اطوار تہذیب و معاشرت حتیٰ کہ رجحانات و خیالات بھی بدلے ہوئے تھے۔ ایک روز خان صاحب حسب معمول دیوانخانے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک اُن کے بہنوئی نواب غیاث الدین حیدر رونق افروز ہوئے۔ خان صاحب کو خلاف معمول متفکر دیکھ کر نواب صاحب نے وجہ پوچھی۔ فرمانے لگے کہ میجر گارڈن کی رائے کے مطابق جمیل کو ایک یورپین درسگاہ میں بھیجنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی سے ہماری اور اُس کی زندگی کے حالات میں ایک خطرناک نمایاں تفاوت واقع ہو گیا ہے۔ اگر آج تمدنِ یورپ اور معاشرتِ انگلستان پر عمل پیرا ہونا باعثِ تہذیب و شائستگی سمجھا جاتا ہے تو اس کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ السنۂ مشرقیہ اور اسلامی علم و تہذیب کو یکسر گلدستۂ طاقِ نسیان ہی بنا دیا جائے۔ کل میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے جمیل کو اپنے چچازاد بھائی عقیل سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ "ہماری بڑی میڈم کہتی تھیں کہ عیسائی مذہب سب مذاہب سے اعلےٰ و افضل ہے جس کی فوقیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ عیسائیوں کی حکومت وسعت میں تمام حکومتوں کے رقبہ سے بڑھی ہوئی ہے" عقیل نے کہا کہ حکومت و سلطنت کی وسعت حقانیتِ مذہب کی کیونکر دلیل ہو سکتی ہے جب کہ اس کا دار و مدار راہ ترقی میں

شد و مد سے گامزن ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی بھی اس شد و مد سے راہ ترقی میں قدم اُٹھائے گا وہ یقیناً حکومت وسلطنت کے اعتبار سے معراج کمال پر جا پہنچے گا' اس کے لئے مذہب کی کوئی تخصیص نہیں لہٰذا یہ عارضی ثروت و ترقی آخرت کی فلاح و بہبود کو مستلزم نہیں ہوسکتی۔ کیا تمھیں یہ معلوم نہیں کہ آج خود یورپ کے بہت سے سنجیدہ حضرات اپنی تہذیب کے اس حصے کی تقلید کو جس کا صنعت وحرفت' علم و ہنر' ایجاد و اختراع سے کوئی تعلق نہیں مخرب اخلاق سمجھتے ہیں"۔ نواب صاحب نے جواب دیا کہ آپ بجا ارشاد فرماتے ہیں میں بھی اس کا قائل ہوں کہ علوم مغربیہ کے ساتھ ساتھ السنۂ مشرقیہ اور اسلامی علم و تہذیب سے بھی انتہائی واقفیت ہونی چاہیے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ انسان جس طرح اپنی عمر اور نشو و نما کے زمانے میں بہت سے جسمانی قالب بدلتا رہتا ہے اسی طرح اس کو مجبوراً یا ضرورتاً زمانے کے ساتھ اس کے مختلف سانچوں میں ڈھل جانا پڑتا ہے۔ خان صاحب نے فرمایا بیشک انسان کو مجبوراً یا ضرورتاً مختلف سانچوں میں ڈھل جانا پڑتا ہے مگر نہ اس حد تک کہ طرز معاشرت' رفتار' گفتار' عقاید۔ محبت' دوستی' دشمنی' لباس' آرائش' تعلقات وغیرہ وغیرہ سب میں ہی تبدیلی واقع ہو جائے۔ رہی تعلیم' وہ یہاں بھی ہوسکتی ہے۔ ساتھ ہی خان صاحب یہ بھی فرمانے لگے کہ اگر اب اس کو وہاں نہ بھیجا گیا تو آج کل کا زمانہ ایسا نازک ہے کہ پھر تعلیم ہی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ البتہ السنۂ مشرقیہ اور مذہبی تعلیم کے لئے میں پرنسپل صاحب کو لکھ دوں گا کہ جمیل کے لئے اسلامیات اور اردو فارسی ادبیات کی تکمیل کا خصوصی انتظام کر دیا جائے۔ بالآخر نواب صاحب نے یہ کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کر دیا کہ آپ کی تجویز غیر مطمئن ہے اور اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔

در میان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

چند سال کے بعد جب جمیل کی ابتدائی تعلیم ختم ہوگئی تو خان صاحب نے اُسے فوراً آکسفورڈ یونیورسٹی بھیج دیا۔ سینٹ پاولس گرامر اسکول کی اعلیٰ نشو و نما نے جمیل میں ایسی ذہنیت پیدا کر دی تھی کہ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی اور چھ سال کی متواتر جد و جہد کے بعد بالآخر ایم۔ اے کے امتحان میں بدرجہ اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ زاں بعد جمیل سیول سرویس کے لئے نامزد ہوگیا اور اپنی غیر معمولی ذہانت اور فطانت کی وجہ سے سیول سرویس کے امتحان میں بھی اول آیا۔

خاندانی انگریز پرستی اور اپنی گوناگوں قابلیتوں کی وجہ سے جمیل ارباب حل وعقد اور ناخدایان سلطنت میں پہلے ہی سے کافی رسوخ حاصل کر چکا تھا آئی۔ سی۔ ایس کی ڈگری سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ رزلٹ اوٹ ہوتے ہی اس کا نام وزیر آباد کی کلکٹری کے لئے پیش ہوگیا اور کونسل سے بھی منظوری آگئی۔ اب کیا تھا واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ آٹھ سال کے بعد اس ہندوستانی طالب علم کی بصد مسرت وکامرانی انگلینڈ سے روانگی عمل میں آئی۔

باب الہند بمبئی پر جمیل کا شایانِ شان استقبال ہوا۔ مگر باپ کی علالت کی خبر نے اس کی خوشی کو پھیکا کر دیا۔ وہ پہلے حمید آباد روانہ ہوا۔ بیٹے کی کامیاب واپسی اور کلکٹری کی خبر خان صاحب کے لئے کچھ کم مسرت کا سبب نہ تھی لیکن سخت وشدید علالت نے انھیں اس مسرت وشادمانی سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع نہ دیا۔ درحقیقت نواب غضنفر اللہ خان کا پیمانہ عمر لبریز ہوچکا تھا۔ ساٹھ سال کے قریب عمر تھی اور وہ بستر مرگ پر دراز تھے۔ ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں خفیف سی روشنی تھی۔ سرد ہونٹ پھڑک رہے تھے اور قریب تھا کہ وہ بصد حسرت ویاس اس جہان فانی سے منہ موڑلیں کہ دروازے پر موٹر کے آنے کی آواز معلوم ہوئی۔ جمیل کو معلوم تھا کہ باپ کی حالت نازک ہے اس لئے وہ نہایت تیزی سے باپ کے پاس پہنچا۔ مگر پہنچتے پہنچتے خان صاحب کا مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کرچکا تھا۔ غمگین بیٹا مردہ باپ کی طرف کچھ اس طرح نگاہیں جمائے دیکھ رہا تھا گویا وہ اس دنیا ہی میں نہیں ہے اور باپ کا لاشۂ بیجان اس سے بزبان حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

جمیل پر اس ہوش ربا اور روح فرسا سانحہ کی وجہ سے کئی دن تک ایک سکتہ سا طاری رہا مگر اس نے اپنی حالت کو سنبھالا اور طبیعت سکون پذیر ہونے کے بعد اس نے وزیر آباد جاکر کلکٹری کا جائزہ حاصل کرلیا۔ جمیل کی کلکٹری کی خبر صوبہ بھر میں بادِ صرصر کے تیز وتند جھونکوں کی طرح اڑ نکلی۔ چونکہ جمیل ہندوستانی کلکٹروں میں پہلا کلکٹر تھا اور دولت زاداں جمیل کے اعلےٰ اقتدار کے باعث چاروں طرف سے اس کی شادی کے پیغام آنے لگے۔ یوں تو جو کوئی بھی پیغام آیا کسی نہ کسی حیثیت و نوعیت سے مافوق ضرور تھا مگر جمیل اور اس کی والدہ نے آنریبل نواب سر اصغر حسین کے ہاں کا پیغام منظور کرلیا

شاہدہ آنریبل سر اصغر حسین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی تعلیم کے بعد نقاشی اور شاعری کے بھی ابتدائی منازل طے کر چکی تھی۔ اس کے جذباتِ خوابیدہ بیدار ہو چکے تھے۔ حسنِ صورت، حسنِ سیرت اور نقاشی و شاعری کے بعد رہ ہی کیا گیا تھا............ عشق عشق جسے وہ بار بار اپنے قلب کی گہرائیوں میں تلاش کرتی تھی مگر پتہ نہ ملتا تھا۔ وہ اپنی کشمکشِ حیات سے پیچ و تاب میں آجاتی تھی اور اس چیستانِ حیات کو کہ ہم کیا ہیں، کیوں ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کہاں جانا ہے؟ باوجود انتہائی تدبر و کیاست حل نہ کر سکتی تھی۔ وہ ابھی اسی گتھی کے سلجھانے کی کوشش میں سرگرم تھی کہ جمیل کے اذکار جمیل اس کے کانوں تک پہنچے۔ مگر جمیل کے نام سے اُسے زیادہ وحشت اس وجہ سے بھی ہوتی تھی کہ اُسے یقین تھا کہ جمیل میری شاعرانہ دلچسپیوں میں ضرور حارج ہوگا اور اپنی غیر معمولی انگریزیت کی وجہ سے معلوم نہیں مجھے کس وضع قطع میں تراشے۔ مگر شاہدہ کے یہ داعیاتِ قلب ایک طلسمِ خیال سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ وہ ابھی انھیں افکارِ پریشاں میں سرشار تھی کہ شادی کا مبارک و مسعود دن آگیا اور جمیل کی برات بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اصغر آباد آئی ایک امیر الامرائی بیٹی اور متمول خاندان کا روشن چراغ بیٹا، شادی رچی اور خوب دھوم دھڑلے ہوا کیے۔ بالآخر شاہدہ بڑی شان و شوکت اور سطوت و حشمت کے ساتھ باپ کے گھر سے سدھاری۔ وزیر آباد گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچتے ہی شاہدہ، شاہدہ نہ رہی بلکہ لیڈی جمیل کہلانے لگی اور رفتہ رفتہ جمیل کے ساتھ سینما اور تھیٹر میں بھی آنے جانے لگی۔ شاہدہ فطرتاً نیک دل اور لہو و لعب سے متنفر تھی۔ اُسے جمیل کے شدید و پیہم اصرار کے باوجود پردہ دری بہت ہی دشوار معلوم ہوتی تھی مگر چار و ناچار کیا کرتی۔ بالآخر چند ہی دن میں اس کا پردہ جمیل کی عقل پر پڑ گیا اور اب تو وہ کھلے بند دل اس طلسم خانۂ عالم کی سیر و سیاحت کرنے لگی۔ ایک دن میشن پارک میں بلیرڈ کھیلنے گئی ہوئی تھی، شام کو بہت دیر سے گھر لوٹی۔ میز پر ایک وزیٹنگ کارڈ پڑا پایا جس کی خوبصورت تحریر اس امر کا ثبوت دے رہی تھی کہ لکھنے والا کوئی نقاش یا مصور ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی نہ تھیں کہ شاہدہ پر بغیر اثر کئے رہ سکتیں۔ جمیل گورنر کے ساتھ سالانہ دورے پر گیا ہوا تھا۔ حریت مطلقہ اور آزادئ کاملہ حاصل تھی۔ دل میں سوز و گداز تھا اور اس میں شک نہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے اندر عشق رکھتا ہے۔ حیوانات کے دل محبت سے لبریز ہیں تو نباتات اور جمادات بھی اس سے خالی نہیں حتیٰ کہ فلکیات میں بھی گرمی ہے تو عشق کی۔

اور نور ہے تو اسی کا۔ شاہدہ نقاشی و شاعری کی وجہ سے یہ حرارت اور بھی سوا رکھتی تھی اور پردے کی قیود کے اُٹھ جانے کے بعد تو اس کے جذبات میں ایک تلاطمِ عظیم بپا ہو چکا تھا۔ مسٹر جلالی (بیرسٹر ایٹ لا) جمیل کا پیارا دوست اور ہم جماعت تھا۔ خوبصورت، خوش سیرت، شمشاد قد، آہو چشم، جادو نگاہ، اس سے سب کو محبت تھی:۔

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی
جوانی کا عالم تھا سرشاریاں تھیں

کسی موکل کے ساتھ اس طرف آیا ہوا تھا۔ ایام قیام ولایت میں جلالی اور جمیل ایک جان دو قالب رہ چکے تھے اُسے گزشتہ زمانہ یاد آیا اور دو چار دن جمیل کے ساتھ گزارنے کو ادھر چلا آیا۔ بنگلہ پر پہنچا تو کچھ خبر نہ ملی۔ کارڈ پر یہ لکھ کر چلا آیا کہ صبح ملوں گا۔ کس کو معلوم تھا کہ شاہدہ کے لئے یہ صبح قیامت کی صبح ہوگی۔ سویرے ہی اس کے انتظار میں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔ آٹھ بجتے ہی مسٹر جلالی رونق افروز ہوگئے۔ وہ شاہدہ سے مل کر یہ نہ سمجھ سکے کہ شاہدہ کوئی انگلش لیڈی ہے یا انڈین۔ مسٹر جلالی اور شاہدہ کی ملاقاتیں چند ہی دن میں بہت کچھ منازل طے کر گئیں۔ جلالی کو جب اس کا پتہ چلا تو اس کا جذبۂ عشق بھی موجزن ہوا۔ جمیل دورہ سے واپس آئے اور جلالی اُن سے مل ملا کر جلد ہی لاہور واپس ہو گئے۔ چونکہ موکلوں کے تقاضوں نے اُن کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ شاہدہ کا جنونِ عشق دن بدن بڑھتا گیا۔ عشقِ جلالی نے اُسے کسی کام کا نہ رکھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی حالت نہایت سقیم و ابتر ہوگئی۔ یکایک جدائی کی وجہ سے افسردگی و اضمحلال اور بھی بڑھ گیا اور درحقیقت وہ بیمار معلوم ہونے لگی۔ اس کا جسم روز بروز لاغر ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے اور غیر معمولی طور پر غمگین اور پھیکا پن دکھائی دیتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے ہاتھ بھی ہر وقت مریضوں کی طرح گرم رہا کرتے تھے حتّٰی کہ آغازِ شباب کی شوخی اور ولولے نئے نئے جذبات اور کیفیات کا غیر معمولی تموّج یہ سارے امتیازات فنا ہو رہے تھے۔

نہ ذوقِ تماشا نہ شوقِ تخیل
محبت اب اور بیزاریاں ہیں

اس کیفیت کو دیکھ کر جمیل گھبرا گیا اور اُس نے اپنے مظنونات کے ماتحت فوراً یونانی علاج ترک کر کے دنیائے ہند کے مشہور ڈاکٹر کرنل ولسن کو دہلی سے بلانے کے لئے تار دیا مگر وہ اپنی غیر معمولی

مصروفیتوں کی وجہ سے فوراً نہ آسکا اس لئے جمیل کو خود دہلی جانا پڑا تیسرے دن جمیل واپس آنے والا تھا
اور شاہدہ دل بہلانے کے لئے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی امریکن مشن اسکول کی عیسائی طالبات
کے جگمگھٹ کا تماشا دیکھ رہی تھی جو اتوار کے دن ستھرے اور عمدہ لباس پہن کر تفریح کے لئے نکلا کرتی تھیں
مگر شاہدہ صرف ظاہری آنکھوں سے اس کا نظارہ کر رہی تھی۔ باطنی آنکھوں میں تو کوئی اور ہی بسا ہوا
تھا جس کے سبب سے اُسے ذہنی و روحانی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اُس کے دل میں جلالی
کے لئے جاذبہ موجود ہے مگر وہ بے بس اور مجبور تھی۔ اس کا دور کرنا ایسا ہی ناممکن تھا
جیسا کہ خود اپنی انفرادیت کو اپنے وجود سے علٰحدہ کرنا محال ہے۔ اُس کا ضمیر اسے لعنت و ملامت کر رہا
تھا جس سے وہ خوف زدہ اور پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح دل سے یہ احساس مٹ جائے جس کا
وجود جمیل کے حق میں صریح ظلم اور جس کی آرزو شرافت و انسانیت سے بعید ہے۔ وہ باور کرتی تھی کہ
زوجیت کے فرائض، شرافت کے طریقے اور مذہب کی پابندیوں سے انحراف کر کے زندہ رہنے سے موت
کو بدرجہا ترجیح ہے۔ یہی وہ متضاد خیالات تھے جن کے سلجھانے کی جب کوئی سبیل نہ نکلی تو پہلے دیر
تک سوچتی رہی اور پھر ایک فیصلہ کن انداز میں میز کے پاس جا بیٹھی۔ ایک خط لکھ کر ورانڈے کی میز کے
اوپر رکھوا دیا اور خود آن کی آن میں ریوالور کا نشانہ بن گئی۔ ریوالور کی آواز سن کر گھر کے تمام نوکر چاکر
دوڑے مگر جب اس سانحہ عظیم کا پتہ چلا تو ہر شخص حیرت و استعجاب اور رنج و غم کے ملے جلے جذبات سے
مبہوت ہو گیا۔ خانساماں جمیل کو تار دینے کے لئے ڈاکخانے کی طرف دوڑا جا رہا تھا کہ جمیل کا تار ملا جس
سے معلوم ہوا کہ جمیل آج ہی واپس آ رہے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب کل آئیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں جمیل واپس
آ گیا مگر بنگلے میں گھستے ہی اُس نے ایک خاص قسم کی اداسی پائی۔ اُس کا دل بے اختیار کانپنے لگا جب
اُس نے اچانک شاہدہ کی ایک تحریر ورانڈے کی گول میز پر رکھی ہوئی پائی۔

جمیل پیارے جمیل! مشہور فارسی مثل ہے "کج دار و مریز" یعنی ایک لبریز پیالہ کسی کے ہاتھ میں دے کر اس
سے کہنا کہ اسے ٹیڑھا کرو لیکن خبردار پانی نہ گرے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل ناممکنات سے ہے دنیا
میں جہاں لغزش کے صدہا مواقع ہیں ایک ضعیف الفطرت عورت کے لئے باوجود اپنی فطری کمزوریوں کے
جدید تمدن سے دوچار ہونا اور معصوم رہنا سخت مشکل ہے۔ پیارے جمیل! اسی کشمکش "کج دار و مریز" میں میں نے بجز
خود کشی اپنی عصمت نوازی و مہر پروری کا کوئی سامان نہ پایا۔ وہ جوہر عصمت جو ہمیشہ میرے عمق وجود میں تابندہ

درخشاں رہا ہے۔ ترغیب و محبت نے گو تمناؤں سے بھری ہوئی آغوش اس کے سامنے پھیلائی لیکن بے سود، تخیلات و جذبات نے اُسے مانوس کرنے کی اگرچہ ہزارہا کوششیں کیں مگر بیکار، آج اسی جوہرِ عصمت کو خودکشی کے خوانِ رنگیں میں سجا کر ہدیہ کی صورت میں پیش کرتی ہوں۔

خدا حافظ تمھاری جاں نثار۔ شاہدہ

جمیل نے اس تحریر کو بار بار پڑھا مگر خاک نہ سمجھا، اس پر نیم دیوانگی کی سی کیفیت طاری تھی کہ اسی وجدانی کیفیت میں وہ قرطاسِ خون اس کے ہاتھ سے گر پڑا، اس کے اٹھانے کی جستجو میں اس کی پشت پر بھی اس نے کچھ لکھا ہوا پایا جسے وہ بیتابانہ پڑھنے لگا۔

پیاری شاہدہ! آپ کا تقدس، آپ کی عصمت مآبی آپ کو میرے غربت کدہ پر تشریف لانے کی اجازت نہیں دیتا اور میری کمزوریاں و خود فراموشیاں میرے لئے مانع ہیں تو کیسے ملاقات ہو تو کیونکر ہو؟ خدا کے لئے آپ اپنے تقدس کو سمجھا لیجئے، میں اپنی خود فراموشیوں کو منا لوں گا اور جلد کوئی ذریعہ ملاقات نکالئے کہ اب تاب و تواں باقی نہیں۔

آپ کا۔ جلالی۔

اس تحریر کے نظر سے گزرتے ہی جمیل پر سارا راز روشن ہو گیا، جمیل کے دل سے بے اختیار آہ نکلی، اس کی ساری مسرتیں غموم و ہموم میں تبدیل ہو گئیں، زندگی کے تمام دقائق انتہائے درد ہو کر رہ گئے، اُس کا دل آنسو ہو کر بہہ گیا۔ اُسے رہ رہ کر اپنی کجروی اور غلطی پر ندامت ہوتی تھی اور شاہدہ کی معصومانہ زندگی کی تصویر اُس کی آنکھوں میں پھرتی اور اس کو بار بار ملامت کرتی تھی کہ آہ تو نے نوعِ انسانی کے ایک بڑے فرد کا اپنے ہاتھوں سے خون کیا ہے اور سوسائٹی کے دام تزویر میں محصور کر کے اس کا رشتۂ حیات توڑا ہے گرم گرم آنسوؤں کے قطرے بے نشان راستے طے کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے آتے تھے اور اُس کی آنکھوں کا نور اپنے ساتھ لے کر لامحدود فضا میں کھو جاتے تھے مگر یہ تالّم و تاسّف بعد از وقت اور بیکار محض تھا، چونکہ شاہدہ سوائے نظارۂ جمالِ خداوندی ساری کائنات کی طرف سے نگاہیں پھیر چکی تھی۔

تنقید

طبیبہ حصہ اول و دوم۔ مولفۂ جناب علی احمد صاحب زاہد جبل پوری
قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ۔ ایس۔ اے احمد اینڈ کمپنی
جبل پور (سی۔ پی) سے طلب کی جائے

اردو میں عام امراض اور بالخصوص عورتوں اور بچوں کی متعدد بیماریوں کے متعلق جو ذرا سی غفلت سے پیدا ہو جاتی ہیں اور بالآخر سینکڑوں ماؤں اور معصوموں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہیں بہت کم کتابیں پائی جاتی ہیں۔ جو ہیں بھی وہ زیادہ تر فنی حیثیت رکھتی ہیں اور گنتی کی چند ایسی ملیں گی جن میں طب کے اس اہم شعبے کو غیر فنی طریقے پر اور عامۃ الناس کے مطالعہ و افادے کے لئے لکھا گیا ہو۔ تعلیم نسواں کی ترقی کے ساتھ ہی بہت سی کتابوں کی ضرورت داعی ہوتی ہے جن کو خواندہ خواتین مطالعہ کرکے زندگی کے بہت سے ضروری شعبوں میں جن سے اُن کی اَن پڑھ بہنیں خاطر خواہ معلومات نہیں رکھتیں مفید معلومات حاصل کریں اور اپنی اور اپنے بال بچوں کی بہت سی مشکلیں جو ناخواندگی و جہالت سے بہت زیادہ مشکل نظر آتی ہیں بہ آسانی حل کر لیں۔ طبیبہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کے حصہ اول میں عورتوں کی صنفی بیماریوں کے علاوہ حاملہ و زچہ کی بیماریوں کا مفصل بیان اور تدابیر احتیاط و علاج پر شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے۔ پیرایۂ بیان ایسا سلیس اور صاف اور شیریں ہے کہ عام خواتین جو طب سے قطعاً ناآشنا ہوتی ہیں بے تکلف اس کے مطالعہ سے اپنی صحت کی حفاظت اور متعدد امراض سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہیں نیز حتّی المقدور اس امر کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ کتاب میں کوئی چیز ایسی بیان نہ ہو جو شریف خواتین کے مطالعہ کے لئے نہ دی جا سکے۔ طب میں جو امور ناگزیر ہیں اُن کو بیان تو کیا ہے مگر نقاہت و متانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔

اس کا دوسرا حصہ جس کا نام ہمدرد اطفال بھی ہے بچوں کی صحت کے لئے وقف ہے۔ اس میں بچوں کی پرورش اُن کی صحت کی حفاظت، عام امراض اطفال، اُن کی علامتیں اور علاج سب ہی سلیقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہندوستان میں کم سن بچوں کی اموات جس درجے بڑھی ہوئی ہیں اُس کے پیش نظر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایسی کتابوں کے مطالعہ اور ان کی ہدایتوں پر عمل کرکے بہت سی اموات کو جو بالکل بے وقت اور قوم کے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہو رہی ہیں روکا جا سکتا ہے۔

زندہ طلسمات

جس کو باشندگانِ حیدرآباد کے علاوہ معزز حکما اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کرکے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے
زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنےٰ
کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے
اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے۔ پبلک کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے
شیشی نمبر(۱) عہ نمبر(۲) ۸ر نمبر(۳) ہر۔ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی۔ پی معاف ہوگا۔ خط و کتابت اور تار کا پتہ:۔

"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پُرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت
ہوچکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی
کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش
کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ پراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہیے
استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔
علی الخصوص نقرس، وجع مفاصل، دمہ۔ درد سر۔ درد دل۔ بچھو کے زہر کے لئے۔ زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں
کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان طلب فرمادیں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانے میں ہر قسم کے تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں

المشتہر

جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ سٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

نیرنگ رامپور سے دہلی کو منتقل کر دیا گیا

اس عظیم انقلاب کے ماتحت جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کا تمام پروگرام تبدیل ہو گیا۔ اس لئے

امیر نمبر

جس کے جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اب ایک ماہ کی تاخیر سے آخر ماہ فروری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوگا اور امیر نمبر کی بجائے

دہلی نمبر

جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوگا۔ یہ نمبر نیرنگ کے انقلابی پروگرام کی یادگار ہوگا اور ہر حیثیت سے قابلِ قدر اور کامیاب ہوگا

آئندہ جملہ مراسلت اور ترسیلِ زر حضرت عشرت رحمانی مدیر نیرنگ دار السلطنت دہلی کے نام ہونی چاہیئے

سنہ ۱۹۳۰ء سے رسالہ کے لئے جس قدر آرڈر موصول ہوئے ہیں اُن کی تعمیل دہلی سے ہوگی۔ نیرنگ کے قدیمی معاون اور قدرداں حضرات سے اُمید ہے کہ وہ نیرنگ کی بدستور معاونت فرمائیں گے اور بہ لحاظِ ضرورت مجھے اپنے گرامی ناموں سے یاد فرماتے رہیں گے

معزز معاصرین اپنے رسائل اور اخبارات بدستور رامپور کے پتہ پر ارسال فرماتے رہیں۔ نیرنگ دہلی سے اُن کی خدمت میں پہنچتا رہے گا

محمد عزیز اللہ خان مدیر نیرنگ

پتہ ...... مطبع سعیدی ریاست رامپور

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا آٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پنتیس روپے کی درسی دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنیوالے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہئیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب اطلاع رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی آدمی ملکر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

کے

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی

شرکاء

سید محمد ایم اے

عمر یافعی

یہ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں سے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

بنظر احتیاطاً پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہو تو مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ/) فی پرچہ ۶/

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کیلئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ آنے تا ۲۰ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلہ مکتبہ - مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے۔

رجسٹر نشان پٹہ سرکار آصفیہ (۴۵)

رجسٹر نشان پٹہ سرکار انگلشیہ (۵۰۰۰)

مجلۂ مکتبہ

جلد (۴) بابتہ ماہ اسفندار ۱۳۳۲ف م جنوری سنہ ۱۹۲۳ء شمارہ (۴)

تصاویر

(۱) قطعہ دوم (۲) باغ عام کا ایک خوشنما منظر

فہرست مضامین

شذرات

"اسپکٹیٹر" کے شہرۂ آفاق مدیر مسٹر گاروِن نے ایک دعوت میں جو مسٹر میکڈونلڈ اور مسٹر لائیڈ جارج کی طرف سے مدیر موصوف کے اعزاز میں ترتیب دی گئی تھی، اپنے چند مدیرانہ اصول کو نہایت خوبی سے بیان کیا۔ یہ اصول ایسے ہیں کہ ان کو تمام ارباب صحافت جو اس پیشہ کو عزت اور کامیابی سے انجام کو پہنچانا چاہتے ہیں، اپنا مطمع نظر بنا سکتے ہیں۔ اس دعوت کے موقع پر قدیم اور جدید وزیر اعظم برطانیہ نے مسٹر گاروِن کے اصول کی بڑی مدح سرائی کی۔ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ "دوستی بڑی قابل قدر نعمت ہے۔ لیکن ایک مدیر جب ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا ہو، تو اُس کو ہر وقت دوستوں کے کھونے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ورنہ وہ خود گم ہو جائیگا۔ صحیفہ میں "کردار" کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے قائم کرنے کے لئے خود میں نے یہ کیا ہے کہ ہمیشہ میں طویل مقالے مضمون نگاروں سے اہم موضوعات پر لکھواتا۔ جن کے خیالات بالکل آزاد اور غیر متعصبانہ ہوتے۔ اور لوگوں کے سامنے اُن چیزوں کو پیش کرتا تھا جو وہ نہیں طلب کرتے۔"

گذشتہ جلسہ عطائے اسناد کے موقع پر جامعہ آگرہ کے طلبا نین کو خطاب کرتے ہوئے "گنگا ناتھ جھا" نے ہندوستانی ارباب تعلیم کی ذہنیت اور ہماری جامعات کے ایک تاریک گوشہ پر بصیرت افروز روشنی ڈالی۔ انہوں نے نہایت شدومد کے ساتھ حاضرین کو یہ محسوس کروانے کی کوشش کی کہ جب سے ہماری ہندوستانی جامعات وجود میں آئی ہیں، ہم ایک عجیب دھوکے میں مبتلا ہیں کہ ہماری تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ہم ہندوستان کے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہ جائیں اس سے مقرر کا مقصد یورپی جامعات کے ہندی متعلمین کی تحقیر مقصود نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتے تھے کہ ہم کو کبھی اس قسم کے تعصبات میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے کہ یورپ کی کسی جامعہ کا فارغ التحصیل، ہر صورت میں ہندی جامعات کی پیداوار پر برتری رکھتا ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری جامعات کی تذلیل ہوتی ہے۔ بلکہ ہم ایک بھاری مغالطے کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے علمی کاموں اور عدالتی اور دوسرے حکمراں عہدوں کے لئے اشخاص کو غیر ممالک میں بھیج کر کام سکھانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ہم دوسرے ملک کے لوگوں کو اپنے ملک اور مقام کی ضروریات کے علم کے بغیر بھی اعلیٰ عہدوں پر ملازم کر لیتے ہیں اس کا بُرا نتیجہ ہم کو لازماً ہر روز دیکھنا پڑ رہا ہے۔

اس مہینے میں جامعہ عثمانیہ کے طلبا نین کو عطائے اسناد کے موقع پر ملک کے ایک بلند خیال عہدہ دار نواب

مسز نطامت جنگ بہادر نے ایک خطبہ دیا۔ اس خطبہ کے کئی اہم پہلوؤں میں سے ایک پہلو عربی و فارسی زبانوں کے مطالعے کی تشویق سے متعلق بھی تھا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرون دنیا کی وسیع ترین علمی اور حاکم زبان عربی تھی۔ یونانی اور رومی علوم و فنون کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے کے علاوہ اور مغربی اقوام میں بیداری پیدا کرنے اور اُن کی موجودہ ترقی کی تخم ریزی کرنے کے قطع نظر بھی عربی زبان کئی حیثیتوں سے اہم ہے۔ مسلمانوں کے تمدن اور کلچر کے علاوہ یونانی، رومی، ہندی، عربی اور ہسپانوی تہذیب کا بھی یہ بڑی حد تک نچوڑ ہے۔ ہر مورخ اور مفکر کے لئے جو اپنی تحقیقات کو قرون وسطیٰ میں ایرانی تک پہنچانا یا اس سے آگے بڑھانا چاہتا ہے، اسی زبان کے مطالعہ کے بغیر چارہ نہیں۔

یہی حال فارسی کا بھی ہے۔ آٹھ نو سو سال پہلے اور گزشتہ صدی کے ختم تک بھی یہ زبان نہ صرف ہندوستان بلکہ وسط ایشیا کی حکمران زبان رہی ہے۔ مغلوں کے درخشاں عہد میں ان ممالک اور خصوصاً سارے ہندوستان کے لئے یہ مشترک الہام تھی۔ اپنے پیچھے قدیم ایرانی تمدن کی عظیم الشان عقبیٰ زمیں رکھتے ہوئے، ہندوستان سے سفر کرتے کرتے اس نے کئی ایسی ہندی زبانیں بھی جن کو پرورش کیا، سنوارا، مہذب بنایا، اور آگے بڑھنے کا گُر سکھا دیا۔ ہمارے مورخ، متعلم تمدن اور ماہر لسانیات کے ذخیرہ میں اس کی کمی، یقیناً گمراہ کن ہے۔

ہم ایشیائی اس قدر احسان فراموش، اور غیر منطقی نہیں ہو سکتے کہ اُن زبانوں کے مطالعہ کی ہمت شکنی کا خیال دل میں لا سکیں۔

جرمنی ”تمدنی حیثیت“ سے ہندوستان سے قریب تر ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کا ثبوت ”ڈی دوتاخ اکاڈمی“ کا قیام ہے۔ کچھ سالوں سے ہند جرمنی علمی ادارے ہندوستانی طلبہ اور محققین کو وظیفہ بھی عطا کر رہے ہیں تاکہ وہ جرمنی جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور ان دو بڑے ملکوں کے تعلقات کی ایک کڑی ثابت ہوں۔ ہم نے گزشتہ سال چار ہندوستانی طلبہ کو جرمن وظایف عطا ہونے کی تفصیل لکھی تھی۔ اس دفعہ بھی ہندی ادارہ ”دی دوتاخ اکاڈمی“ نے ہندوستانی طلبہ کے لئے تین وظایف کا اعلان کیا ہے۔ یہ زراعت، انجینیرنگ اور طبعیات کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے بہترین طلبہ کو عطا کئے جائیں گے۔ جنہیں جرمن ہی میں رہ کر تعلیم پائی ہوگی۔ وظایف کی مقدار ۴۰۰ مارک یعنی ۳۰ پونڈ ماہانہ ہوگی جس سے صرف تعلیمی اخراجات کی کفالت ہو سکتی ہے۔ دوسرے مصارف طلبہ کو ادا کرنے ہونگے جو زیادہ اہم نہیں ہیں۔ کیونکہ جرمنی میں ایک ہندوستانی کفایت شعار طالب علم ماہوار ۱۵۰ سے ۲۰۰ مارک یا ۸ سے ۱۰ پونڈ میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ وظیفہ صرف ایک سال کے لئے عطا ہو رہا ہے۔ خاص صورتوں میں اس مدت کی توسیع بھی کی جا سکیگی۔ درخواست گزاری کے

قطعہ دوم - روزِ عید

شرائط صرف اس قدر ہیں کہ امیدوار کسی ہندوستانی جامعہ کا طالب علم ہو۔ اور جرمن زبان جانتا ہو۔

ہمیں معلوم ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں سائنس کے طلبہ کو اس قسم کی ضرورتوں کے لئے نہایت خوبی کے ساتھ تیار کیا جا رہا ہے۔ انہیں جرمن زبان سے بھی فی الجملہ آگاہی ہے۔ اس صورت میں کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ ام، ایس، سی، کے طلبہ بھی ان وظایف کے لئے قسمت آزمائی کریں۔ اس میں روپیہ سے زیادہ ملک اور قوم کی وقعت ہمارے مد نظر ہے۔

درخواستیں ذیل کے پتہ پر اپریل سنہ ۱۹۳ء تک پہنچ جانی چاہییں۔

اس سال ادبیات کا نوبل پرائز جرمن کے ایک افسانہ نگار طامس مان کو ملا۔ طامس مان موجودہ جرمن مصنفین میں سب سے بلند پایہ مصنف ہیں۔ ان کے کئی ناول اور مختصر قصے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ مان کی شخصیت نہایت مطمئن، خاموش دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس خاموشی کی تہ میں طوفان پوشیدہ ہوا کرتا ہے۔ مسٹر مان نے نہایت معمولی طور پر زندگی کا آغاز کیا۔ سنہ ۱۸۷۵ء کو ربل لوبک میں پیدا ہوئے۔ ۱۹ سال کی عمر میں خاندان کے ساتھ میونچ گئے جہاں یہ ایک بیمہ کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ اس خدمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادبیات اور انسانیت کا مطالعہ شدومد کے ساتھ کیا۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں ان کا پہلا ناول "گفالن" شائع ہوا۔ اس کی کامیابی نے انہیں ادبیات کے لئے وقف کر دیا۔ اس کے بعد پے در پے "بڈن بروکس" "رائل ہائی نس" "ڈیتھ ان وینیس" "ٹونیو کراجر" اور کئی ایک ناول اور مختصر قصوں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ مسٹر مان کی کردار نگاری بڑے اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے۔ اسلوب میں تھوڑی سی جھلک ظرافت کی بھی ہوتی ہے۔ انسان اور انسانیت کے وہ بڑے واقف کار ہیں۔ یہی امور ہیں جن کی وجہ سے وہ آج جرمنی کے چوٹی کے ناول نگار سمجھے جاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہندوستان اور اس کے کارنامے یورپ میں ذرا بھی روشناس نہیں۔ یوروپی اقوام کی معلومات کا دائرہ ہندوستان سے متعلق اس قدر محدود ہے کہ وہ ہر ایک "انڈین" کو ہندی کے بجائے "ہندو" سمجھتے ہیں! ان کے ذہنوں میں اب تک ہندوستانیوں کا تخیل وہی ہے جو گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا اقوام کی تصویروں کو دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی تعریف شاید وہ اس سے زیادہ نہیں کر سکتے کہ اس میں ایک غیر مہذب قوم، چند وحشی درندے اور سانپ آباد ہیں! ان روشن خیال اقوام کے ذہنوں سے یہ تاریکی دور ہو تو ہمیں یقین ہے کہ اور بہت سے ہندی عالم اور ادیب اور شاعر نوبل پرائز کے مستحق تصور کئے جا سکینگے۔ ہماری نظر میں اردو کے سر اقبال اور پریم چند شاید کسی بڑے ادیب سے کم رتبہ نہیں رکھتے۔

اورنگ زیب کی دکنی مہمات

از

(جناب احمد عبدالحی صاحب)

سرزمین دکن قدرت کی فیاضیوں سے مالامال ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اورنگ زیب سے قبل ان فیاضیوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا۔ اس لئے اورنگ زیب نے دکن کا عمدہ انتظام کرکے غیر آباد اور ویران علاقوں کو آباد کیا۔ کاشت کاروں کو ہمت دلائی اور اُن کو کاشت کے لئے خزانہ سے روپیہ عطا کیا۔ اور عالمگیر نے محسوس کیا کہ خزانہ شاہی بغیر مالگزاری کے معمور نہیں ہوسکتا اس لئے زراعت میں خاص توجہ مبذول کی۔ چنانچہ مالگزاری کے انتظامات کے لئے دکن کے چار صوبوں کو دو حصوں میں منقسم کیا۔ پہلا پائین گھاٹ اور دوسرا بالاگھاٹ۔ بالاگھاٹ کا انتظام مرشد قلی خاں کے سپرد کیا گیا۔ اس کی ذہانت و فراست سے مالگزاری میں ایک کثیر اضافہ ہوا۔ اُس نے عالمگیر کو اس معاملہ میں خاص مدد دی اور محنت شاقہ اٹھا کر سلطنت اور خزانہ شاہی کی خیر خواہی کرکے عالمگیر کی خوشنودی کا باعث ہوا۔ اگر مرشد قلی خاں عالمگیر کا ٹوڈرمل کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ سنہ ۱۰۶۵ھ میں دوسرا علاقہ بھی اُسی کے حوالے کیا گیا۔ اُس نے یہاں پر شمالی ہند کے بندوبست اور مالگزاری کے طریقے رائج کئے۔ اور متدین کفایت شعار، راست باز اور ایماندار حکام کا انتخاب کیا عالمگیر کی خاص توجہ اور مرشد قلی خاں کے عملی تجربے کی وجہ سے محکمۂ مالگزاری میں ایسی نمایاں ترقی ہوئی کہ اکبر اعظم کے عہد سے شاہ جہاں تک عدیم المثال ہے اگر اکبر کے عہد میں مالگزاری ایک کروڑ پونڈ، اور شاہ جہاں کے عہد میں دو کروڑ ستائیس لاکھ پونڈ تھی تو عہد عالمگیر میں چار کروڑ پونڈ ہوچکی تھی۔ چنانچہ اورنگ آباد اور اُس کے قرب و جوار میں تمام علاقے سرسبز اور شاداب دکھائی دیتے تھے۔ کاشتکاروں کی حالت قابل اطمینان ہوتے ہی مالگزاری میں اضافہ ہوا اور پیداوار کی زیادتی سے قیمتوں میں کمی ہوگئی جس سے دکن میں اطمینان اور سکون کی زندگی بسر ہونے لگی۔ لوگ روپیہ میں ڈھائی من گیہوں اور دال خریدتے تھے دودھ اور دہی کی تو افراط تھی۔ اور گھی روپیہ میں چار سیر ملتا تھا۔

---

[۱] "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" از مولانا شبلی صاحب۔ [۲] دیکھو سفرنامۂ ڈاکٹر برنیر ۱۲۔

جب دکن میں تمول بڑھا تو تجارت کو فروغ ہوا۔ یہاں کے تجارتی جہاز دور دراز کے متمول ممالک تک جاتے تھے۔ یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں یہاں کا کپڑا زیب تن کیا جاتا تھا۔ وہ اپنی شادیوں اور تہواروں میں ان ہی کپڑوں کی پوشاک پہنتے تھے۔ مالابار سے مچھلیاں جایا کرتیں۔ جو ممالک مغربیہ کی سرد آب و ہوا کے لحاظ سے کثیر مقدار میں فروخت ہوتی تھیں۔ حاصل جیسے اب سنگین لگائے جاتے ہیں پہلے ایسے نہ تھے۔ اس سے تجارت کی ترغیب ہوتی تھی۔ لوگوں کو اکتساب دولت کا ایک گونہ شوق ہو گیا تھا اسی طرح ایشیا۔ یورپ۔ پرتگال وغیرہ سے یہاں مال آتا تھا۔ فولاد کا کام نرنول میں ہوتا تھا۔ یہاں کے قالین اور دریاں دور دراز تک جاتی تھیں۔ سوالی ٹیم کے بندرگاہ سے جہاز بنگال، سیام، چین جاتے تھے۔ تمباکو اور سیندھی کی معقول تجارت ہوتی تھی جس سے ہندوستانی تاجروں کی دولت الیزبتھ کی اس جماعت سے کئی گنا زاید ہو گئی تھی جس کو اس نے ہندوستان جانے کی ترغیب دلائی تھی۔ دو آنے میں سو مچھلیاں بکتی تھیں چند کوڑیوں میں سیر گوشت اور دیگر ضروریات کی چیزیں نہایت آسانی اور ارزانی سے خریدی جاتی تھیں ان واقعات سے عہد عالمگیر کی خوشحالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب تجارتی جہاز ممالک مغربیہ کو جایا کرتے تو عموماً دریائی لٹیرے اُن کو لوٹ لیتے تھے جس سے تاجروں کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اسی لئے اورنگ زیب نے اُن کے انسداد کے لئے چالیس ہزار فوج کا دستہ سیدی خاں کے زیر نگرانی قائم کیا تاکہ ان کی بوقت ضرورت سرکوبی کی جائے۔

مالگزاری کے انتظامات کے علاوہ فتوحات دکن کا اثر حکومت کے دوسرے شعبوں پر پڑے بغیر نہیں رہا۔ چنانچہ ہر محکمہ سے کاہل اور نااہل عہدہ دار علیحدہ کر دئے گئے۔ اُن کے معاوضہ میں محنتی، قابل اعتماد اور تجربہ کار لوگوں کو منتخب کیا گیا۔ علاوہ ازیں منصبداری کا پرانا قاعدہ بند کر دیا گیا۔ اور زیادہ تر جاگیروں کی عوض تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ اس سے جاگیرداروں اور منصبداروں کو پیر پھیلانے کا موقع نہ ملا۔

یہی عمل محکمۂ فوج میں کیا گیا اور اس محکمہ میں میر خلیل خاں سے خاص طور پر مدد ملی۔ اس نے فوجی قابلیت کے علاوہ اعلیٰ طبیعت بھی پائی تھی۔ جب عالمگیر نے اس کو توپ خانہ کا داروغہ مقرر کیا تو ایک قلیل عرصہ میں اُس نے نمایاں ترقی کر کے تقریباً پچاس ہزار سالانہ کی بچت دکھلائی۔ ان اندرونی انتظامات سے دکن کی حالت بدل گئی۔ اس وقت دکن میں عام خوشحالی تھی اور لوگ نہایت سہولت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کو ایجاد و اختراع کا بھی شوق پیدا ہوا اور صنعت و حرفت کو عروج ہوا۔ دکن کا تمول تھوڑے ہی عرصہ میں انتہائی کمال کو پہونچ گیا۔ اورنگ آباد میں ہمرو کے تھان نہایت نفیس تیار

ہو کر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ فرانس، انگلستان، پرتگال تک جایا کرتے تھے۔ بیدریوں کو بیدری کام میں شغف تھا۔ وہاں نفیس اور رنگارنگ کے گنڈیاں، حقے، ڈبیاں غرض کہ مختلف چیزیں نہایت پختہ اور عمدہ تیار ہو کر دور دور تک بھیجی جاتی تھیں۔ گلبرگہ کا مصالحہ نہایت ہی خوشبودار ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ اس کے باہر بھی عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ دکن کی ثروت کا اندازہ یہاں کی عالیشان اور بلند عمارتوں سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اورنگ آباد کا وہ مقبرہ جو تاج محل کی طرز کا ہے اور اورنگ آباد کی وہ بڑی مسجد جہاں اب بھی جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ غرض یہ تمام دکن کے صنعتی ذوق اور اعلیٰ مذاق کا اظہار زبان حال سے کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پانی کا انتظام جو مٹی کے مضبوط نلوں کے ذریعہ سے بہم پہونچایا گیا تھا، اس قدر اعلیٰ تھا کہ ان قدیم نلوں کی پختگی اور ان کا مبدأ اور رسالہ معلوم کرنے میں آج کے روشن خیال انجنیر بھی قاصر ہیں۔

اندرونی انتظامات اور اصلاحات کے بعد عالمگیر نے بیرونی تعلقات کی طرف توجہ کی۔ اس وقت دکن میں خود مختار ریاستیں تھیں۔ ان میں آئے دن جھگڑے اور خانہ جنگیاں ہوتی تھیں۔ جس سے ملک میں امن وعافیت مفقود ہو چلا تھا۔ اورنگ زیب کے مقابل گولکنڈہ اور بیجاپور کی خود مختار ریاستیں تھیں۔ گولکنڈہ نہایت زرخیز مقام تھا۔ یہاں کا متمول بطور ضرب المثل پیش کیا جاتا تھا۔ تجارت فروغ پر تھی۔ بری اور بحری طاقت کچھ کم نہ تھی۔ مگر اس دولت کے ساتھ ریاست کی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ انتظام کی خرابی سے کوئی سلطنت دیرپا نہیں رہ سکتی۔ والی ریاست کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر یہاں کا وزیر میر جملہ اپنے ذاتی مفاد کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔ اپنے غیر معمولی اثرات کی وجہ سے کرناٹک کا علاقہ فتح کر کے اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ اس پر عبداللہ قطب شاہ نے اس کے بیٹے اور ماں کو قید کر کے اس کا پورا مال ضبط کر لیا۔ میر جملہ کے اس طرز عمل پر بادشاہ سے خود اس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور بجائے اس کے کہ وزیر اور بادشاہ مل کر ریاست کے معاملات طے کرتے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ ایسی حالت میں اورنگ زیب کو ہر ممکنہ کوشش کے استعمال پر بھی خراج نہیں ملا۔ اسی اثنا میں میر جملہ نے مغلیہ سلطنت کی استمداد چاہی۔ اس سے مغلوں کو مداخلت کا خاصہ موقع ملا۔ مگر قطب شاہ نے اورنگ زیب کی ہدایت کی تعمیل نہیں کی تو اورنگ زیب نے فوج کشی کر کے اس کی خبر لی۔ چونکہ یہ اورنگ زیب کی شہزادگی کا زمانہ تھا۔ اس لئے مرکزی حکومت کے احکامات کی بنا پر مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ اسی طرح بیجاپور کی بدعنوانیوں کی تنبیہ کی گئی تو عادل شاہ نے افضل خاں کے

شورہ سے معافی چاہی۔ جب ایک کمسن لڑکا عادل شاہ ثانی کے نام سے تخت نشین ہوا تو پھر بدامنی کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس لئے مغلیہ حکومت نے دوبارہ مداخلت کی۔ اس وقت اورنگ زیب نے جس کے ہمراہ میر جملہ تھا دہلی کے فرمان کی بنا پر صلح کر لی۔

۱۶۵۸ء میں شاہ جہاں کی علالت اور تخت نشینی کے جھگڑوں کی وجہ سے اورنگ زیب دکن چھوڑ کر شمالی ہند روانہ ہوا۔ اور تخت نشینی کے بعد بھی ایک عرصے تک ذاتی طور پر اس علاقے کا ارادہ نہ کر سکا۔ گو بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں معاہدہ کے لحاظ سے مغلوں کی شہنشاہی قبول کر چکی تھیں۔ لیکن سلطنت کے کارپردازوں کی مصروفیت کی وجہ سے اُن کا خراج ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے علاقوں میں مرہٹے بھی زور پکڑ رہے تھے۔ یہ لوگ ملک عنبر کے اصول پر عمل پیرا ہو کر پیشہ کاشتکاری سے ترقی کر کے سپاہانہ زندگی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ اور بہمنیہ سلطنت کے درباروں اور ملک عنبر کی فوج میں رہ کر قزاقانہ جنگ کے ہتھکنڈوں سے واقف ہو گئے تھے۔ یہ مردانہ وار حملہ نہیں کرتے بلکہ اچانک اور پیچھے سے چھاپے مارتے تھے اور تعاقب کے وقت وہ گھاٹیوں اور غیر مانوس مقاموں میں چھپ جاتے تھے اس طرح یہ لوگ مہاراشٹر کے پورے علاقوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں اُن کو کافی فوجیں فراہم کرنی پڑیں۔ کیونکہ باہمی عناد کے علاوہ شمالی دشمنوں کا مقابلہ درپیش تھا۔ ملک عنبر کے انتقال کے بعد اُس کی مرتب کردہ فوجیں منتشر کر دی گئیں اور اس کی جاگیریں ساہو کو عطا کی گئیں۔ جب ملک عنبر کا لڑکا فتح خاں مغلوں سے جا ملا تو شہنشاہ نے اس کے باپ کی جاگیریں ساہو سے دلا دیں۔ اس کے بعد اس نے والی بیجاپور کی ملازمت اختیار کی تو دربار بیجاپور نے اس کی خدمات کے صلہ میں پونا اور سوپا کی جاگیریں عطا کیں۔ مگر جب ساہو کا بیٹا سیوا عنفوان جوانی اور آغاز شباب کو پہونچا تو اُس کا عروج برسر تنزل ہو گیا۔ یہ پونے کے دادا جی کارکن کے زیر تعلیم و نگرانی رہا۔ اس کو فن سپہگری اور سیر و شکار کا طبعی ذوق تھا۔ پہاڑوں کے بھیل اور کولی اس کے ممد و معاون تھے۔ وہ ہوش سنبھالتے ہی جنگلوں اور گھاٹیوں میں گھومنے لگا۔ موقع پاکر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیجاپور کے آس پاس کے قلعوں پر چھاپا مارتا تھا۔ ان مقامات کے افسروں کے شور و فریاد پر حکومت کی طرف سے کوئی توجہ مبذول نہ کی جاتی تھی۔ اور عموماً یہ عمال کو رشوت کے ذریعہ سے اپنا بنا لیتا تھا۔ حکومت کی ان بے اعتنائیوں کی وجہ سے اُس کو نئے نئے گل کھلانے کا موقع ملا۔ گو بیجاپور دکن میں زبردست حکومت تھی مگر اُس کی انتظامی حالت بدترین ہو گئی تھی۔ جس سے سیوا نے اپنی طاقت

بڑھائی ۔ اس کے جھنڈے کے نیچے سات ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادہ جمع تھے ۔ اس نے دکن میں لوٹ مار سے بڑا اسی پھیلائی ۔ دکن کی سلطنتوں کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اُٹھا کر مرہٹوں نے مال غنیمت کے علاوہ مقبوضات بھی حاصل کئے ۔ اس طرح انہوں نے ایک علیحدہ سلطنت قائم کرلی ۔ سنبھا اپنے باپ سیوا کا جانشین ہوا، مسلمانوں کے علاوہ ہندؤں پر بھی اُس کی بے رحمی اور بے دردی کا دست دراز تھا ۔ کیا ہندو کیا مسلمان غرض سب کے سب اُس کے حرکات قبیحہ کے شاکی تھے ۔ اس نے باپ سے بغاوت کی ۔ جب سیوا نے سخت مواخذہ کیا تو مغلوں کے سایۂ عاطفت میں آگیا ۔ عنان حکومت ہاتھ میں آئے ہوئے کچھ عرصہ بھی نہ ہوا تھا کہ سنبھا نے برہان پور کے بیرونی مقامات کو لوٹ کر آگ لگا دی ۔ اب عالمگیر کو راجپوتوں کی مہم سے فراغت ملنے کی وجہ سے شمالی ہند سے اطمینان ہو چکا تھا ۔ اسی اثنا میں برہانپور کے معزز طبقہ کا محضر موصول ہوا تو سنبھا کی گوشمالی اور اپنے مقامات کی حفاظت کی غرض سے وہ برہان پور ہوتے ہوئے اورنگ آباد پہونچ گیا ۔ شہزادہ معظم نے سنبھا کے تقریباً کل قلعے تباہ و تاراج کردئے مگر موسم کی خرابی اور بارش کی کثرت سے لشکر میں وبا پھیل گئی تو معظم احمد نگر واپس ہوا ۔

اسی زمانہ میں شہنشاہ نے بیجاپور کا رُخ کیا ۔ چونکہ والی بیجاپور باوجود باجگزار اور ہم مذہب ہونے کے تخت تیموری الٹ دینے کے لئے ہمیشہ مرہٹوں کی مدد کرتا تھا ۔ یہ اپنے وعدہ کا پابند نہ تھا اور نہ اس پر شاہی خطاب و عتاب کا کچھ اثر ہوتا تھا ۔ اسی لئے شہزادہ معظم اس مہم کے لئے مقرر ہوا ۔ مگر فوج کی کمی کی وجہ سے وہ محصور ہو گیا ۔ تو اس کی کمک کے لئے فیروز جنگ کا انتخاب ہوا ۔ اس بہادر سپہ سالار کی مدد سے بیجاپور کا محاصرہ کیا گیا ۔ مگر اجناس کی فراہمی اور ساز و سامان کی فراوانی نے بیجاپوریوں کو ڈٹ کر لڑنے کا موقع دیا اسی اثنا میں شاہی فوج میں برگشتگی اور باہمی نا چاقی پیدا ہو گئی شہنشاہ نے کمال استقلال و متانت سے آکر اُن کو غیرت دلائی اور اُن کے دلیرانہ جذبات کو اکسایا ۔ اس طرح اُن میں بہادری اور سرفروشی کی ایک روح دوڑا دی ۔ الغرض ۱۰۹۷ھ میں غازی الدین سپہ سالار کی شجاعت کی بدولت ریاست بیجاپور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ بن گئی ۔

جب سیوا پنجہزاری کے خطاب سے ناراض ہو کر جشن سالانہ کو خیرباد کہا اور حیدرآباد آیا تو ابوالحسن والی حیدرآباد نے اُس کی ہمت بڑھائی، جنگی ساز و سامان اور مال و متاع سے مدد کی تو اُس کو کھیل کھیلنے کا موقع ملا ۔ اُس نے ایک مایوس اور محصور شخص کی اعانت کی جس کی دولت پہلے ہی

لٹ چکی تھی اور عمارتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ غرض ابوالحسن کی وجہ سے سیوا کو ترغیب ہوئی کہ شاہی مقبوضات پر از سر نو چھاپہ مارے اور کمزوروں پر ظلم ڈھائے۔ ابوالحسن مرہٹوں کا بڑا حامی تھا اور اُن ہی کی معاونت سے مغلیہ تخت و تاج کو تاراج کرنے کا درپے تھا۔ گویا اس کی بسر اسی خیال میں ہوئی تھی کہ مرہٹوں کو دولت اور لشکر سے مدد کر کے مغلوں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔ تاناشاہ نے اپنے اس خیال کو کامیاب بنانے میں امکانی کوشش کی۔ یہ عیش و عشرت کا بندہ۔ کھیل تماشاؤں میں منہمک، خواہشات نفسانی و نفس پرستی میں اپنی زندگی بسر کرتا تھا اور ہمیشہ نشہ میں مست اور سرشار عصیاں کاری و بدشعاری عین اُس کا دستور، غرور و نخوت کا نشہ ہمیشہ چڑھا رہتا تھا۔ غرض دنیا جہاں کی تمام بُرائیوں کا مجسمہ تھا۔ اس کے علاوہ اُس کے زمانہ میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ اُن پر ہر طرح سے سختیاں اور پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں۔ حکومت مادنا پنڈت کی تھی۔ اس نے مسلمانوں کو نقصان ہی نہیں پہونچایا بلکہ ظلم و تعدی سے کام لیا۔

سید مظفر کی اعانت اور کمال مستعدی سے ابوالحسن گولکنڈہ کے تخت و تاج کا مالک ہوا تھا۔ یہ نہایت ہی زیرک اور خیر خواہ ریاست تھا۔ مگر ابوالحسن نے اُس کو معزول کر کے مادنا کو وزارت کا منصب عطا کیا۔ سیوا نے ان امور کے تحت دربار شاہی سے فراہم ہونے کے بعد ابوالحسن سے مدد لی اس کے علاوہ ابوالحسن نے والی بیجاپور کو ایک خط لکھ بھیجا کہ تم شاہی افواج کا نہایت شجاعت و استقلال سے مقابلہ کرو۔ میں ادھر سے سنبھا کی نگرانی میں چالیس ہزار فوج بھیجتا ہوں۔ اب عالمگیر کے عزم و استقلال کا پتہ چلتا ہے۔ ابوالحسن نے باوجود باجگزار ہونے کے خدام شاہی کے خلاف مرہٹوں کو مدد دی اور عین محاصرہ بیجاپور کے وقت سنبھا کو مغلوں کے خلاف اکسایا۔ اور کثیر افواج کے ساتھ مہم پر پہونچنے کی ترغیب دلائی۔

اس کے علاوہ کئی سال سے خراج بھی ادا نہیں کیا گیا تھا۔ سلطنت کو کسی طرح سے اس ریاست کے قول و فعل کا اعتبار نہ تھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر مرہٹوں کا جادو پوری طرح چل گیا تھا۔

والیان قطب شاہی اہل تشیع سے تھے اور امرا و رؤسا عموماً اسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ شہزادہ معظم اسی فرقہ کا ہم خیال تھا۔ بادشاہی امرا بھی اس سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ مگر اُس کی بد اخلاقی اور مردم آزاری دربار سے نکل کر شہر میں خاص و عام ہو گئی تھی۔ اُس کی تنگ ظرفی اور مغلوں سے مخاصمت چھپی ہوئی نہ تھی چونکہ ولی عہد کو اس سے محبت تھی۔ اُس نے جنگ سے بچانے کے لئے پیغام

دیا کہ مادنا کو علیحدہ کر کے قید کر دیا جائے۔ شاہی مقبوضات واپس کر دیئے جائیں۔ اور خراج کی باقیات ادا کر دی جائیں۔ گولکنڈہ سے اس کا جواب نہایت ہی سخت ملا۔ مقابلے کے لئے فوج بھیجی گئی۔ دکنی لشکر نے بڑی جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مزید برآں شہزادہ معظم نے رعایت سے کام لیا۔ جس پر عالمگیر نے ناخوشی کا اظہار کیا۔ اس پر بھی جیت عالمگیر کے ساتھ رہی۔ کئی مہینوں کی لڑائی کے بعد مغل فوجیں حیدرآباد میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو گئیں۔ تاناشاہ اور اس کے ساتھیوں نے قلعہ گولکنڈہ کو اپنا مقام امن و عافیت بنا کر پہلی شرط کو مجبوراً تسلیم کر لیا۔ معظم نے خراج میں سالانہ اضافہ کر کے حیدرآباد کو خالی کر دیا۔ اس نے پھر رعایت سے کام لیا۔ مگر ابوالحسن نے اپنے اس عہد کا ایفا نہ کیا بلکہ فوج مقابلے کے لئے بھیجی۔ تو اورنگ زیب نے گولکنڈہ کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ بیجاپور کے مقابل نہایت ہی بلند اور مستحکم تھا۔ یہاں کا تمول، یہاں کے لڑنے والے، یہاں کا جنگی ساز و سامان، بیجاپور سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ اُس کو کافی موقع ہاتھ آنے کی وجہ سے فوج کو عمدگی کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ ادھر شہنشاہ کے ایرانی ساتھی اس جنگ کے قطعاً خلاف تھے۔ معظم کو ابوالحسن سے دلی ہمدردی تھی۔ اس پر موسم کی خرابی، بارش کی کثرت، اشیاء مایحتاج کی قلت سے محاصرین کے بلند حوصلے پست ہو گئے۔ مگر عالمگیر اتنا مستقل ارادہ اور بلند حوصلہ تھا کہ ان عوایق اور موانع سے کبھی باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی دھن کا پکا اور خیال کا سچا تھا۔ معظم اپنی سازشوں کی وجہ سے حراست میں لے لیا گیا۔ اور بعض اہل سازش کو سزائیں ہوئیں۔ آخرالامر تاناشاہ کے رفیقوں نے مایوس ہو کر عالمگیر کی سیادت تسلیم کر لی۔ سپہ سالار فیروز جنگ نے انتہائی کمال اور استقلال سے دکنی فوج کا ایک عرصہ تک مقابلہ کیا۔ اور گولکنڈہ کی طرف سے عبدالرزاق نے نہایت ہی مستقل مزاجی اور اولوالعزمی کے ساتھ قوم اور ملک کی حفاظت و حمایت کے لئے اپنی جوانمردی اور بہادری کے جوہر دکھلائے چنانچہ اس معرکہ میں اُس کے بدن پر ستر سے زائد کاری زخم لگے۔ اس محاصرہ سے امرا تنگ آ گئے اور قلعہ کے نگہبان سردار نے خود شہر پناہ کا دروازہ کھول کر مغلوں کی ہمت بڑھائی اب کیا تھا کہ محاصرین شہر میں گھس پڑے۔ گویا قطب شاہی سلطنت آٹھ مہینے دس دن کے محاصرہ کے بعد مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بن گئی۔

گو اس معرکۂ قتال کی وجہ سے اورنگ زیب کو مرہٹوں کے سدباب کا موقع نہ ملا۔ مگر شہنشاہ کی قربت اور مصروفیت جنگ کی وجہ سے مرہٹوں کی مجال نہ ہوئی کہ پھر اس عرصہ میں کہیں ادھر ہاتھ ماریں۔ سنبھا نے اس ڈر کی وجہ سے امن کی زندگی بسر کرنی شروع کی مگر عالمگیر کے ادھر سے فارغ ہوتے ہی

فیروز جنگ نے بیجاپور کے وہ جنوبی مقامات اور مقبوضات جن پر ساہو قابض ہو گیا تھا چھین لئے۔ اور سنبھا کے مفسدانہ خیالات اور باغیانہ جذبات کے استیصال کے لئے مقرب خاں مامور کیا گیا۔ یہ بہادر کمال شجاعت سے سنبھا کے تعاقب میں نکلا اور خبر پاکر اس دشوار گزار گھاٹ کی طرف یلغار کرتا ہوا اچانک پہونچ گیا جہاں سنبھا اپنی دو تین ہزار فوج کے ساتھ محو عیش تھا۔ سنبھا کو سوائے جنگ کے بھاگنے کا موقع نہ ملا۔ گو بادشاہی لشکر زاید نہ تھا مگر اس کے سامنے مرہٹوں کی فوج ٹھیر نہ سکی۔ اور سنبھا کسی مندر میں چھپ گیا۔ مقرب خاں بھلا اس کو کہاں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کو اور اس کے بال بچوں کو گرفتار کر کے دربار شاہی میں لے آیا۔ سنبھا نے میاں پہونچکر باوجود اس عالم مایوسی کے شہنشاہ کو مغلظات سنائیں اور معافی نہیں مانگی۔ اس لئے وہ قتل کر دیا گیا۔ اس کی ماں اور بیٹے کے ساتھ خاص مراعات برتے گئے سنبھا کے بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت عالمگیر کے شاہانہ اور فیاضانہ سلوک کے ساتھ ہوتی رہی۔ اس کے بعد رام راج کے ہاتھ مرہٹوں کی عنان حکومت آئی۔ مگر مرہٹوں کی خود مختار ریاست قائم نہیں رہ سکی۔ چونکہ رام راج جو برار کے علاقوں میں چھاپہ مارتا اور آوارہ پھرتا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں مر گیا۔ اس لئے اس کی بیوی تارابائی نے رہنمائی پر کمر باندھی۔ اس نے عالمگیر کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مرہٹہ فوج دو تین گروہوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ان کو گولکنڈہ اور بیجاپور کے مسخر ہونے کے پہلے کافی امداد پہنچتی تھی۔ اور وہاں کے امرا اور زمیندار ان کی بدنظمی اور کم توجہی سے متمرد اور سرکش ہو گئے تھے۔ الغرض مغلوں کے خلاف مرہٹوں کو مدد ملتی تھی۔ اور قدرت نے انہیں کچھ ایسے پہاڑ دے رکھے تھے کہ جس سے وہ قزاقانہ طریقہ سے لڑ بھڑ سکتے تھے۔ اس وقت مرہٹوں کے جرگے پریشان حال تھے۔ چونکہ ان کو لوٹ مار کے علاوہ جو مستقل آمدنی کا ذریعہ تھا وہ مفقود ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے انتہائی زمانہ پیری میں بھی اپنی استقامت اور بلند حوصلگی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اپنی وفات کے دو برس پہلے مرہٹوں کے تمام بلند اور سنگین قلعے مسخر کر کے محفوظ مقامات پر اپنا تسلط جمایا۔ بسنت گڑھ کی فتح سے کوکن کی تسخیر مکمل ہو گئی۔ جس سے مرہٹہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب مرہٹوں کا کوئی مامن نہ تھا۔ یہ لوگ بے یار و مددگار ہو کر قزاقوں اور ڈاکوؤں کی طرح آوارہ گردی اور مردم آزاری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہجہاں کے زمانہ میں ان کی قوت بڑھ چکی تھی۔ جب عالمگیر کا سابقہ پڑا تو ان کی طاقت انتہائی عروج پر تھی۔ مگر اورنگ زیب کی اعلیٰ قابلیت اور غیر معمولی سعی و اقبال نے بڑے بڑے

سورما اور علم برداران بغاوت کا خاتمہ کردیا۔ غرض اس کی آخری زندگی تک مغلیہ سلطنت میں نئے مقبوضات شامل ہوتے رہے۔ جو حکومت کی رفعت اور استحکام کا ثبوت ہے۔

جس وقت دکن کی ریاستیں بدعنوانیوں کا گھر بن گئی تھیں اور جب کہ وہ بلندی سے پستی، اجالے سے تاریکی اور انتہائی ضلالت کی طرف جارہی تھیں تو قانون قدرت کے مطابق اُن کی ماہیت عالمگیر کے زبردست ہاتھوں نے بدل دی۔ ایسی حالت میں اُن ریاستوں کا دم خم ٹوٹ گیا اور وہاں پر مغلیہ سلطنت کے صوبہ دار قایم ہوگئے۔ ان سے مرکزی حکومت دور ہوگئی، خبریں ملنے میں کئی دن درکار ہوتے تھے۔ جنوبی ریاستوں پر مسافت کی وجہ سے حکومت کرنا دشوار ہوگیا تھا۔ اب چونکہ مرہٹوں کی کوئی مستقل حکومت باقی نہ تھی۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ اس لئے وہ لٹیروں اور ڈاکوؤں کی طرح مختلف ٹکڑیوں میں منقسم ہوکر دور دور پھیل گئے تھے۔ اور موقع پاکر چھاپے مارتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے بعض بندرگاہوں کو بھی لوٹ لیا۔ ایسی حالت میں شہنشاہ نے نوواردا نگریزوں اور پرتگالیوں کو اپنی حفاظت آپ کرنے کا حکم نافذ کیا۔ کیوں کہ حکومت ان کے نقصان کی ادائی سے زیربار ہوچکی تھی۔ اور یہی سلسلہ ہمیشہ سے چلا آرہا تھا۔ اس طرح نو وارد فرنگیوں کی خوب بن آئی اور ہندوستان میں اُن کی نئی طاقت پیدا ہوگئی جو آئندہ چلکر مغلیہ سلطنت کے تنزل کا بالواسطہ سبب بنی۔

چونکہ ابوالحسن شیعہ ریاست کا ڈوبتا ہوا آفتاب تھا۔ اس سے اہل تشیع کو خاص لگاؤ اور انست تھی۔ اُس کی سلطنت کا چراغ گل ہونے کے بعد اُس فرقہ کے تعصب کا نائرہ مشتعل ہوا۔ اور اُن کے غیظ و غضب کی آگ بھڑکی اور یہ بھی مغلیہ سلطنت کی خرابی کا ایک باعث ہوا۔

عالمگیر کی عملداری کے قبل دکن میں مختلف خودمختار راجدھانیاں تھیں۔ ہر راجدھانی کا قانون ہی نرالا تھا۔ مگر اس نصرت و فتح کی وجہ سے پورا دکن ایک ہی شہنشاہ کا مطیع و منقاد ہوگیا۔ ایک ہی قانون ہر گوشہ دکن میں رائج ہوگیا۔ ایک ہی عدالت تھی جو اہل دکن کی قسمت کا فیصلہ کرتی تھی۔ اور ایک ہی سکہ تھا جو دکن میں جاری تھا اور ان سب کا تعلق مغلیہ حکومت سے تھا۔ غرض ایک ہی چشمہ سے دکن کی کھیتی سرسبز ہوتی تھی۔ گو دکن کو مرکزی حکومت سے اطلاعیں دیر سے ملتی تھیں، اس کے علاوہ راستہ دشوار گزار تھا تاہم عالمگیر نے مسافروں کی حفاظت کے لئے جابجا چوکیاں اور بدرقے رکھے تھے۔ اگر مسافروں کو کوئی گزند پہونچتا اور وہ لٹ جاتے تو بدرقوں سے اُس کا سخت

مواخذہ کیا جاتا تھا جس سے مسافروں کی آمد و رفت اور فرامین کے وصولی میں کوئی خوف و تامل نہ تھا۔ الغرض کسی طرح سے ہو شاہی احکامات اور اس کے مروجہ قانون کی تعمیل یہاں عمل میں آتی تھی۔

ابتداً دکن کی ریاستوں میں فسق و فجور پھیلا ہوا تھا۔ اُس کا انسداد اور نگرانی حکومت کی جانب سے خاطر خواہ نہ تھی۔ ادہر مرہٹوں کی لوٹ مار، جبر و تعدی اور اُن کے قتل و غارتگری سے ملک میں طوفانِ بے تمیزی اور بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ انصاف نام کو نہ تھا۔ مگر اورنگ زیب کے فتوحات کے بعد دکن میں امن و عافیت کی منادی کردی گئی تمام سرکشوں اور باغیوں کا ایک سرے سے استیصال کیا گیا کسی ملک کی بقا و حیات کا انحصار وہاں کے امن و عافیت پر ہے۔ عالمگیر اس نظریہ کے موافق رعایا کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے اعتدال پسند احکام کے سامنے رعایا سرِ تسلیم خم کرتی تھی۔ گو اس وقت موجودہ زمانہ کی طرح ذرائع آمد و رفت سہل نہ تھے مگر فرامین کی تعمیل بروقت ہوتی تھی اور ڈاکے اور یورشیں بہت کم سنائی دیتی تھیں۔

اس کے علاوہ مذہبی آزادی عام تھی۔ اور حکومت اُن پر بیجا تصرف اور وعدہ خلافی سے راج نہیں کرتی تھی۔ ہر قوم، ہر طبقہ اور ہر انسان اپنے خیال میں آزاد تھا۔ چنانچہ غار ہائے ایلورا جو اورنگ آباد کے دامن میں ہیں وہ برہنہ مورتوں سے بھرے پڑے تھے۔ وہاں ہندو نہایت آزادی کے ساتھ تہوار مناتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا دوسرا مرکز اور جائے عبادت و قربانی اجنٹہ تھا۔ وہاں بھی غار ہائے بو قلموں کی کثرت تھی اسی طرح بہت سے مندر تھے جہاں تیرتھ کے لئے دور دراز کے ہندو زائرین بغیر کسی پروانہ کے آتے تھے۔ اور عرصہ تک یہاں اُن کا جمگھٹا رہتا تھا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ہر انصاف پسند عالمگیر کا وجود دکن کے لئے باعث آزادی و مذہبی رواداری کا خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرزمین دکن ایک عظیم الشان وسیع ملک تھا۔ جہاں مختلف راج دھانیاں برسرِ اقتدار تھیں۔ آج بھی یہاں کے بڑے بڑے قلعے اور مندر گاہیں اُن کے تمول اور مذہبی تخیل کا ثبوت دیتی ہیں۔ گو اورنگ زیب کا اُن پر تسلط ہو چکا تھا مگر اُس نے اُن کے حقوق کی حفاظت اور رعایا کی حمایت کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ جنہوں نے بیدر، ورنگل اور گولکنڈہ وغیرہ کے قلعے دیکھے ہیں، اُن پر اُنہوں نے قدیم مندر گاہوں کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ ان کو محفوظ دیکھ کر کوئی عقلمند خواہ وہ کسی مذہب کا ہو مذہبی رواداری کا خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب اورنگ زیب نے دکن کو فتح کیا تو اپنے ساتھ اپنا تمدن بھی لایا۔ یہ مذہبی حکومت کو اسلامی آئین و قوانین کے مطابق چلاتا تھا۔ اکبر کے عہد میں جو رسمیں رائج تھیں وہ کم و بیش شاہجہاں کے دور تک جاری تھیں۔ اگر عالمگیر اسلامی شعار اختیار نہ کرتا تو بہت ممکن تھا کہ تیموری سلطنت ہندو سلطنت سے مبدل ہو جاتی۔ سنہ شمسی جو اکبر کے عہد سے چلا آتا تھا اُس کو سن قمری سے بدل دیا پوشاک اور درباری تمدن جو ہندوانی طرز لیا ہوا تھا اُس میں بھی تبدیلی کر دی۔ اُس نے تمام درباریوں اور عام باشندوں کو اسلامی مساوات کا سبق سکھلا کر بادشاہ پرستی کو مٹایا۔

ان فتوحات سے نہ صرف امور سلطنت اور فوجی معاملات میں استحکام ہوا بلکہ علم و سخن کا آفتاب بھی چمکا۔ جس طرح سکندر کے حملوں سے ہند کو منجملہ اور چیزوں کے علمی اور ادبی ذخیرہ ہاتھ آیا اسی طرح اورنگ زیب کے اُن فتوحات سے اُردو زبان کی نشو و نما کے لئے راستہ کھل گیا۔ اس نے ولی[1] کی ہمت بڑھائی جس سے اُس کا اُردو کلام دار السلطنت میں قبولیت عام کی سند حاصل کرنے کے قابل ہوا۔ اُس سے دوسروں کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے شاعر پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ اُس نے ایک مجلس منعقد کی جس میں علماء، فضلا بلائے گئے تھے۔ اُن کی مدد سے اورنگ زیب نے مختلف کتابوں سے مواد لے کر اسلامی قانون کی ایک جامع کتاب بنائی جس کو "فتاویٰ عالمگیری" کہتے ہیں اس کتاب کے اکثر قوانین آج بھی حکومت برطانیہ میں رائج ہیں۔ ہر موضع اور تعلقہ میں حدیث و فقہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اور محنتی اور شوقین طلبا کو خزانہ شاہی سے وظائف مقرر کئے۔ ان کی ذہنی اور دماغی قابلیتوں کو اچھی طرح پرورش کیا تاکہ وہ آئندہ اپنی زندگی اپنے ملک اور سلطنت کی خدمت میں وقف کر سکیں۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کے سخر کرنے اور مرہٹوں کے استیصال کے لئے اورنگ زیب دکن میں ایک عرصہ تک رہا۔ اس کو مرکزی حکومت سے اطلاعیں فاصلہ کی وجہ سے وقت پر نہیں ملتی تھیں۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر سکھوں نے زور پکڑا اور خاصی طاقت فراہم کر لی۔ جس سے انہوں نے پنجاب پر چھاپہ مارا۔ اس کے انسداد کے لئے عالمگیر کو اپنی توجہ صرف کرنی پڑی ان ہی اسباب کی بنا پر دکن بہت جلد فتح نہیں ہوا۔ گو حکومت کی جانب سے اُن کا معقول انتظام کیا گیا تاہم انہوں نے اورنگ زیب کی عدم موجودگی میں اپنی طاقت مستحکم کر لی تھی۔ جس سے حکومت کو خاص توجہ مبذول کرنی پڑتی تھی۔
شمالی ہند سے فوجیں کئی مہینوں کے بعد دکن آتی تھیں جس سے مغلوں کو ایک بڑی رقم خرچ

[1] ولی دکنی شاعر اورنگ آباد کا باشندہ جس کو دنیا بابائے اُردو کا آدم تسلیم کر چکی ہے ۱۲

کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ دکنی ریاستوں کا تمول کچھ کم نہ تھا۔ اس لحاظ سے مغلوں کا روپیہ بھی کافی صرف ہوتا تھا۔

غرض ان فتوحات سے دکن میں مستقل لڑنے والے پیدا ہوئے۔ اور ایک اعلیٰ فوج مرتب ہوئی جس میں جنگجو اور مسلح سپاہی تھے ضرورت کے وقت وہ غنیم کا مقابلہ کرتی اور ملک میں اطمینان وسکون کا باعث ہوتی تھی۔ دشمنوں کا ایک ایک کرکے خاتمہ کیا گیا۔ مرہٹوں کی بڑی طاقت منتشر کردی گئی۔ اب ان کا کوئی ماسن نہ تھا۔ جب دکن میں امن وتنظیم قائم ہوگئی تو صنعت وحرفت میں اہل ملک نے ترقی کی اور اس میں اعلیٰ شغف حاصل کیا۔ کسی ملک کی ترقی اور عروج کا راز و دارومدار وہاں کی صنعت پر ہے انگلستان کو لیجئے اس نے جو آج نمایاں ترقی کی وہ محض صنعت وحرفت کی بدولت ہے۔ صنعت کی ترقی تجارت پر ہے۔ اہل ملک کے جہاز دور دراز کے ممالک کو جایا کرتے جس میں ان کے صنعتی ذوق اور اعلیٰ مذاق کی چیزیں ہوتی تھیں۔ اس سے ان کے تعلقات وسیع اور اثرات قوی ہوتے گئے۔ زراعت کو نمایاں ترقی ہوئی۔ کیونکہ یہاں شمالی ہند کے وہ اصول اختیار کئے گئے جو وہاں کے اعلیٰ ترین اصول تھے۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوا۔ دکن کا تمول بڑھا۔ اور حکومت کو کافی مالگزاری وصول ہونے لگی۔ دولت کی کثرت سے تکلف اور راحت کی چیزوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس کا اظہار عالیشان عمارتوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا تمدن اور ان کا طرز معاشرت جنوبی ہند پر پڑے بغیر نہیں رہا۔ چنانچہ اس وقت تک بھی مغلیہ تمدن کا اثر دکن میں زندہ ہے اور اس کے اثرات ہر شعبہ زندگی میں پائے جاتے ہیں۔

مصحفی کا تذکرۂ ہندی

(از:- عمر یافعی ـــ)

مصحفی کے تذکرۂ ہندی کے معلومات کے لیے آب حیات (آزاد) تذکرہ شعرا (حسرت موہانی) مثنوی بحر المحبت (مرتبہ مولوی عبدالماجد) صحیفہ مصحفی (مرتبہ میر آفاق موسوی) مصحفی کا تذکرہ (مضمون مولوی عبدالسلام ندوی) رسالہ معارف اگست ۱۹۲۳ء) دیکھنے کی ضرورت تھی، دیکھا، جس میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کے مضمون کے سوا مصحفی اور مصحفی کی شاعری ہی شاعری ہے جب آپ کا جی چاہے "آب حیات" میں:-

(مصحفی)

واللہ کہ شاعر نہیں، تو بھانڈ ہے بھڑوے

(انشا)

اڑتے ہوئے آتے ہیں مصحفی و مصحفن

پڑھ لیجیے!

اور زیادہ سے زیادہ مصحفی کے سات دیوان تھے یا ان کے اتنے شاگرد، مصحفی کے شاگردوں میں شیخ ناسخ بھی ہوں یا نہ ہوں اور مصحفی نے سات دیوان لکھے بھی یا نہیں، اس بحث سے اردو ادب اور تاریخ کو شاید اتنا فائدہ نہیں پہنچ سکتا جتنا مصحفی کی تالیفات میں تذکروں کی تحقیقات سے پہنچ سکے گا۔ مصحفی کے "تذکرہ ہندی" کی تحقیق خود مصحفی کے تذکرہ کی روشنی میں کرنی زیادہ بہتر ہوگی، اس تحقیق سے پہلے مصحفی کی شخصیت کو بھی مصحفی کے قلم سے دیکھیے کہ وہ اپنے باب میں کیا کہتی ہے:-

(تذکرہ فارسی)

"مصحفی - مولف ایں مجموعہ - فقیر حقیر غلام ہمدانی کہ مصحفی تخلص میکند او را نیز لازم آمد کہ در ردیف هم اشعار خود را ہم زینت تذکرہ نماید تا بدیں واسطہ داخل حلقۂ مجلس یاراں باشد"

(تذکرہ ہندی)

"مخفی نماند مولف ایں تذکرہ کہ غلام ہمدانی نام دارد و تخلص مصحفی میگند از دیر زمانش اباعن جدا نوکری خانہ بادشاہ کردہ اند از ایامے کہ تفرقہ شدیدے در سلطنت راہ یافتہ سلطنت خانہ ایں

رو سیاہ ہم بخاک سیاہ برابر نشدہ۔ ہم از تمتع دنیا بہرہ وافی داشتند۔ ایں فقیر چونکہ بخت و طالع آنچناں نداشت ناچار از آغاز شباب بہ مقتضائے موزونی طبع مصروف تحصیل علم بود۔ چنانچہ بفیض صحبت بزرگان اول از تکمیل نظم و نثر زبان فارسی و تحقیق محاورہ و اصطلاحات آں فراغت حاصل کردہ بہ مقتضائے رواج زمانہ آخرکار خود را مصروف ریختہ گوئی داشتہ۔ برائے آنکہ رواج شعر فارسی در ہندوستان بہ سبب ریختہ کم است۔ و ریختہ ہم فی زماننا بہ پایۂ اعلےٰ فارسی رسیدہ بلکہ از و سپر گردیدہ چنداں مصروف فارسی نماندہ است۔ دوازدہ سال در شاہجہاں آباد بدور نجف خاں مرحوم بگوشہ خلوت خزیدہ۔ زبان ریختہ اردوئے معلےٰ کمال دریافت نمودہ۔ و ہرگز برائے تلاش معاش دراں حشر اجساد اموات بر در کس نرفتہ۔ اگرچہ بہ سبب فارسی گوئی در یاران مسلم الثبوت فارسی گو ہم شمردہ می شود امانام برآوردہ بریختہ است۔ و آں چہ دریں مدت تصنیف و تالیف کردہ ایں است:۔

دو دیوان فارسی بزبان فصیح کہ یکے درجواب مولانا نظیری نیشاپوری ہنوز ناتمام داشت و یکے بطور خود تمام۔

و سہ دیوان ہندی۔

و دو تذکرہ یعنی فارسی و ہندی۔

و یک دو جز شاہنامہ ناتمام تا نسب نامہ حضرت شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی وغیرہ

و یک دیوان ہندی کہ در شاہجہاں آباد گفتہ۔

مع مسودہ دیوان فارسی اول کہ زبانش بطور جلال اسیر و ناصر علی بود و پسند رفتہ میخو است کہ کلام خود را آخر ہمہ صاحبان نویسند۔ اما حرف المیم برآں آورد کہ بردیف میم داخل باشد لہذا مرخرفات خود را شامل ایں جریدہ کردہ شد تا بر صفحہ روزگار یادگار بماند ے

(انتخاب)

سنا ہے مصحفی میں جب سے شعر عرفی کا
ہمیشہ ہات گریباں سے ہے مرا گستاخ

بسلسلۂ کہ کشائی قبا بیاد آور
کہ میکشا د کسے بند ایں قبا گستاخ

کریں گے خواب راحت یا یہی جنجال ہووے گا
خدا جانے کے بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا

یہ خیال اک دن اسی صورت فزوں ہو جائے گا
رفتہ رفتہ مجکو سوجھے ہے جنوں ہو جائے گا
ان حنائی ہاتوں کو پردے میں رکھو بہر خدا
مفت میں ظالم کسی کا ورنہ خوں ہو جائے گا

کل میں جو راہ میں اسے پہچان رہگیا
کچھ وہ بھی مجکو دیکھ کے حیران رہ گیا
سمجھے وہ صید خستہ مرے اضطراب کو
سینہ میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا
شوخی تو دیکھ تیر کو سینہ سے کھینچ کر
کہتا ہے "میرے تیر کا پیکان رہ گیا!"

نظر آتے ہیں پردے تری آنکھوں کے گلابی سے
کہیں مے پی ہے تو نے یا اٹھا ہے نیم خوابی سے

وھاں روزن دیوار بھی اب بند ہوئے ہیں
تا سینہ کے روزن کوئی دکھلانے نہ پاوے

شعر از دیوان دوم

قفس سے چھوڑ دے تو اب تو ہم کو اے صیاد
چمن میں کہتے ہیں پھر موسم بہار ہوا
صبا جو پوچھے خبر مصحفی کی تجھ سے وہ شوخ
تو کہیو ہنس کے میں صدقے ترے نثار ہوا

مرض عشق سے گر اب کے سنبھل جاؤں گا
تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا
مجکو قاصد کے تغافل نے تو مارا ہی ہے
اور ظالم یہی کہتا ہے کہ "کل جاؤں گا"

آ گیا یار کا دامن جو مرے ہاتھ کبھو
میں نے رومال سمجھ دیدۂ گریاں پہ رکھا

پردہ اٹھا کے اس نے جو سینہ دکھا دیا
میں چاک کر کے اپنا گریباں اڑا دیا

قصد کرتا ہوں جو اس در سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے "تو جا! میں تو نہیں آنے کا"
بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

جو خط بھیجوں تو خط کو آگ پر رکھدے ہے وہ ظالم   جو قاصد جاے تو قاصد کے وہاں پڑ رہے نکلتے میں

پھر قیامت ہے جو وہ شوخ چھپالے منہ کو   اپنا دیدار ہمیں روز جزا دکھلا کر
خواہ دیوانہ کہے خواہ وہ وحشی مجکو   مصحفی میں اسے حال اپنا چلا دکھلا کر

از دیوان سوم

جو دیکھے ہے نقشے کو ترے وہ یہ کہے ہے۔   سارا بدن انسان کا چہرہ ہے پری کا۔"

چھپ چھپ کے وہ گھر غیر کے مہمان گیا تھا   چوری کی نظر میں وہیں پہچان گیا تھا
کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہمسے   یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا
جانے کا نہ لے نام شب وصل ہے پیارے   سن بات مری میں ترے قربان گیا تھا

کب میں یاروں کے پیش دیکھ پکارا نہ کیا   پر کسو نے مری تربت پہ گذارا نہ کیا

مہندی ہے کہ قہر ہے خدا کا   ہوتا ہے یہ رنگ کب حنا کا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے تیری   کم بخت یہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

کاغذ کا ورق یہ پاے صورت (قطعہ) نقاش اسے بناے صورت
چہرے پہ نظر نہیں ٹھہرتی   اللہ رے تری صفاے صورت

بیٹھے ہے جو کوی اُس بت پرفن کے برابر   اُس دوست کو ہم سمجھے ہیں دشمن کے برابر
کیا جانیے اُس تیغ کو کیا سوجھے ہے اس دم   پھر جاے ہے آ آکے جو گردن کے برابر

مصحفی کے تذکروں کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے کہ:-

مصحفی نے ایک تذکرہ فارسی شعرا کا لکھا اور دو تذکرے اردو شعرا کے لکھے،

گارسان دتاسی نے "ہندوستانی مصنفین اور اُن کی تصانیف" کے عنوان سے جو رسالہ لکھا ہے اس میں مصحفی اور مصحفی کے تذکروں کی نسبت یہ تحقیق کی ہے کہ:-

"اٹھارویں صدی کا آخری تذکرہ مصحفی کا ہے یہ بھی فارسی میں ہے سنہ تالیف ۱۲۰۹ھ (۹۵-۱۷۹۴ء) میں نے اس مصنف کے متعلق جو کچھ اپنی کتاب تاریخ ادب میں لکھا ہے، اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں ایک تو یہ کہ فان ہیمر کی رائے کے بہ موجب جو انھوں نے میری کتاب کے تبصرے میں ظاہر فرمائی ہے اُن کے نام کا تلفظ (بہ فتح میم) کرنا چاہیئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ لئے قرآن یعنی مصحف سے نسبت ہے۔

شیفتہ کا قول ہے کہ مولف دہلی میں پیدا ہوا تھا اور وہ ہندوستانی اور فارسی میں اپنے فن کا اُستاد تھا شیفتہ سے اُن کی ملاقات لکھنو میں ہوی اور ان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ شیفتہ نیز کریم الدین کا بیان ہے کہ مصحفی نے ریختہ کے چھ دیوان لکھے ہیں۔ بہر حال فرح بخش (لکھنو) کے دیوان ہائے مصحفی کے قلمی نسخے میں صرف چار دیوان ہیں اور یہ چاروں ہندوستانی زبان میں ہیں۔ مصحفی نے فارسی میں بھی کئی دیوان لکھے ہیں اور فارسی شعرا کا بھی ایک تذکرہ لکھا ہے اس کے علاوہ ایک شاہنامہ بھی لکھنا شروع کیا تھا جو ناتمام رہ گیا اس میں شاہ عالم تک کے عہد کے واقعات منظوم کئے ہیں۔

مصحفی نے اپنا اردو شعرا کا تذکرہ میر مستحسن خلیق کی فرمائش سے لکھا جس میں محمد شاہ کے عہد سے لیکر اپنے وقت تک کے شعرا کا حال درج ہے اور جن کی تعداد تقریباً ایک سو پچاس ہے مولف نے خاص کر اپنے ہم عصروں کے حالات بیان کرنے میں عالی ظرفی کا اظہار کیا ہے۔

مصحفی نے بڑی عمر پائی تھی کیونکہ اُن کی وفات "گلشن بے خار" کے چھپنے سے دس سال قبل یعنی ۱۸۲۲ء کے قریب ہوی، لیکن کریم الدین اُن کی وفات کا سال ۱۸۱۱ء بتاتے ہیں۔ ان کی شہرت اُس دور کے آخر میں ہونی شروع ہوی جس میں سودا۔ جرات اور انشا کا دور دورہ تھا وہ حاتم کے بھی ہم عصر رہے ہیں جیسا کہ حاتم کے دیوان زادہ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ قائم جو دلی کے مشاعروں میں موجود تھا، ان کے بہت سے اشعار نقل کرتا ہے۔ سرور نے کوئی ۱۲ صفحوں میں ان کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔"

(رسالہ اردو، جنوری ۱۹۲۸ء)

مصحفی کے فارسی تذکرہ اور ایک اردو تذکرہ کے وجود کا تو پتہ نہایت آسانی کے ساتھ چل جاتا ہے۔
لیکن بعض لوگ جہاں دیوانوں کی تعداد سات بتاتے ہیں وہاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ :۔
"مصحفی نے اردو شعراکے دو تذکرے بھی لکھے"
بقول مولوی عبدالسلام ندوی کہ :۔
اس تذکرہ کے بعد اگر مصحفی نے شعرائے اردو کا کوئی تذکرہ لکھا ہے تو ہم کو اس کا حال معلوم نہیں"
میرا خیال یہ ہے کہ تذکرۂ زیر مضمون کے خاتمہ کی عبارت سے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یقین ہو گیا ہو کہ مصحفی نے ایک اور تذکرہ بھی لکھا ہے، خاتمہ کی عبارت ملاحظہ کیجیے :۔

خاتمہ

"بر ضمیر منیر آئینہ نظر مبصران گوہر معنی مخفی و محتجب نماند کہ مولف ایں کتاب تذکرہ غلام ہمدانی ولد ولی محمد ابن درویش محمد کہ بہ مصحفی شہرت دارد از تشتت حواس و پریشانی خاطر ناساعدی زمانہ کجا فرصت آں داشت کہ تصحیح احوال و اشعار شعراء سابق و حال پرداختہ نقش ایں جریدہ را بروے کار آرد۔ اما اکنوں کہ بہ پیروی بخت سعید در حضور پر نور مرشد زادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہ بار یافتہ ہمیشہ مورد گوناگوں مہربانی آں مہر سپہر خلافت و جہانداری می باشد فرصت را غنیمت شمردہ مخشوش ایں تذکرہ ہا کہ از چند سال بطاق نسیاں افتادہ بود صاف نمودہ و درست ساختہ۔ احوال اکثرے در و بشرح و بسط سطور است۔ و احوال بعضے از متقدمین و متاخرین کما ینبغی آگاہی بعض بر اوقات آنہا حاصل نشدہ بطور بیاض سمت تحریر یافتہ"
خاتمہ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ (۱۲۰۹) ہجری سے پہلے مصحفی نے اس تذکرہ کو لکھا تھا مگر اپنے گوناگوں مصائب کی وجہ سے وہ اس پر نظر ثانی نہ کر سکے، مرشد زادہ سلیمان شکوہ کی سرکار میں جب آئے تو انھیں اتنی فرصت مل گئی کہ نظر ثانی کر کے تذکرہ کو صاف کر لیا، اور جن شعرا کے حالات و واقعات نہیں معلوم ہو سکے ان کے کلام کو ایک بیاض کے طور پر الگ لکھ ڈالا، اگرچہ تذکرہ کی انشا بیاض سے ہی ہوتی ہے لیکن بیاض اور تذکرہ دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں، بیاض کو کبھی تذکرے کے نام سے یاد نہیں کر سکتے؛ مصحفی کا یہ دوسرا تذکرہ اردو خواہ بیاض ہی کیوں نہ ہو جب تک ہاری دسترس نہ ہو سکے اس سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی؛ ان کا یہی ایک تذکرہ بہت قابل قدر ہے۔ گارساں دتاسی نے مصحفی کے اس تذکرہ کے شعرا کی تعداد تقریباً ایکسو بیاسی بیان کی ہے۔ میرے پیش نظر تذکرے میں ایک سو نواسی ۱۸۹ شعرا کی تعداد ملتی ہے۔ مصحفی نے خاتمہ سے پہلے

پانچ شاعر عورتوں کا بھی حال ایک تمہید کے ساتھ لکھا ہے اگر ان کو بھی شریک کر لیا جائے تو (۱۹۴) کی تعداد ہو جاتی ہے چنانچہ فہرست سے ظاہر ہوگا۔

فہرست شعرا

نمبر شمار	تخلص	نام
	ا	
۱	آفتاب	شاہ عالم بہادر شاہ
۲	آصف	نواب وزیر آصف الدولہ
۳	آبرو	شاہ مبارک
۴	اوباش	شیخ امیر الزماں
۵	الہام	شاہ ملول
۶	اثر	محمد میر
۷	الم	صاحب میر
۸	امیر	نواب محمد یار خاں
۹	امجد	مولوی امجد
۱۰	اسد	میر امانی
۱۱	احسن	مرزا حسن علی
۱۲	آشفتہ	مرزا رضا قلی
۱۳	امین	امین الدین خاں
۱۴	افسوس	میر شیر علی
۱۵	احقر	مرزا جواد علی
۱۶	اکبر	عرف ہجو
۱۷	انشا	میر انشاء اللہ خاں

نمبر شمار	تخلص	نام
۱۸	اختر	میر اکبر علی
۱۹	آشفتہ	بھورے خاں
۲۰	افسر	غلام اشرف
	ب	
۲۱	بیدار	میر محمدی
۲۲	بیان	خواجہ احسن الدین خاں
۲۳	بے تاب	
۲۴	بے جان	عزیز خاں
۲۵	بے باک	میر نجف علی
۲۶	بقا	بقاء اللہ خاں
۲۷	برق	میاں شاہ وجہی
۲۸	پروانہ	پروانہ علی شاہ
۲۹	پروانہ	راجہ جسونت سنگھ
۳۰	بشر	میر بشارت علی
	ت	
۳۱	تاباں	میر عبد الحی

نمبر	تخلص	نام
۳۲	تجلی	عرف میاں حاجی
۳۳	تنہا	شیخ محمد عیسی
۳۴	تصور	سید احسان حسین
۳۵	تمکین	سید سیادت علی
۳۶	تسلی	لالہ ٹیکارام

ث

نمبر	تخلص	نام
۳۷	ثنا	میر شمس الدین
۳۸	ثاقب	میاں شہاب الدین

ج

نمبر	تخلص	نام
۳۹	جوشش	محمد عابد
۴۰	جوش	رحم اللہ
۴۱	جہاندار	شاہزادہ ولیعہد
۴۲	جرات	قلندر بخش
۴۳	جوان	بہادر علی شاہ
۴۴	جوان	مرزا نعیم بیگ

ح

نمبر	تخلص	نام
۴۵	حسن	میر حسن
۴۶	حیران	میر حیدر علی
۴۷	حسن	خواجہ حسن
۴۸	حسرت	جعفر علی
۴۹	حجام	عنایت اللہ
۵۰	حزیں	______
۵۱	حیرت	میر مراد علی
۵۲	حاتم	شیخ ظہور الدین
۵۳	حشمت	محتشم علی خاں
۵۴	حیف	میر چراغ علی
۵۵	حضور	لالہ بال مکند
۵۶	حکیم	محمد پناہ خاں
۵۷	حقیقت	میر شاہ حسین

خ

نمبر	تخلص	نام
۵۸	خاکسار	میر محمد یار
۵۹	خلق	میر احسن
۶۰	خلیق	میر مستحسن

د

نمبر	تخلص	نام
۶۱	درد	خواجہ میر درد

ذ

نمبر	تخلص	نام
۶۲	ذوقی	شاہ ذوقی

ر

نمبر	تخلص	نام
۶۳	رضا	مرزا احسن رضا
۶۴	رافت	مرزا قاسم علی
۶۵	رنگین	سعادت یار خاں
۶۶	رفاقت	مرزا لکھن
۶۷	رضا	میر رضا علی
۶۸	رند	نواب مہربان خاں
۶۹	رسوا	مہتاب رائے
۷۰	راغب	مرزا سبحان قلی بیگ

ز

۷۰	نہار	میر جیون
۷۱	زار	میر مظہر علی
۷۲	زماں	سید محمد زماں

س

۷۳	سائل	مرزا محمد یار بیگ
۷۴	سوز	محمد میر
۷۵	سعادت	میر سعادت علی
۷۶	سکندر	
۷۷	سوزاں	مرزا احمد علی خاں
۷۸	سربز	مرزا زین العابدین خاں
۷۹	سلیمان	مرزا سلیمان شکوہ
۸۰	سلیم	میر سلیم پٹنوی
۸۱	سودا	میرزا رفیع
۸۲	سبقت	مرزا مغل

ش

۸۳	شیدا	
۸۴	شرف	شیخ شرف الدین
۸۵	شگفتہ	مرزا سیف علی
۸۶		مرزا ابراہیم
۸۷	شکوہ	محمد رضائی
۸۸	شائق	میاں پیر محمد
۸۹	شہید	
۹۰	شہرت	
۹۱	شوق	

ص

۹۲	صفدری	
۹۳	صابر	
۹۴	صادق	میر صادق علی

ض

۹۵	ضیا	میر ضیاء الدین

ط

۹۶	طپش	محمد اسمعیل
۹۷	طالب	طالب حسین خاں

ع

۹۸	عارف	محمد عارف
۹۹	عظیم	مرزا عظیم بیگ
۱۰۰	عاقل	عاقل شاہ
۱۰۱	عیش	مرزا حسین رضا
۱۰۲	عشقی	مراد آبادی
۱۰۳	عظیم	
۱۰۴	عشق	شاہ گھسیٹا

غ

۱۰۵	غضنفر	غضنفر علی خاں
۱۰۶	غیرت	
۱۰۷	غلامی	شاہ غلام محمد

ف

۱۰۸	فراق	ثناء اللہ خاں
۱۰۹	فیض	میر فیض علی
۱۱۰	فغاں	اشرف علی خاں
۱۱۱	فدوی	محمد محسن
۱۱۲	فدوی	لاہوری
۱۱۳	فدوی	عظیم آبادی
۱۱۴	فدوی	مرزا عظیم بیگ سوداگر
۱۱۵	فدا	مرزا فدا حسین

ق

۱۱۶	قدرت	مولوی قدرت اللہ
۱۱۷	قدرت	مولوی قدرت اللہ
۱۱۸	قیس	احمد علی بیگ
۱۱۹	قدرت	شاہ قدرت اللہ
۱۲۰	قائم	قیام الدین علی
۱۲۱	قسمت	نواب شمس الدولہ
۱۲۲	قبول	
۱۲۳	قاصر	مرزا ابیر علی بیگ

ک

۱۲۴	کاتب	مرزا احمد علی
۱۲۵	کمال	شاہ کمال الدین حسینی
۱۲۶	کبیر	حکیم کبیر علی
۱۲۷	کلیم	محمد حسین

گ

۱۲۸	گوہری	بداونی
۱۲۹	گرم	مرزا حیدر علی

ل

۱۳۰	لطیف	میر شمس الدین
۱۳۱	لطف	مرزا علی لطف

م

۱۳۲	مجذوب	مرزا غلام حیدر
۱۳۳	مظہر	مرزا جان جاناں
۱۳۴	میر	میر محمد تقی
۱۳۵	محبت	نواب محبت خاں
۱۳۶	محنت	مرزا حسین علی
۱۳۷	مائل	مرزا محمد یار بیگ
۱۳۸	مشتاق	عنایت اللہ
۱۳۹	مشتاق	
۱۴۰	مشتاق	عبداللہ خاں
۱۴۱	منشی	میر محمد حسین
۱۴۲	مقتول	مرزا ابراہیم
۱۴۳	مضطرب	لالہ درگا پرشاد
۱۴۴	مضطر	لالہ کنور سین
۱۴۵	مرہون	مرزا رضا علی
۱۴۶	ماہر	میاں فخرالدین
۱۴۷	معلوم	میر فرزند علی

نمبر	تخلص	نام
۱۴۸	محزوں	عالم شاہ پیرزادہ
۱۴۹	محبت	.
۱۵۰	مست	.
۱۵۱	مقصود	.
۱۵۲	مایل	میاں محمدی
۱۵۳	مایل	.
۱۵۴	منت	میر قمر الدین
۱۵۵	محب	شیخ ولی اللہ
۱۵۶	منتظر	میاں نور الاسلام
۱۵۷	ممنون	.
۱۵۸	محترم	خواجہ محترم خاں
۱۵۹	مصدر	میر ماشاء اللہ
۱۶۰	مضمون	میاں شرف الدین
۱۶۱	مزمل	شاہ مزمل
۱۶۲	معین	میاں معین الدین
۱۶۳	محشر	مرزا علی نقی
۱۶۴	معروف	الٰہی بخش خاں
۱۶۵	مروت	صغیر علی
۱۶۶	مصحفی	شیخ غلام ہمدانی

ن

نمبر	تخلص	نام
۱۶۷	نثار	میر عبد الرسول
۱۶۸	نثار	محمد امان
۱۶۹	ناجی	محمد شاکر
۱۷۰	نظام	نواب عماد الملک
۱۷۱	نعیم	نعیم اللہ
۱۷۲	ندیم	مرزا علی قسلی
۱۷۳	نالاں	میاں عسکری
۱۷۴	نصیر	میاں نصیر
۱۷۵	نحیف	.
۱۷۶	نوا	.
۱۷۷	نادر	.

و

نمبر	تخلص	نام
۱۷۸	واقف	شاہ واقف
۱۷۹	وحشت	.
۱۸۰	والا	مظہر علی خاں
۱۸۱	وہم	میر محمد علی

ہ

نمبر	تخلص	نام
۱۸۲	ہادی	میر جوان
۱۸۳	ہاشم	میر ہاشم علی
۱۸۴	ہاتف	مرزا محمد ہاتف
۱۸۵	ہدایت	ہدایت خاں
۱۸۶	ہوش	میر شمس الدین

ی

نمبر	تخلص	نام
۱۸۷	یقین	انعام اللہ خاں
۱۸۸	یکرنگ	مصطفیٰ خاں
۱۸۹	یکرو	میاں یکرو

مجلہ مکتبہ

جلد (۴) شمارہ (۴)

مستورات

۱۹۰ دولہن بیگم

۱۹۱ جینا بیگم زوجہ جہاندار شاہ

۱۹۲ زوجہ عماد الملک

۱۹۳ زینت نازک

۱۹۴ مونی

مصحفی نے اس تذکرہ سے تقریباً دس بارہ برس پہلے فارسی کا تذکرہ (عقد ثریا) لکھا ہے جس کا تذکرہ اس تذکرہ میں جابجا آگیا ہے عقد ثریا میں ایسے بائیس (۲۲) شاعروں کا ذکر ہے جنہوں نے اردو میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے میر محمدی بیدار، رائے جس ونت سنگھ پروانہ، مرشد زادہ جہاں دار شاہ جہاندار، شیخ ظہور الدین حاتم، خواجہ میر درد، میر سوز، سوز۔ میرزا رفیع سودا، اشرف علی خاں فغاں۔ محمد قیام الدین علی قائم چاندپوری۔ میرزا جان جاناں مظہر میر محمد تقی میر، میر قمر الدین منت، عماد الملک نظام کے حالات بھی اس تذکرہ میں ملتے ہیں، یہ شعرا مصحفی کے فارسی اور اردو تذکروں کے گویا مشترک شاعر ہیں، ان دونوں تذکروں کے مشترک شعرا کے حالات بالمقابل مطالعہ کرنے سے مصحفی کے تالیفی زور وضعف کا اندازہ ہو جائے گا کہ ایک ہی مولف ایک ہی شاعر کی نسبت دس بارہ برس پہلے کیا رائے رکھتا تھا اور اس کے بعد ماحول سے متاثر ہو کر کس حد تک اپنی تالیفی قوت کو ایک حال پر رکھنے میں کامیاب ہوا ہے

اس کے متعلق ترتیب نقل یہ ہوگی کہ شاعر کا حال پہلے تذکرہ سے نقل کیا جائے گا اور اس کے بعد تذکرہ اردو سے انتخاب کلام کے ساتھ، فارسی کی علامت (الف) اردو کی (ب) ہے:—

بیدار

(الف) بیدار، میر محمدی۔ از مشاہیر شعرائے ریختہ گو است۔ گاہ گاہے فکر شعر فارسی ہم کردہ ومیکند از دست (۱۱ شعر ہیں)

(ب) بیدار کہ میر محمد علی نام دارد۔ وبہ میر محمدی بیدار مشہور است شاگرد مرتضیٰ قلی بیگ فراق تخلص کہ شاعر فارسی گذشت، جوانیست محمد شاہی۔ تمامت حال خود را بہ لباس درویشی آراستہ دارد یعنے لمبہ گیروی بر سرتاج می بندد و دیگر لباس او بطور دنیا داران است۔ در عہد سہرائے استقامت دارد دیوان ریختہ اش مشہور زبانش بسیار شستہ و رفتہ کم کم فکر شعر فارسی ہم میکند چنانچہ اشعار فارسی خود را نیز از قسم چند غزل و رباعی و دو سہ قصیدہ کہ در نعت و منقبت وغیرہ گفتہ بہ پشت سرورق دیوان خود نوشتہ داخل ساختہ چوں اعتقاد بجناب مولوی فخر الدین صاحب

بسیار داشتہ ہرگاہ کہ از عشرت[1] سرائے در مدرسہ غازی الدین خاں برائے دیدن آں بزرگ می آمد گاہگاہی با فقیر ہم اتفاق ملاقات می افتاد و صحبت شعر بہ میاں می آمد حالا میگویند کہ از چندے در اکبر آباد رونق افزاست دیوانش از نظر فقیر گذشت انتخاب اوست ؎

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجیے گا ۔ ایک ملنے کو نہ کم کیجیے گا

گر یہی زلف یہی مکھڑا ہے ۔ غارت دیر و حرم کیجیے گا

جی میں ہے آج بجائے مکتوب ۔ یہی بیت اس کو رقم کیجیے گا

"مہربانی سے پھر اے بندہ نواز ۔ کہیے کس آن کرم کیجیے گا؟"

گزرے ہے شب شباب ہوا روز شب اخیر ۔ کچھ بھی خبر ہے قافلہ آگے نکل گیا

قابل مقام کے نہیں بیدار یہ سرائے ۔ منزل ہے دور خواب سے اٹھ، دن تو ڈھل گیا

ہو گیا گرتے ہی میری چشم سے دامن کے پار ۔ اشک تھا بیدار یا یہ آگ کا پرکالہ تھا

حیف ہے ایسی زندگانی پر ۔ کہ فدا ہو نہ یار جانی پر

حال سن سن کے ہنس دیا میرا ۔ کچھ تو آیا ہے مہربانی پر

ہے بعد مرگ گور میں شور جنوں ہنوز ۔ میں کشمکش میں دست و گریباں کی ہوں ہنوز

مقدور کیا مجھے کہ کہوں وہاں کہ یہاں رہے ۔ ہیں چشم و دل گھر اس کے جہاں چاہے ڈھل رہے

نے میکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا ۔ محو خیال یار رہے ہم جہاں رہے

بیدار زلف کھینچے ادھر چشم یار ادھر ۔ حیراں ہے دل کہاں نہ رہے کس کے ہاں رہے

کیا ہوے گلشن میں آ کر اے عزیزاں شاد ہم ۔ لووے ہر گل کے گلے لگ یار کو کر یاد ہم

قتل تو کرتا ہے آخر کھول دے آنکھیں ٹک ایک ۔ دیکھ لیویں تیری صورت پھر کہ اے جلاد ہم

قاصد اس کا پیام کچھ بھی ہے ۔ یا دعا یا سلام کچھ بھی ہے

تو جو بیداریاں پھرے ہے خراب ۔ پاس ناموس و نام کچھ بھی ہے؟

جان تک تو نہیں ہے تجھ سے دریغ ۔ اے میں قربان کیوں تو برہم ہے؟

اٹھ کے لوگوں سے کنارے آیئے ۔ کچھ ہمیں کہنا ہے پیارے آیئے

---

[1] غالباً عرب سرائے ہوگا ۱۲

کچھ تو کی تاثیر نالے نے جو پیارے — آئے تم مدت میں بارے آئیے
نصیحت سے بیدار کیا فائدہ — جو ہو آپ ہی اُس کو سمجھائیے

سلام بھی ہی زمانہ میں اور دعا بھی ہے — ہمارے یار نے قاصد سے کچھ کہا بھی ہے

جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہو گئے — شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہو گئے

جی میں بیدار تیرے ملنے کے — آہ کیا کیا خیال رکھتا ہے

یوں مجھ پر جفا ہزار کیجو — پر غیر کو تو نہ پیار کیجو

کہاں ہے طالع بیدار یہ کہ ایسا ہو — کہ سر دھرے مری زانو پہ یار سوتا ہو

صورت اُس کی سما گئی جی میں — آہ کیا آن بھا گئی جی میں
تو جو بیدار یوں ہوا تارک — ایسی کیا بات آگئی جی میں

ان کہنے کو نہ جا چھوڑ کے اس وقت مجھے — بات رہ جائیگی اور دن تو گذر جاتے ہیں

تیری ہم خاطر نازک سے خطر کرتے ہیں — ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
یہ وہی فتنہ و آشوب جہاں ہے بیدار — دیکھ کر پیر و جواں جس کو حذر کرتے ہیں
آہ مت پوچھ کہ کس طرح کٹی شب تجھ بن — صبح کی رو رو گلے لگ در و دیوار کے ساتھ
آئینہ دیکھ تو اس منہ سے تجھے ہے طوطی — دعوئی ہم سخنی اُس لب و گفتار کے ساتھ

اُس آئینہ رو کے ہو مقابل — معلوم نہیں کدھر گئے ہم
اُس پری صورت بلا انگیز کو دیکھا نہیں — ناصحو معذور ہو کر مجکو سمجھاتے ہو تم
حالت بیدار اب کیا کیجیے آگے بیاں — وقت ہے اب بھی اگر تشریف فرماتے ہو تم

پروانہ

الف - پروانہ - اسمش رائے جسونت سنگھ است و والدش راجہ بینی بہادر نائب مختار سرکار علیین مکانی وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر بودہ وحالا در آوان دولت وزیر اعظم دستور معظم نواب آصف الدولہ بہادر دام اقبالہ در کنج انزوا نشستہ بالجملہ رائے مذکور در عمر کمی اکثر کتب فارسی تحصیل نمودہ و دواوین تذکرۂ اساتذہ فراہم آوردہ قدرت شعرگوئی و وقت طبع بدرجۂ بلیغ بہم رسانیدہ گوے سبقت از ہمزادان خود ربودہ و برائے

این چیزہائے کم کم خیال بدیگرے فنون غریبہ مثل طب و رمل و سیر کتب تواریخ و نوشتن
خط شکستہ تا آنکہ شفیعا میسر دارد۔ اصلاح شعر فارسی از رائے سرب سنگھ دیوانہ گرفت۔
چوں از چندے خیال شعر ہندی ہم دامن گیر حالش شدہ دریں فن تعین استادے ندارد
و بقوت فارسی ریختہ را بخوبی بسرانجام میرساند۔ بقصاید ہم دست انداز است و ازیں
جہت است کہ جوشش بہ شعرائے ریختہ بسیار دارد۔ دیوان فارسیش قریب دو ہزار بیت
بر بیاض دیدہ شد زبانش عاشقانہ شستہ و رفتہ است۔ از انتخاب اوست۔ (بہت سے
شعر نقل کیے ہیں)

ب۔ راجہ جسونت سنگھ پروانہ تخلص عرف کاکاجی پسر راجہ بنی بہادر کہ رکن رکین نواب شجاع الدولہ مرحوم
بود جوان خلیق و ذی شعور است پیش ازیں شعر فارسی میگفت و از نظر رائے سرب سنگھ دیوانہ میگذرانید چنانچہ
اشعار فارسیش پیش فقیر در شاہ جہان آباد بوساطت مرزا قتیل رسیدہ بودند در ہماں ایام داخل تذکرہ شدند اما در
روزہائے کہ مولف از شاہ جہان آباد بہ لکھنؤ رسید چوں غائبانہ ہمیشہ مشتاق ملاقات می ماند خبر آمدن ایں خاکسار
شنیدہ بسیار بہ دلگرمی و تپاک پیش آمدہ و از ہماں ایام عطف عنان فکر شعر فارسی بہ طرف ریختہ کردہ خود را شب
روز در گفتن شعر ہندی مصروف داشت تا اینکہ بعرصہ دوازدہ سال شدہ باشد مشق او بسیار رسا و پختہ گردیدہ
در گفتن قصیدہ و غزل طور مرزا رفیع را مسلم میدارد و اکثر بر صد معنی ہائے تازہ بیت میگوید و پیش از آمدن فقیر
کہ ہنوز آغاز شوق او بود اعتقاد بہ ہمہ سازندہ مثل میر تقی و میر حسن و میاں بقاء اللہ وغیرہ داشت اکنوں از
تہ دل بہ فقیر رجوع کلی دارد و درستی اشعار درستش موقوف مشورۂ ایں ہیچمدان باعتقاد افتادہ ایں ہم خوبی اوست
والا شاعریش از ہیچ صاحب طبیعتی کم نیست از وست۔ شعر

کھا تیغ نگہ جب تری گھایل کو غش آیا گویا وہ دم نزع میں بسمل کو غش آیا
کرنے کو کیا قتل یہ خوں بہتے جو دیکھا ٹھیرا نہ گیا سامنے قاتل کو غش آیا

ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی غم خواری کرے بے وفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کرے
دیکھتے ہی اس کو چہرہ پر بحالی آگئی زعفرانی رنگ جو تھا اس میں لالی آگئی

جہاں دار

الف۔ جہاندار مرشد زادہ جہاندار شاہ کہ جہاندار تخلص میفرماید از بسکہ در جمیع فنون یگانہ
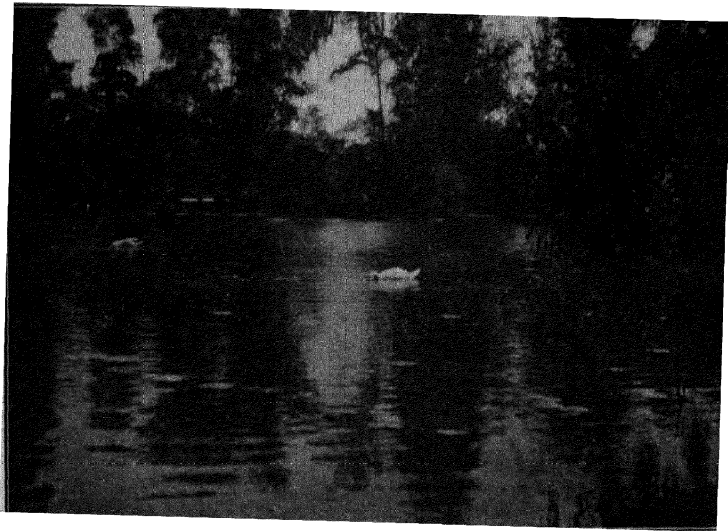
باغ عام کا ایک خوشنما منظر

روزگار و وحید زمان است بہ مقتضائے موزونی طبع فکر شعر ہندی و فارسی چنانچہ باید
می کند از دست۔

ب۔ جہاندار تخلص شاہزادہ ولی عہد خورشید رکاب صاحب خطاب کہ ازبس علو ہمت و سمو منزلت مرتبہ
عالی جاہی خود را بہ اوج افلاک رسانیدہ دوست در بارش ہنگامہ ابر نیساں را سر دساختہ با وصف استغنائی
مزاج کہ خاصہ بادشاہانست خود را بہ کسب و علم و ہنر نیز مصروف داشتہ و کمالات بسیار در ذات بابرکاتش
جمع آمدہ معہذا بہ مقتضائے موزونی طبع گاہ گاہے خیال شعر ہندی و فارسی نیز می فرماید از دست شعر

قصد ہر چند کیا سیکھنے کا بلبل نے وضع نالہ کی مرے اُس سے اڑائی نہ گئی

کہاں طالع جو پہنچیں اُس کے در تک رہے دوری سے ہم اُس کو نگر تک

رسائی میرے نالہ اور دعا نے کہاں پائی اجابت اور اثر تک

بجھاؤں شمع ساں کیا اب جہاندار شرار عشق تو پہونچا جگر تک

مر کس کے انتظار میں یہ بے اجل گیا آنکھیں جو یوں کھلی رہیں اور دم نکل گیا

(باقی)

فرہادِ ثانی

ایک دردناک افسانہ

(طبعزاد جناب سید شبیر حسین قیس متعلم جامعۂ عثمانیہ)

(۱)

"فردوسِ ہند" کشمیر کی آبادی سے تقریباً دو فرلانگ پر ایک پرفضا مرغزار میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے جس کے اطراف مہندی کی باڑ لگی ہوئی ہے۔ سامنے ایک چھوٹا سا تالاب ہے۔ اس کے گرد چند سبز پوش پہاڑیاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ایک حصار کھینچ دیا ہے۔ جو اس دلفریب منظر کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہا ہے۔

شام کا وقت ہے سورج روپوش ہو چکا۔ کہیں کہیں سے تارے سیاہ ابروں میں سے چمک رہے ہیں ظلمتِ شب ترقی کر رہی ہے۔ معمول کے خلاف آج اس جھونپڑی میں اداسی چھائی ہوئی ہے۔ مکین بھی نظر نہیں پڑتے۔ آج بوڑھا جس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی بسترِ مرگ پر پڑا آخری سانس لے رہا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ چہرہ اس امر پر دلالت کر رہے ہیں کہ عالمِ شباب میں وہ جوانِ رعنا ہوگا۔ ایک چھوٹا لڑکا جس کی عمر ۱۲ سال کی ہوگی بازو بیٹھا آنسو بہا رہا ہے۔ وہ بار بار مریض کے منہ پر منہ ملتا ہے۔ اور دردانگیز آواز میں کہتا ہے "پیارے ابا! بات تو کیجئے"۔ لڑکے کے گریہ سے باپ چونک جاتا ہے۔ اور تسلی دیتا ہے۔ اور اپنی مایوس نظریں دروازہ پر ڈال کر پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن افسوس اس موقع جانکاہ پر نہ کوئی پرسانِ حال اور نہ تعزیت دار۔

آٹھ بجے کا وقت تھا۔ مریض نے اپنی نحیف آنکھیں کھولیں۔ اس کی پتلیاں حلقۂ چشم میں گردش کرنے لگیں۔ اس نے خورشید کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بیٹا مت رو اللہ نگہبان ہے۔ جس کے تم گیت گایا کرتے ہو ــــ لیکن افسوس ــــ افسوس! آج زمیندار صاحب بھی نہیں آئے جن سے

میں کچھ کہہ لیتا..... دفعتاً کسی کی چاپ نے اس کا قطع کلام کیا۔ اس نے گردن بلند کی۔ خورشید کی آنکھیں دروازہ پر جھک گئیں۔ بوڑھا کسان چلا اُٹھا "میرے آقا" اور نقاہت سے اُس کی گردن پھر تکیہ سے جا لگی۔

اُس نے زمیندار صاحب سے التجا کی کہ وہ خورشید کو اپنے سایۂ عاطفت میں رکھیں۔

زمیندار صاحب نے دلاسا اور اطمینان دلایا۔ بوڑھے کسان نے ہچکی لی۔ خورشید پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی دو گرم آنسوؤں کے قطرے اُس کی آنکھوں میں آئے۔ اور اُس نے آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لیں۔

خورشید کا واویلا جھونپڑی کو ماتم کدہ بنا رہا تھا۔

دوسرے روز زمیندار صاحب تجہیز و تکفین کے بعد خورشید کو گھر لے آئے۔ اور اُس کے لئے ہر چیز کا انتظام کر دیا۔

خورشید نوروز کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ نہایت تیز فہم اور پھرتیلا تھا۔ اُس کی آنکھیں گول و سیاہ تھیں۔ رنگ گورا تھا۔ وہ ایک ہنس مکھ لڑکا تھا۔ وہ ایک نوخیز مغنی تھا۔ اُس کی آواز میں ایک خاص درد تھا۔ وہ اکثر اپنے باپ کے سکھائے ہوئے گیت گاتا تھا۔ جس کو زمیندار بہت شوق سے سُنا کرتے تھے اُن کی نظر میں وہ ایک اچھا مغنی تھا۔ اُس کی نغمہ سرائی میں عجیب کیفیت تھی — ایک وجدانیت۔

زمیندار نعیم خاں کو نوروز اور خورشید سے بہت محبت تھی۔ اور ہمیشہ اُن کا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک سخی اور باعزت شخص اور ایک بڑے زمیندار تھے۔

(۲)

خورشید گو ایک دوسری فضا میں داخل ہو چکا تھا۔ اور اُس کو ہر قسم کا آرام مل رہا تھا۔ مگر باپ کا صدمہ رہ رہ کر ستاتا تھا۔ لیکن وہ بچہ تھا اس لئے وہ بہت جلد کھیلنے کودنے لگا۔ اُس کا حُسن اور بشاشت عود کر آئی۔ اور خورشید پھر وہی خورشید تھا۔

نعیم خاں نے اُس کی تعلیم ایک مولوی صاحب سے شروع کروا دی جو اُن کی لڑکی مہ لقا کو پڑھایا کرتے تھے۔

مہ لقا نعیم خاں کی چہیتی لڑکی تھی۔ اُس نے آٹھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ وہ ایک حسین بچی تھی۔ اُس کے بال جزر و مد کی طرح تھے۔ اُس کی آنکھیں میخانۂ فطرت کے جام تھے۔ جو ہمیشہ مستانہ و مخمور رہتیں۔ اُس کے سُرخ پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح سُرخ تھے! "وہ حسن کا حسین ترین نمونہ ہو گی۔

اُف! اُس کی کافر جوانی کس بلا کی ہوگی"۔ یہ تھے خیالات جو ہر شخص اُس کو دیکھ کر قایم کرتا تھا۔ وہ ایک دوشیزہ تھی سراپا ناز۔ لعبتِ حسن تھی قابلِ الفت۔

مکان کے اندرونی حصہ میں ایک خوبصورت سا باغ لگا ہے۔ جس میں خورشید اور رعنا کھیلا کودا کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو حسن کی جیتی جاگتی مورتیں اچھل کود رہی ہیں۔

چھ سال اسی طرح گزر گئے ــــ

عالمِ طفلی گزر چکا۔ اب دونوں شباب کی مستیوں میں چور ہیں۔ اُن کے پیمانۂ دل محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اُن کی آنکھیں الفت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

(۳)

ایک روز خورشید شام کے وقت اپنے الگ کمرہ میں بیٹھا ایک رسالہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس نے پچیسویں ورق کی سُرخی۔ "افسانہ محبت"۔ دیکھی جو ایک مشہور افسانہ نگار کے قلم کا نتیجہ تھا۔ اُس کی آنکھیں لفظ محبت سے چمکنے لگیں۔ جب وہ اس حصہ مضمون پر پہونچا تو اُس نے آنکھیں جما دیں ــــ

"اے محبت تو ایک پھول ہے جس کی خوشبوئے نشاط تمام جہان اور تمام قلوب کو مہکا رہی ہے۔ تو ہماری حیاتِ مستعار کو فرحت دینے والی شئے ہے۔ آہ تو ایک جذبہ ہے۔ بے پایان۔ کیف آور، روح پرور، تو ایک شمع ہے اور تیرے کئے پروانے۔ اے محبت تیری دنیا مختلف۔ تیری ادا نرالی۔ تیرے نام لیوا جدا۔ اُن کے خیال اور۔ اُن کے رموز علیحدہ۔

لیلیٰ مجنون، شیریں فرہاد، قیس ولبنیٰ غرض کئے تیرے شکار ہوئے۔ تو نے اُنہیں دربدر پھرایا آشفتہ حال و بدنام کیا۔ تو نے انہیں دیوانہ بنایا ایک کو نجد کی گرم ریت میں تڑپایا اور مارا مارا پھرایا۔ دوسرے کو تیشہ کا نشانہ بنایا۔ لیکن انہوں نے تیرا دامن نہیں چھوڑا۔ اور مرتے دم تک تیرا ہی اے محبت دم بھرتے رہے۔ اُن کا انجام حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں۔

اے محبت! اے قدرتی جذبے، اے مسرت زا لمعہ تو کس قدر ایک سہمی بلی کی طرح چپکے چپکے ان معصوم ہستیوں کے قلوب میں جلوہ گر ہو جاتی ہے ــــ" یہاں پر خورشید رکا اُس نے اپنی حالت پر غور کیا۔ اُس کے جذبات اسے دریائے محبت میں ڈھکیل رہے تھے اُس نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

"اے محبت حیف تو تدریجی صورت میں معصوم دلوں میں بڑھتی ہے۔ تو انہیں رسوا کراتی ہے۔

عالم جوانی میں تو عشق کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو کبھی خوشی کے آنسو رُلاتی ہے۔ اور کبھی خون کے۔ تیرا دنیائے اسٹیج کمیڈی اور ٹریجڈی کے دوڈرامے پیش کرتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں ــــ اور وہ کسی گہرے خیال میں ڈوب گیا ــــ دو منٹ گزر گئے۔ ہنوز اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کی پتلیاں اندر ہی اندر متحرک تھیں۔ اُس کے ہونٹ جنبش کر رہے تھے۔ اُس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس کے مُنہ سے ایک لخت نکلا "پیاری مہ لقا ــــ" وہ کچھ اور کہنے والا تھا۔ مگر وہ کہہ نہ سکتا تھا۔ اُس کی زبان رُک گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہیں۔ اُس کا چہرہ فق اور ساکت تھا۔ کیونکہ اس کے سامنے مہ لقا محبت بھری نگاہوں سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرہ پر ہلکی سی مسرت کی سُرخی تھی۔ اُس کا انداز قابلِ پرستش تھا۔ دونوں کی نگاہیں محبت کی بہترین ترجمان بنی ہوئی تھیں۔ خورشید کے مرتعش ہاتھوں سے رسالہ نیچے گر پڑا۔ مہ لقا نیچے جھکی۔ اُس نے رسالہ اُٹھایا اور خورشید کی جانب بڑھا کر کہا۔ "بھیّا میں ناحق دخل انداز ہوئی۔ آپ ــــ آپ پڑھئے میں جاتی ہوں" یہ کہکر وہ پلٹی۔ خورشید نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہ لقا اُس کی طرف مڑی۔ اور اُس نے دیکھا کہ خورشید گردن نیچی کئے کسی تذبذب میں ہے۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ اُس نے نہایت بیتابی سے مہ لقا کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ مہ لقا نے اپنے ہاتھ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی۔ وہ شرم سے سرنگوں تھی۔ اس کا دل اچھل رہا تھا خورشید نے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ مہ لقا نے اپنے ایک انداز میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ جس کو خورشید ہی کے دل نے خوب سمجھ لیا۔ اُس کی شرمگیں نگاہیں محبت پاشی کر رہی تھیں اور اُس کے ہونٹ خفیف سی مسکراہٹ سے جنبش کر رہے تھے۔ انہوں نے پُر محبت نظروں سے ایک دوسرے کو پیام محبت دیا۔ خورشید خوشی سے اُٹھ کھڑا ہوا "مہ لقا" مہ لقا نے ایک شوخ ادا سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور وہ چوکھٹ تک تیزی سے چلی گئی۔ وہ چوکھٹ پر رُکی۔ اُس نے گردن پھیر کر خورشید کو دیکھا۔ وہ ہنسی۔ مگر یہ ہنسی زمانہ طفلی کی ہنسی سے جداگانہ تھی۔ اس ہنسی سے محبت کے پھول جھڑ رہے تھے خورشید دونوں ہاتھ پھیلائے اُس کی طرف بڑھا۔ مہ لقا نے اب کھڑا رہنا مناسب نہ سمجھا اور ہرنی کی طرح کلیلیں مارتی صحن میں بھاگ گئی۔ اور خورشید پر اس کے اس انداز نے ایک بجلی گرا دی اور وہ دروازہ سے چمٹا مہ لقا کو دور ہی سے دیکھتا کھڑا رہا۔

(۴)

دوسرے روز نعیم خاں اپنے کاروبار پر لاہور جانے والے تھے۔ اس لیئے انہوں نے سب کو تاکید کر دی کہ خورشید کا خیال رکھیں اور اُسے کوئی تکلیف نہو۔ اور گھر پر اپنے چچیرے بھائی شاہد کو چھوڑ گئے۔

شاہد ایک سخت اور حاسد شخص تھا۔ اور اس کے یہ ضمیر میں تھا کہ کسی نہ کسی کو برباد کر دے۔ جب سے کہ خورشید سن بلوغیت پر پہنچا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں سہ لقا اس سے نہ بیاہی جائے وہ چاہتا تھا کہ اپنے لڑکے حامد سے جو کسی طرح سہ لقا کے قابل نہ تھا سہ لقا کی شادی ہو۔ نعیم خاں کی خورشید پر روز افزوں محبت اور عنایت جیسا کہ اُن پر حق تھا اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ وہ کسی طرح نہیں چاہتا تھا کہ خورشید اپنی آئندہ زندگی اس گھر میں گزارے۔ اس کے علاوہ وہ اُن کی نگاہوں سے تاڑ گیا تھا کہ اُن میں محبت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اکثر حامد کو نعیم کے پاس بھیجا کرتا تاکہ سہ لقا اور نعیم اس کو چاہنے لگیں۔ مگر سہ لقا دور ہی سے اُسے آتا دیکھ کر چیں بجبیں ہو جاتی اور کسی کام میں مشغول ہو جاتی۔ وہ حامد سے دور ہی رہنا پسند کرتی تھی کیونکہ وہ اول تو صورت کا اچھا نہیں تھا اور دوسرے اُس کے ڈھنگ بھی ناگوار تھے۔

خورشید نے اُردو فارسی میں کئی کتابیں ختم کر لی تھیں اور نعیم کا ارادہ تھا کہ خورشید کو بہت جلد اسکول میں داخل کرا دینا چاہیئے۔ وہ ایک لڑکا تھا اور مولوی صاحب اُسے محبت سے پڑھاتے تھے۔ سہ لقا بھی ذہین تھی۔ مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ تین چار روز سے اُن کو سبق اچھی طرح یاد نہیں ہوتا۔ چونکہ وہ سخت اور تند مزاج تھے اس لئے انہوں نے خورشید کو تنبیہ کی۔ اور سہ لقا کو سمجھایا۔ مگر خورشید اب محبت کا پتلا بن گیا تھا۔ جب کبھی کتاب لیکر بیٹھتا تو فوراً سہ لقا کا خیال دماغ میں بندھ جاتا۔ اس لئے وہ سبق یاد نہ کر سکتا تھا۔ وہ بولنا کچھ چاہتا تھا لیکن اُس کی زبان سے کچھ اور نکلتا تھا۔ کیونکہ اُس کی ملکۂ حسن سامنے رہتی تھی مولوی صاحب نے ایک روز سبق یاد نہ کرنے پر اُسے دو تین چھڑیاں رسید کیں۔ خورشید جس نے کبھی اب تک مار نہ کھائی تھی اپنی موجودہ غیر معمولی تبدیلی پر رونے لگا۔ سہ لقا کے بھی آنسو نکل آئے اور وہ پانی پینے کے بہانے سے اُٹھ کر چلی گئی۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد شام کے وقت دونوں باغ میں ملے۔ دونوں اُداس تھے۔ مگر یہ صرف تھوڑی دیر تک حالت رہی۔ سہ لقا نے خاموشی کو توڑا اور کہا "بھیا اے یہ وقت تفریح کا ہے نہ کہ رنج کا۔" اور اُس نے خورشید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور وہ کھڑی ہو گئی۔ خورشید نہایت خوشی سے اُٹھا اور دونوں باغ میں ایک طرف ٹہلنے لگے۔

خورشید کو مہ لقا سے محبت تھی۔ مگر وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کون جذبہ چٹکیاں لے رہا ہے۔ کونسی شمع حسن ہے جو اس کے قلب میں روشن ہے۔ وہ کونسی بوئے نشاط ہے جو اس کے دماغ کو معطر کر رہی ہے۔ وہ کونسا فطرتی خیال ہے جو اس کے دل میں سوچیں مار رہا ہے۔ اس ہی لئے وہ جذبات کو مہ لقا پر افشا نہ کر سکا۔ لیکن اب وہ سمجھا اس مضمر راز محبت کو جو اس کے دل و دماغ میں گدگدی کر رہا تھا۔

خورشید و مہ لقا خاموش ٹہل رہے تھے۔ مہ لقا بار بار اس کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر خورشید اس کے حسن عالم سوز سے حد درجہ متاثر تھا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ کس طرح اپنی محبت کو ظاہر کرے۔ وہ گہری پیچ میں پڑا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "عشق معشوق کے دل میں پہلے پیدا ہوتا ہے" سچ ہے۔ عورت صبر و حیا کی دیوی ہے اور اس کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ اس میں ڈوبی رہتی ہے۔ اس کی محبت ایک پتھر کی لکیر ہے۔ وہ اس راز کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہے۔ اور جب یہ بار اس سے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تو وہ اپنے جذبات اپنے حسیات عریاں کر دیتی ہے۔ چاہے اسے معلوم ہو کہ اس کا انجام برا ہے۔ اس وقت اس کا دل قابو میں نہیں رہتا۔ وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھتی کہ وہ کیا بک رہی ہے۔ جب وہ دل کھول کر کہہ ڈالتی ہے تو تب اس کے دل میں ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

مہ لقا کو خورشید سے کبھی کی محبت ہو گئی تھی۔ اور وہ کسی موقع کی متلاشی تھی کہ اپنے راز محبت کو اس پر ظاہر کر دے۔ اس نے بارہا خورشید کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ مگر خورشید جواب دینے سے قاصر رہا۔ لیکن اب خورشید اس کا پرستار بن چکا تھا۔ اور مہ لقا نے جب سے اس کی زبان سے "پیاری مہ لقا" سنا اسے معلوم ہو گیا کہ خورشید کو اس سے محبت ہو چلی ہے۔ مہ لقا اب اپنے جذبات کو روک نہیں سکتی تھی۔ اس کے جذبات سیل بے پناہ کی طرح امنڈ رہے تھے۔ یہ اس کے لئے بہترین موقع تھا۔

وہ چلتے چلتے رکی اس جگہ جھاڑوں کا بہت جھنڈ تھا۔ اور شام کی ہلکی سی تاریکی سے اور اندھیرا ہو گیا تھا۔ خورشید بھی تھم گیا اور اس نے مہ لقا کی طرف دیکھا۔ اور مہ لقا نے اپنی شرمیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ خورشید کا ایک ہاتھ مہ لقا کے مونڈھے پر تھا۔ اس کا دل اور مضبوط ہو گیا۔ "بہت دنوں سے کئی دن سے چاہتی تھی کہ آپ سے اپنا راز دل کہوں۔ مگر — مگر کوئی موقع نہیں ملا کہ بیان کرتی"۔ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ خورشید آگے سننے کے لئے بیتاب تھا۔ وہ مہ لقا کے بالکل قریب ہو تا گیا۔ "آہ مجھے...... آپ ...... آپ سے محبت ہے" مہ لقا نے رکتے رکتے کہا اور وہ تڑپ کر خورشید کے

سینہ سے لگ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے حائل تھے۔ اس کی پیشانی پر چند پسینہ کے قطرے نمودار ہوگئے تھے اس کا سر خورشید کے سینہ پر تھا، زلفیں بکھری ہوئیں تھیں۔ اور آنکھیں بند۔ خورشید نے محسوس کیا کہ مہ لقا کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس نے اپنا منہ اُس کے سر پر رکھدیا اُس نے کہا "پیاری مہ لقا ــــ میری شہزادی میں ایک غریب خاندان کا لڑکا اس قابل نہ تھا کہ تم محبت کرتیں۔ میں اس قابل ہوں کہ تیری راہ محبت میں اپنے کو مٹا دوں۔ خود کو قربان کردوں۔ تری شمع حسن پر جل مروں۔ میرے بدن کا رونگٹا رونگٹا تیری محبت کا گیت گاتا رہے گا۔ میں تیرا ہوں ــــ بلکہ تیرا غلام۔ میں ہمیشہ تجھ سے محبت کروں گا۔ چاہے اس راہ میں کتنے ہی آفات کتنے ہی روڑے کیوں نہوں۔" اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ برابر بولتا جا رہا تھا۔ اس پر ایک کیفیت طاری تھی۔ معاً مہ لقا چونکی۔ اس نے درختوں میں سرسراہٹ کی آواز سُنی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا "آہ! "خورشید" اس نے چلاّیا۔ خورشید نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ شاہد سامنے کھڑا غضب آلود نگاہوں سے خورشید کو دیکھ رہا تھا۔ خورشید ہکا بکا ہو کر بھاگا۔ ہریالی پر پھسلا اور وہ زور سے زمین پر گر پڑا۔ اور اُسے ہوش نہ تھا۔ مہ لقا دوسری روش سے اپنے کمرہ میں بھاگ گئی۔ اس نے دروازہ بند کرلیا۔ وہ شرم اور رسوائی سے پانی پانی ہو رہی تھی وہ روتے روتے نیم بیہوش ہوگئی۔

شاہد نے مہ لقا کی والدہ سے سب حال کہہ سنایا۔ اور وہ غصہ سے سُرخ گئی۔ دونوں نے خورشید کو مکان سے باہر کردینے کا تہیّہ کرلیا۔

(۵)

دوسرے دن صبح کو خورشید نے جب آنکھ کھولی تو اپنے کو اپنی پرانی جھونپڑی میں پڑا پایا۔ اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ "مہ لقا ــــ پیاری مہ لقا" اُس نے چلاّیا۔ اس نے اپنے گرد دیکھا۔ اسے سناٹا سا ہوگیا۔ وہ وحشی کی طرح اپنے بال نوچ رہا تھا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ شدت غم سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ یہ وہی جھونپڑی تھی جس میں کہ وہ پیدا ہوا تھا۔ اور جس جگہ اُس نے اوائل زندگی مسرت و شادمانی سے گزاری تھی جس کی موجودگی باعث زینت تھی۔ آہ اب وہ خستہ حال، بے یار و مددگار پڑا تھا۔ جھونپڑی کا ہر بوسیدہ حصّہ ایک مہیب صورت اختیار کیا ہوا تھا۔ جس میں چڑیوں اور کوّں نے آشیانہ بنا رکھا تھا۔ خورشید کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ کبھی ہنستا ایک دیوانے کی طرح روتا ایک مظلوم کی طرح۔ وہ مظلوم جو محبت کے ہاتھوں تباہ ہوا ہو۔

اُس کے بال خاک آلود تھے۔

وہ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس نے اب نعیم خاں کے مکان جانا باعثِ ذلت سمجھا۔ وہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں بھوکا پیاسا چلا جا رہا تھا۔ راستہ چلنے والے اُس کو نہایت غور سے دیکھتے جاتے تھے۔ مگر وہ گردن نیچی کئے چلا جا رہا۔ وہ تھک گیا۔ اُس کی جیب میں چند پیسے پڑے تھے۔ جن سے اُس نے اپنا پیٹ بھرا۔ اتفاقاً اُس کا گزر تھیٹر کی طرف ہوا۔ جہاں لوگ اُس دن کے پروگرام بورڈ کے پاس کھڑے تھے۔ اُس نے مناسب سمجھا کہ وہ تھیٹر میں نوکر ہو جائے۔ وہ مجبور تھا کیونکہ دنیا میں اب اُس کا کوئی مددگار نہ تھا۔

دوسرے روز وہ تھیٹر میں نوکر ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد نعیم خاں لاہور سے واپس آ گئے۔ شاہد نے خورشید کے بابت تمام کہہ سنایا اور اس قدر بیچارے پر الزامات لگائے کہ نعیم اُس کی باتوں میں آ گئے۔ مگر وہ نہایت رحم دل تھے۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ خورشید کو اُس کی جھونپڑی میں دیکھ آئیں۔ کیونکہ انہیں اس سے ہمدردی اور محبت تھی۔

شام کو وہ جھونپڑی میں گئے۔ لیکن وہاں خورشید نہ تھا۔ جھونپڑی اُداس اور خالی تھی۔ نعیم کا دل پگھل گیا۔ انہیں خورشید کی دربدری کا خیال آیا اور وہ آبدیدہ ہو گئے۔ اور گھر واپس آئے۔

مہ لقا اب وہ مہ لقا نہیں رہی۔ وہ صورت دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ شرم کے مارے اپنے کمرہ ہی میں رہتی مگر خورشید کے لئے ہمیشہ تڑپتی۔ وہ دبلی ہو گئی تھی۔ اور کھانا پینا بھی کم ہو گیا تھا۔ والدین نے مناسب سمجھا کہ اس کی جلد شادی کر دی جائے۔ لہٰذا چند ماہ کے بعد اس کی زندگی اسی سے وابستہ کی گئی جس سے وہ بھاگتی تھی۔ جس کی صورت سے وہ بیزار تھی۔ جس دن سے اس نے سنا کہ اُس کی شادی حامد سے ہونے والی ہے وہ زار و قطار روتی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ عورتیں سمجھاتی ہیں مگر اس دکھیا کی قسمت میں ہی لکھا تھا کہ روتی رہے۔ بلکہ مرتے دم تک کسی کی جوگن بنی رہے۔ لوگ سمجھتے کہ اُس کا رونا تھوڑے عرصہ کے لئے ہے جیسا کہ بیاہی لڑکیاں رویا کرتی ہیں۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ اس کے آنسو اُس کے دل کے ٹکڑے ہیں۔ اُس کی آہیں جلے ہوئے قلب کے شعلے ہیں جو زندگی بھر جلتے رہیں گے اور اُس کا رونا اُس کی حسرتناک موت کے وقت سب کو خون کے آنسو رلائیگا۔ یہ شادی نہیں تھی کسی کی بربادی تھی کسی کی موت کا پیش خیمہ۔

حامد اپنی خوش قسمتی پر پھولا نہ سماتا تھا۔ اور اُس نے بیشک مہ لقا کے آرام و آسائش کے لئے تمام چیزیں جو کچھ وہ فراہم کر سکتا تھا فراہم کیں مگر مہ لقا ان سب سے بے اعتنا تھی۔ اس کا دل خورشید کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کے

اس کے دن خورشید کی یادیں اُس کی راتیں — بھیانک راتیں آہوں میں کٹتی تھیں۔ اُس کی زبان پر "خورشید۔ خورشید" تھا اُس کے دماغ میں اسکی محبت بسی ہوئی تھی اس کا چاند سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ سسرال والوں میں سے کسی نے اس کے بالوں میں تیل ڈالا تو ڈالا ورنہ وہ اپنی زیبائش سے بالکل لاپرواہ ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ مسکراتی تک نہ تھی۔

سسرال والے کہا کرتے "عجیب منحوس لڑکی ہے کہ ہمیشہ روتی ہی رہتی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ کچھ کام کرتی ہے۔ ہر لقا یہ طعنے سنتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ سرنگوں ہو کر آنکھوں پر ہاتھ لگا لیتی ہے۔ موت کو پکارتی ہے مگر موت نہیں آتی۔ چند دن بعد اُس نے خود کو سنبھالا اور گھر کا دھندا کرنے لگی۔

(۶)

خورشید نے تھیٹر میں شریک ہوتے ہی اپنا نام فدا حسین سے بدل دیا۔ اُس کی قدرتی آواز اور خدا داد حسن نے اُس کو بہت جلد لوگوں کی نظروں میں کھپا دیا اور وہ مشہور ہو گیا۔ وہ اکثر غمگین پارٹ لیتا اور اس خوبی سے ادا کرتا تھا کہ بہت سے لوگ رو دیتے۔ اُس کی ایکٹنگ نہایت خوبصورت تھی۔

غزالہ ایک سترہ سالہ حسین ایکٹرس تھی۔ وہی تھیٹر کی جان تھی اور لوگ اس ہی کی وجہ سے زیادہ آیا کرتے تھے۔ وہ کشمیری حسن کا بہترین نمونہ تھی۔ جب سے اُس نے خورشید کو دیکھا تھا اس وقت سے وہ اُس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ اُسے حسن کا فرشتہ سمجھتی تھی۔ غزالہ چاہتی تھی کہ کسی طرح خورشید کو اپنے دامِ الفت میں پھانسے۔ مگر خورشید اُس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ اُس کی نظروں میں اب تک مہ لقا تھی وہ مہ لقا کی محبت کو غزالہ کی محبت پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔ شام کے چار بجے ہوں گے اُس دن کے ڈرامہ کا ریہرسل ختم ہو چکا۔ غزالہ ایک ریشمی ساڑھی میں ملبوس خورشید کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ خورشید کرسی پر گردن جھکائے کسی خیال میں غرق تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آگے بڑھی۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج خورشید پر اپنی محبت جتلائے گی۔ مگر خورشید کو اُس کی چاپ تک نہ سنائی دی۔ وہ عالمِ طفلی کے تصور میں محو تھا۔ مہ لقا کی پیاری صورت اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اُس کا خیالی مجسمہ اُس کی نظروں میں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ واقعی مہ لقا سامنے ہے۔ "مہ لقا" وہ فرطِ خوشی سے چلایا۔ اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے غزالہ کو دیکھا۔ بلکہ غور سے دیکھا۔ غزالہ ساکت تھی۔ خورشید نے زور دیکر پوچھا۔

"غزالہ یہاں کیسی کھڑی ہو"

"بھیک مانگنے" اُس نے تمنا بھری نظریں ڈال کر جواب دیا۔

"کاہے کی"

"محبت کی" اُس کے ہاتھ ملے ہوئے تھے۔ گویا التجا کر رہے تھے۔

"کس سے؟" اُس نے ذرا برانگیختہ ہو کر سوال کیا۔

"آپ سے"۔ اور وہ نیچے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے۔ غزالہ یہ ناممکن ہے۔ غزالہ تم میرے پیچھے نہ پڑو۔ آہ میرے دل میں کسی اور کی محبت کے شعلے ہیں۔ یہ شعلے کسی طرح بجھ نہیں سکتے۔ جب میں مروں گا تو یہ شعلے میری خرمن ہستی کو آگ لگا دیں گے"۔

غزالہ خورشید کی نظروں میں زہریلی ناگن معلوم ہو رہی تھی۔ غزالہ نے چاہا کہ خورشید کے گلے میں باہیں ڈالے مگر خورشید نے ایک جبر کی دیگر اُسے ہٹا دیا۔ اُسے غصہ آگیا اور اُس نے فوراً باہر چلے جانے کو کہا۔ غزالہ کا دل کینہ اور بغض سے لبریز ہوگیا۔ وہ کمرہ کے باہر چلی گئی۔

اُس نے سوچا چونکہ خورشید مہ لقا کا دیوانہ ہے اس لئے اُس کے متعلق ہر کی بات سُننے کا یقین کریگا اُس نے خورشید کو برباد کرنے کی ٹھان لی۔ اور وہ واقعی میں زہریلی ناگن ثابت ہو رہی تھی اُس نے ایک چھوکرے کو الگ بلا کر کچھ کان میں کہا اور ایک روپیہ اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ لڑکے نے سر ہلایا اور وہ چلا گیا۔

(۷)

تھیٹر کے پروگرام بورڈ کے پاس ایک جم غفیر ہے۔ لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ بورڈ پر "شیرین و فرہاد" جلی قلم سے لکھا ہوا ہے۔ سب اس کھیل کو دیکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اور خوش ہو رہے ہیں۔

تمام شہر میں آج کے پروگرام کی دھوم ہوگئی۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ فدا کا اس ڈرامہ میں کام دیکھے۔ حامد نے بھی تہیہ کر لیا کہ آج وہ اور مہ لقا دونوں اس ڈرامہ کو دیکھیں گے۔

۹ بجے مہ لقا اور حامد تھیٹر ہال میں پہونچ گئے۔ اور مہ لقا زنانہ حصہ میں چلی گئی۔ جو اسٹیج سے قریب تھا۔ لوگ ہال میں کھچا کھچ بھرے تھے۔

حمد کے بعد کھیل شروع ہوا۔ فدا بجنسہ فرہاد معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہایت خوبی سے اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ اُس کی آواز سوز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس کے آنسو واقعی میں جاری تھے۔ لوگوں کے دل پسیجے جا رہے تھے۔

مہ لقا نے خورشید کو پہچان لیا۔ اُس کے دل کو ایک گونہ خوشی حاصل ہوئی۔ "خورشید" اُس کی زبان سے خود بخود آہستہ نکل گیا۔ اگر اُسے اپنی عزت کا خیال نہ ہوتا تو اسٹیج ہی پر جا کر خورشید سے ملتی۔ وہ خوشی سے پھولی

ہو رہی تھی۔

آدھ گھنٹہ کا وقفہ ختم ہوا۔ اور پھر کھیل اسی خوبی سے ہونے لگا۔

کھیل کا آخری سین شروع ہونے والا تھا۔ کلائمکس ہو رہی تھی۔ اور فرہاد اپنے پارٹ کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک دکھ بھری آواز سے وہ چونکا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا اس کی طرف روتا آ رہا ہے۔ لڑکے نے قریب آ کر کہا "سرلقا ــــ سرلقا کو آپ جانتے ہیں۔ میں ــــ میں اس کے خالو کے پاس نوکر ہوں۔ آہ سرلقا آج صبح کو انتقال ہو ــــ ہو گیا" اور وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ خورشید نے سنا۔ اس نے سب سمجھ لیا۔ وہ دیوانوں کی طرح اسٹیج پر آیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی زبان رک رہی تھی۔ اس نے بسولہ اٹھایا۔ "آہ سرلقا" ایک بے ساختہ چیخ اس کی زبان سے نکلی سرلقا نے ایک خوفناک نعرہ لگایا۔ ارشیرنی کی طرح سامنے کی چلمن توڑ دی۔ اور وہ اسٹیج کی طرف بے ساختہ بھاگی۔ مگر آہ اس درمیان میں خورشید نے بسولہ مار لیا تھا۔ تمام اسٹیج خون سے رنگین تھا۔ خورشید ــ پیارے خورشید" سرلقا نے چلایا۔ وہ خورشید کے پاس پہونچی۔ خورشید نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ "سرلقا" اس نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔ سرلقا اس سے لپٹ گئی۔ اس کی چیخوں سے تمام اسٹیج گونج رہا تھا۔ خورشید نے سرلقا کو ایک مرتبہ اور دیکھا اور اس کے چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ باقی تھی۔ جو سرلقا کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر ظاہر ہوئی تھی۔

سرلقا نے بیہوشی کے عالم میں ایک چیخ ماری۔ اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی اور دونوں کی روحیں ــــ پاک روحیں ملکر پرواز کر گئیں۔

حامد نے اس خبر جانکاہ سے تمام عزیزوں کو مطلع کیا۔ نعیم سر پکڑ کر رہ گئے۔ اس ناقابل برداشت غم کی وجہ سے ان کا دماغ خراب ہو گیا۔ دوسرے روز ایک پہاڑی دامن میں دونوں بازو بازو دفنائے گئے۔ لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔ ان جوان موتوں پر لوگ رو رہے تھے۔

خورشید کی قبر پر "فرہاد ثانی" کندہ کیا گیا اور اس کے سرہانے "سرو" اور سرلقا کے سرہانے گلاب کے درخت لگائے گئے۔

سنتے ہیں کہ ایک عجیب چڑیا دو گلاب کے پھول توڑ کر ان قبروں پر رکھ دیتی ہے۔ اور ایک غمناک گیت گا کر اڑ جاتی ہے۔ ان کی قبور پر اس قدر حسرت چھائی رہتی ہے کہ چرواہے اور جانور تک دور سے نکل جاتے ہیں۔ اور نزدیک نہیں آتے۔

غزل

از

(جناب مولوی حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب اخگر حیدرآبادی)

صبحدم تھا نالۂ بلبل غمِ پنہاں نما
گل بھی کرتا تھا چمن میں خندۂ دنداں نما

جلوۂ حیرت کا نقشہ ہے تیری صورت کا عکس
ہائے کیا آئینۂ اظہار ہے حیراں نما

آبلوں کے زخم جذبِ شوق میں پھٹنے لگے
کیا کشش ہے نوکِ خارِ دشت کی پیکاں نما

حشر برپا کر دیا وضعِ خرامِ ناز نے
ہے قیامت بھی ترے دامن سے اب داماں نما

بعد مدت کے ہوئے ہم قابلِ جور و ستم
یہ تمہارا ظلم بھی کیا کچھ نہیں احساں نما

پیرہن کو چھوڑ کر بھی قیدِ عریانی میں ہیں
ہو گیا ہے خانۂ تن ہم کو اب زنداں نما

ہے زباندانوں کا مجمع جمع ہیں سب اہلِ فضل
حیدرآبادِ دکن اخگرؔ ہے ہندستاں نما

خود اعانتی

از

(جناب مرزا نامر علی بیگ صاحب بی - اے)

(بسلسلہ سابقہ)

دولت مند اشخاص بھی خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ مراتب اور اعزاز رکھتے ہوں اگر کوئی غیر فانی شہرت و ناموری حاصل کر سکتے ہیں تو وہ محض ذاتی محنت اور قابلیت کے ذریعہ کیونکہ گو انسان اپنی آبائی ملک میں کسی قدر زمین کا مالک بن سکتا ہے لیکن علم اور عقل و دانش کسی کی میراث نہیں۔ دولتمند آدمی دوسروں سے جو کچھ کام لیتا ہے اُن کی محنت کا معاوضہ ادا کر سکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ دوسروں سے اپنا دماغی کام کروا لے یا دوسروں کا دماغ خرید لے حقیقت میں یہ اصول کہ ہر شعبہ زندگی میں کمال محض محنت ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے ایک دولتمند پر اسی طرح صادق آتا ہے۔ جس طرح کہ ڈرو اور گفرڈ پر جن کی درسگاہ ایک کفش دوز کی دوکان تھی نیز یہ اصول ہو یلر پر بھی صادق آتا ہے جس کا مدرسہ ایک پتھر کی کان تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ دولت اور عیش انسان کی اعلیٰ تربیت اور تعلیم کے لئے نہیں ہیں ورنہ دنیا ہر زمانہ میں ایسے اشخاص کی رہینِ منت نہ ہوتی جنہوں نے ادنےٰ مدارج سے ترقی کی۔ آرام و آسائش کی زندگی انسانوں کو دشواریوں سے مقابلہ کرنا نہیں سکھاتی۔ نیز اس قسم کا احساس بھی پیدا نہیں کر سکتی جس کی کہ محنت اور عمل کے لئے سخت ضرورت ہے حقیقت میں مفلسی ایک مصیبت ہے لیکن انسان خود اعانتی کے ذریعہ اُس کو اپنے لئے باعث برکت بنا سکتا ہے اور جس کی وساطت سے ایک راست باز صداقت شعار اور مستقل مزاج انسان ترقی کر جاتا ہے۔ بیکن کا قول ہے کہ "لوگ دولت کا صحیح مصرف جانتے ہیں اور نہ اپنی قوت کا۔ دولت کو ضرورت سے زیادہ اور قوت کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ خود اعتمادی اور نفس کشی انسان کو اپنے پیالہ سے پینا۔ اپنی غذا کھانا۔ قوت لبری کے لئے کوشش کرنا اور حاصل شدہ نعمتوں کا بہترین استعمال سکھاتی ہے"۔

دولت سے آرام اور کاہلی کی بے حد ترغیب و تحریص ہوتی ہے اور کاہلی کی جانب لوگ فطرتاً مائل نظر آتے ہیں۔ لیکن عزت و شہرت تو انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جو دولتمند گھرانوں میں یا متمول ماحول میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی نسل کی فلاح و بہبود میں بڑی کوشش کرتے ہیں اور "تعیشات کو ٹھکراتے اور عملی زندگی بسر کرتے ہیں" اس ملک کے متمول افراد کے لئے یہ امر باعث فخر و عزت ہے کہ وہ کاہل نہیں بلکہ ریاست کے کاروبار اور خصوصاً اہم و نازک معاملات میں وہ خاص اور غیر معمولی حصہ لیتے ہیں۔ جنگ بنن مولا کے موقع پر ایک افسر نے جس وقت وہ کیچڑ اور دلدل میں سے اس کی رجمنٹ کے قریب سے گزر رہا تھا یہ الفاظ کہے ہیں۔"

اس زمانہ میں بھی سباسٹوپال کے سر و نشیب اور ہندوستان کی جلتی زمین اس بات کی شاہد ہے کہ ہمارے ملک کے طبقہ شرفا نے بھی اسی قسم کی اعلیٰ النفس کشی اور عملی زندگی بسر کی ہے۔ اکثر ولیر اور عالی منش، ذی مرتبہ اور متمول افراد نے اپنے ملک کی خدمت کی انجام دہی میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا اور ذاتی اغراض کا ملکی مفاد پر ایثار کر دیا۔

متمول طبقوں نے بھی فلسفہ اور سائنس میں شہرت حاصل کی مثال کے طور پر فلسفہ جدید کے مورث بیکن اور سائنس داں ووسٹر۔ باٹیل کیا وندش ٹالیسٹ اور راس قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر کو طبقہ امرا کا زبردست کاریگر تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ دولتمند نہ ہوتا تو یقیناً ایک زبردست موجد ہوتا اس کی صنعتی قابلیت کا حال تھا کہ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک صناع نے جس کو اس کے رتبہ کا علم نہ تھا۔ اس کو ایک موقع پر ایک بڑے کارخانہ کے فورمین کی خدمت قبول کرنے مجبور کیا تھا۔ اس کی ایجاد کردہ بڑی راس دوربین یقیناً اپنی نوعیت کا وہ نہایت غیر معمولی اور نادر آلہ ہے جو اس کے زمانہ تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

شعبہ سیاسیات اور ادبیات میں خصوصاً ہم اعلیٰ طبقوں کے اکثر جفاکش اشخاص کو پاتے ہیں ان شعبوں میں بھی دیگر شعبوں کی طرح محض محنت و مشق اور مطالعہ ہی کے ذریعہ ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ وزیر اعظم یا پارلیمنٹ کے لیڈر کو بھی لازمی طور پر جفاکش اشخاص میں سے ہونا چاہیئے۔ پامرسٹن، ڈربی۔ رسل۔ ڈسرائیلی۔ اور گلاڈسٹن اسی قسم کے افراد تھے انہیں TEN HOWRS BILL سے سابقہ نہیں پڑا انہوں نے پارلیمنٹ کی مصروفیت کے زمانہ میں تعجب و رونہ کام کیا ہے۔ سر رابرٹ پیل کی ہستی عصر حاضر کے اسی قسم کے محنتی ذی شان اشخاص ہی میں سے تھی وہ مسلسل دماغی کام کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے اور اپنا کوئی وقت رائیگاں

نہیں کیا۔ اُن کی زندگی حقیقت میں اس امر کی ایک عجیب و غریب مثال تھی کہ ایک محدود اختیارات اور قوی والا شخص بھی اپنی انتھک محنت سے کس قدر کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ پارلیمنٹ کی شرکت کے چودہ سال کے دوران میں وہ بے اندازہ مشقت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دیانت دار راستباز انسان تھے۔ انہوں نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا اُس کو عمدگی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اُن کے تمام تقاریر سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ تحریری یا تقریری ہر معاملہ کے متعلق کافی مطالعہ اور غور و خوض سے کام لیا کرتے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ جفاکش تھے۔ اور تقریر کرتے وقت حاضرین کے گوناگوں طبایع کا انہیں خاص خیال رہتا تھا اور وہ اس بات کو مدنظر رکھ کر تقریر کیا کرتے تھے۔ علاوہ اس کے اُن کی ذات میں عملی کام کی صلاحیت۔ اُولوالعزمی۔ اور اپنی کوشش کے نتائج کے صحیح استعمال کی قابلیت بھی موجود تھی ایک لحاظ سے اُن کو اکثروں پر فوقیت حاصل تھی۔ ان کے اصول زمانہ کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتے گئے۔ اور بڑھاپے نے اُن کی طبیعت کو بجائے افسردہ کرنے کے بشاش بنانے کا کام کیا مرنے تک وہ نئے نقاط نظر کو تسلیم کرنے آمادہ رہتے تھے اور اگرچہ کہ اکثروں کا خیال تھا کہ وہ حد سے زیادہ محتاط تھے لیکن انہوں نے اپنی گذشتہ زندگی کی توصیف اسی طرح نہیں کی جس طرح۔ کہ اُن کے لئے تعلیم یافتہ دماغوں کا خاصہ بلکہ مرض ہوا کرتا ہے۔

لارڈ بروہام کی ان تھک محنت قریب قریب ضرب المثل بن گئی ہے۔ اُن کی پبلک مصروفیتوں کا زمانہ (۶۰) سال سے بھی زائد ہے۔ جس میں انہوں نے قانون۔ ادبیات۔ سیاسیات اور سائنس کے شعبوں میں عبور حاصل کیا۔ اور سب میں شہرت حاصل کی۔ یہ بات کہ یہ امتیاز انہیں کس طرح حاصل ہوا۔ اکثروں کے نزدیک ایک معمہ بنی رہی۔ ایک مرتبہ سر سیاسیول رومالی سے کسی نئے کام کی انجام دہی کی استدعا کی گئی تو اُس نے عدیم الفرصتی کا عذر کر کے اُس کام کے کرنے سے معافی چاہی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "اس کام کو بروہام کے پاس لے جاؤ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ہر کام کے لئے وقت ہے"۔ حقیقت یہ تھی کہ بروہام کا ایک منٹ بھی رائیگاں نہ جاتا تھا۔ علاوہ اس کے اس کی جسمانی قوت بہت زبردست تھی زمانہ پیری میں جبکہ اکثر اشخاص اپنی بدقت ہاتھ آئی ہوئی فرصت سے لطف اُٹھانے اور خاموشی یا وقت آرام کرسی پر گزارنے کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں لارڈ بروہام نے قوانین نور کی کامل تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا اور اُس کے نتائج پیرس اور لندن کے مشہور سینٹفک حلقوں میں پیش کئے اسی زمانہ میں اُس کی قابل تعریف تصنیف (MENOE 6GUNIE LIFB OF IHEREIYNOEGIEORYE III)

کے مسودے زیر طبع تھے اور وہ دار الامرا کے قانونی معاملات اور سیاسی مباحثات میں پورا حصہ لیا کرتا تھا۔ سڈنی اسمتھ نے ایک مرتبہ بروہام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تین قوی آدمیوں کا کام انجام دیا کرے لیکن لارڈ بروہام کو محنت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ کوئی کام اس کو مشکل اور دشوار نظر نہ آتا تھا بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کام کا شوق طبیعت ثانی بن گیا تھا اور ہر بات میں کمال پیدا کرنے کا شوق اس میں اس درجہ موجود تھا کہ اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اگر بروہام کفشدوز ہوتا تو جس وقت تک وہ انگلستان کا بہترین کفشدوز نہ بن جاتا اس کو چین نہ آتا۔

اسی شعبہ کی دوسری جفاکش ہستی سر ای بلور لٹن کی ہے ایسے مصنفین جنہوں نے اس کے مساوی کام کیا بہت کم ملیں گے نیز کسی نے اس کے برابر مختلف شعبوں میں دستگاہ حاصل نہیں کی۔ لٹن نے ناول نگاری۔ شاعری۔ ڈرامہ نویسی۔ مورخی۔ مضمون نگاری۔ مقرری۔ اور سیاست میں شہرت حاصل کی بلور کو آن واحد میں ترقی حاصل نہیں ہوگئی بلکہ تدریجی طور پر حاصل ہوئی۔ آرام طلبی اور سہل انگاری سے اس کو سخت نفرت تھی اور دوسروں پر سبقت لے جانے کا شوق اس کے دل میں ہمیشہ رہا کرتا تھا موجودہ انگریزی مصنفین میں بہت کم ایسے مصنف ہیں جنہوں نے اس کے برابر تصنیفات لکھے اور اعلیٰ امتیاز حاصل کیا۔ بلور کی ذاتی محنت ہر تعریف کی مستحق ہے۔ شکار۔ نشان اندازی۔ عیش و آرام کی زندگی۔ کلبوں کی سیر و تفریح۔ تماشہ گھروں کا لطف و تفنن۔ موسم گرما میں لندن کے دلفریب مناظر کی سیر ہزاروں فرحت بخش " " لطائف غیر ممالک پیرس دیانا یا روم کا سفر یہ تمام چیزیں ایک خوش نصیب اور عیش پسند انسان کو اپنے طرف مائل کرتی ہیں اور وہ ہر قسم کے مسلسل کام کی انجام دہی پر مستعد و آمادہ ہو جاتا ہے لیکن یہ تمام باتیں حاصل ہونے کے وجہ ممکن تھا کہ بلور اعلےٰ مدارج کے حصول اور ادبی زندگی سے انکار کر دیا ہوتا لیکن ان کے باوجود اس نے محنت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ بائرن کی طرح اس کی پہلی ادبی کوشش (گھاس اور خود رو پھول) کے عنوان کی ایک نظم تھی لیکن ناکامیاب ثابت ہوئی۔ دوسری کوشش فاکلینڈ نامی ناول کی شکل میں ظاہر ہوئی لیکن اس میں بھی بلور کو ناکامیابی نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں ایک پست ہمت انسان انشا پردازی کا خیال ترک کر دیا ہوتا۔ لیکن بلور ایک مستقل مزاج اور عالی حوصلہ آدمی تھا کامیابی کا عزم کر کے اس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ محنت سے کبھی جی نہ چراتا تھا کافی مطالعہ کے ذریعہ اس نے وسیع معلومات حاصل کئے ناکامیوں ہی سے اس کی ہمت بڑھتی گئی۔

اور اُسی کو ترقی حاصل ہوئی۔ ایک سال کے اندر فاک لینڈ کے بعد (پلہام) نامی کتاب شائع ہوئی اور بلور کی باقی ماندہ ادبی زندگی کے تیس سال کے دوران میں کامیابیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

مسٹر ڈسرائیلی کی ہستی بھی اس بات کی ایک مثال ہے کہ انسان محنت وجفاکشی کی بدولت اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اس کی پہلی کوششیں بلور کی طرح ادبی تھیں اور اُس نے کئی ناکامیوں کے بعد ہی کامیابی حاصل کی۔ لوگوں نے ونڈرس ٹیل آف ٹرائے اور رلوشنری ایک نامی تصانیف کا مضحکہ اڑایا اور انہیں محض ادبی جنون تصور کیا گیا لیکن اُس نے دوسرے شعبوں میں اپنی کوشش جاری رکھی اور اس کے تصانیف کانگس بی۔ سی بل۔ اور ٹانکرڈ اس کی جفاکشی کا ثبوت ہیں۔ پیل کو دارالعوام میں مقرر کی حیثیت سے بھی پہلے پہل ناکامی ہوئی اس کی تقریر کو اڈلفی کے ایک مضحکہ خیز نقل یا سوانگ سے بڑھی ہوئی چیخ و پکار سمجھا گیا۔ اگرچہ کہ اُس نے تقریر نہایت شاندار کی تھی لیکن ہر جملہ پر قہقہہ ہوتا تھا۔ کامیڈی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہیملٹ بھی اُس کے مقابلہ میں کوئی چیز نہ تھی۔ اُس نے اپنی تقریر ایک ایسے جملہ پر ختم کی جس میں ایک پیش گوئی مضمر تھی۔ جب اُس کی فصاحت پر ترحم کیا گیا تو اُس نے کہا کہ "میں نے اکثر بہت سے کام شروع کئے اور آخرکار اُن میں کامیاب رہا اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں لیکن ایک وقت ایسا آئیگا جب کہ آپ میری تقریر کو توجہ سے سنینگے"۔ یہ وقت یقینی آیا اور ڈسرائیلی نے پارلیمنٹ کی توجہ کو اپنے طرف منعطف کرانے میں کس طرح کامیابی حاصل کی اس امر کی بین دلیل یا نظیر ہے کہ محنت اور مستقل مزاجی سے کیسے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ڈسرائیلی نے محض صبر وتحمل اور محنت سے اعلیٰ رتبہ حاصل کیا۔ ایک مرتبہ ناکام ہونے کے بعد اکثر نوجوانوں کی طرح وہ پست ہمت ہوکر گوشہ نشیں اور افسردہ دل نہیں ہوگیا بلکہ دلچسپی سے کام کرتا گیا۔ اس نے بڑی کوشش سے اپنے نقائص معلوم کئے۔ حاضرین کی طبائع کا مطالعہ کیا اور فن تقریر میں کافی مہارت حاصل کرکے اپنے دماغ کو پارلیمنٹ کے معلومات سے بھر دیا۔ اُس نے تحمل کے ساتھ کامیابی کی اُمید پر اپنا کام جاری رکھا اور رفتہ رفتہ ترقی حاصل کی آخر میں اُس نے پارلیمنٹ سے بجائے قہقہوں کے خراج تحسین حاصل کیا اس سے اُس کی پہلی ناکامی کی تلافی ہوگئی اور بالاتفاق آرا وہ پارلیمنٹ کا ایک قابل اور موثر مقرر تسلیم کرلیا گیا۔

جس طرح ان مثالوں اور آئندہ صفحات پر دی ہوئی باتوں سے واضح ہوتا ہے اگرچہ کہ ذاتی

محنت اور کوشش سے بڑے بڑے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ سفر زندگی میں ہم کو دوسروں سے جو مدد ملتی ہے اس کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے شاعر ورڈس ورتھ نے خوب کہا ہے کہ "دوسروں کی ماتحتی اور ذاتی آزادی و خود مختاری۔ دوسروں پر اعتماد اور خود اعتمادی یہ دونوں چیزیں گو بظاہر متضاد نظر آتی ہیں لیکن ان میں چولی دامن کا ساتھ ہے ہر شخص تعلیم و تربیت کے بارے میں بچپن سے پیری تک دوسروں کا کم و بیش رہین منت ہوتا ہے اور عموماً اچھے اور زبردست آدمی اس قسم کی مدد کو تسلیم کرنے تیار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر الکیس ڈی ٹاکیولی کی طرز زندگی کو لیجئے وہ ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ فرانس کا ایک مشہور امیر تھا۔ اور اس کی ماں مالے شربنس کی پوتی تھی۔ صرف اکیس سال کی عمر میں زبردست خاندانی اثرات کی وساطت سے وہ بمقام ورسے جج آڈیٹر مقرر ہوا لیکن یہ خیال کر کے کہ اس نے ذاتی قابلیت سے یہ عہدہ حاصل نہیں کیا اس کو چھوڑنے اور اپنی ذاتی کوشش سے آئندہ ترقی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا بعض لوگ اس ترکت کو "ایک احمقانہ اور باطل خیال" تصور کریں گے لیکن ٹاکیولی نے مستقل مزاجی کے ساتھ اسی خیال کے مطابق عمل کیا چنانچہ اس نے ملازمت ترک کی اور ممالک متحدہ امریکہ کے سفر کی غرض سے فرانس سے روانہ ہونے کا سامان مہیا کیا اس کے سفر امریکہ کے تجربات اس کی مشہور تصنیف "جمہوریت امریکہ" کی شکل میں شائع ہوئے اس کے ہم سفر اور رفیق گسٹیو ڈی بیو مینٹ نے اس کی ان تھک کوشش کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں کیا ہے :-

وہ کہتا ہے کہ "ٹاکیولی کی فطرت کاہلی کے بالکل خلاف واقع ہوئی تھی اور خواہ سفر میں ہو یا حضر میں اس کا دماغ مصروف کار رہا کرتا تھا۔ جو دن بیکار گزرتا اس کو وہ بدترین تصور کرتا اور تھوڑے وقت کا نقصان بھی اس کو ناگوار گزرتا تھا" ٹاکیولی نے خود ایک دوست کو لکھا کہ "زندگی میں کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب کہ انسان کام سے بالکل بے فکر ہو جائے کیونکہ پیری میں جوانی سے زیادہ نہیں تو قریب قریب اس کے مساوی محنت کی ضرورت ہے۔ میں انسان کو دنیا میں ایک ایسے مسافر سے تشبیہ دیتا ہوں جو ایک سرد خطہ کی جانب سفر کرتا جا رہا ہو جس قدر بلندی پر وہ جائے اس کو چاہیئے کہ رفتار تیز کرے روح کا بڑا مرض افسردگی ہے اور اس خطرناک نقص کو دور کرنے کے لئے انسان کو صرف مصروف دماغ کی امداد ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنا جنس

کی مدد کی بھی ضرورت ہے"۔ ذاتی محنت اور خود اعتمادی کی ضرورت کے متعلق ٹاکیولی کی قطعی رائے جو کچھ ہو کوئی شخص بھی اس اعانت کی قدر کو تسلیم کرنے کے لئے جس کے لئے تمام انسان دوسروں کے کم و بیش احسانمند ہوتے ہیں ٹاکیولی سے زیادہ تیار نہ ہوگا۔ ٹاکیولی اس کے دوست ڈی کرگورے اور اسٹوفلس کے احسانات کا شکر گزاری سے اعتراف کرتا تھا کیونکہ اول الذکر سے دماغی اور آخر الذکر سے اخلاقی ہمدردی اور مدد حاصل ہوئی تھی اس نے ڈی کرگورلے کو لکھا "آپ ہی کی وہ ذات ہے جس پر مجھے اعتماد ہے اور جس کا اثر میری زندگی پر بہت گہرا اور اچھا پڑا ہے۔ میری زندگی پر اگرچہ کہ اکثر لوگوں کا اثر پڑا ہے لیکن اصولی خیالات کی ایجاد اور اخلاق پر جتنا اثر آپ کی ذات کا پڑا ہے اتنا کسی کا نہیں پڑا۔" ڈی ٹاکیولی نے اپنی بیوی میری کے ان خیالات کا بھی اعتراف کیا جس کی مدد سے اس کا دماغ صحیح و سالم رہا اور وہ اپنی تعلیم کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکا اس کا یقین تھا کہ ایک شریف اور نیک طینت بیوی اپنے شوہر کے اخلاق کو بہ تدریج اعلیٰ بناسکتی ہے اور ایک بدطینت اور دنی الطبع عورت شوہر کے لئے یقیناً مخرب اخلاق ہوتی ہے۔

۱۰۴ غرض انسانی کردار کے بنانے میں ہزارہا فطری اثرات کو دخل ہے اور مثال و پند و نصائح زندگی اور علم ادب۔ دوست آشنا و ہمسائے۔ ماحول اور آبا و اجداد کے جوش کا جن کے اعمال صالحہ اور اچھی باتیں ہم بطور ترکہ حاصل کرتے ہیں ہم پر خاصہ اثر پڑتا ہے لیکن یہ اثرات اگرچہ کہ زبردست ہوتے ہیں اور انہیں ہم تسلیم بھی کرلیں تاہم یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انسانوں کو اپنی خوشحالی اور فلاح وبہبود بذات خود حاصل کرنی چاہیئے۔ اور یہ کہ عقلمند اور نیک آدمی دوسروں کی مدد کا خواہ کتنا بھی ممنون کیوں نہ ہو اس کو چاہیئے کہ اپنی مدد آپ کرے اور دوسروں کی مدد کا محتاج نہ ہو۔

سوال و جواب

از
جناب سید قادر حسین صاحب قادر

کہا: - "تم ہو حسیں" بولے: - "یہ مانا!" کہا: - "ظالم" کہا: - "کس طرح جانا؟"

کہا: - "ہے دردِ دل" بولے: - "کہ ہوگا" کہا: - "کیوں کر چھپے؟" بولے: - "چھپانا!"

کہا: - "مرتا ہوں" بولے: - "کچھ سبب بھی؟" کہا: - "فرقت میں" بولے: - "مر نہ جانا!"

کہا: - "بے چین ہوں" بولے: - "کہ قسمت!" کہا: - "بیمار ہوں" بولے: - "بہانا!"

کہا: - "تم چاند ہو" بولے: - "یہ دھبّہ؟" کہا: - "خورشید" بولے: - "جل نہ جانا!"

کہا: - "ظالم ہو" بولے: - "سب غلط ہے!" کہا: - "کس طرح" بولے: - "آزمانا!"

کہا: - "اچھے ہو؟" بولے: - "للہ الحمد!" کہا: - "دشمن؟" کہا: - "مر گیا نا!"

کہا: - "بیمار ہو!" بولے: - "کہاں ہوں!!" کہا: - "کب سے؟" کہا: - "گزرا زمانا!"

کہا: - "آؤں" تو بولے: - "کون ہو تم؟"
کہا: - "قادر" کہا: - "ہرگز نہ آنا!"

(از جناب عزیز احمد صاحب)

(۱)

تاریکی شب نے آفتاب کے رُخِ آتشیں پر ایک ہلکا سا نقاب ڈال دیا تھا۔ گر چاند اس ظلمت کدۂ شب میں آفتاب کا سفیر بن کر اب بھی ظلمت کو نور میں، سوز کو ساز میں، اور خیالات کو احساسات میں تبدیل کر رہا تھا۔ بادل بہت دور اُفق پر پر پھیلائے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔

اور اب آپ خیال کیجئے کہ شہر اور اُس کے جنوں خیز نگاہوں سے دور، سبز پوش پہاڑوں میں ستاندرو ندی کے کنارے کسی چٹان پر بیٹھ کر رات کی خاموشی، قمری کی دلاویزی، منظر کی خوبی سے محفوظ ہونا کس قدر دلچسپ شغلہ ہے۔

کہنہ سال شاعر ندی کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ندی کا شفاف اور سرد پانی اُس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔ ایک طرف پہاڑوں کا سنسان اور ہیبتناک سلسلہ چلا گیا تھا، دوسری طرف میدان تھے۔ جن میں بہت دور پر کچھ روشنیاں آبادی کا پتہ دے رہی تھیں۔ آسماں پر چند ستارے نظر آرہے تھے یا یوں کہیئے کہ زمردیں سمندر کی تہ میں چند موتی چمک رہے تھے، چند آبدار موتی جن کا جوہری اگر کوئی تھا تو شاعر کا دل۔

ندی کی روانی سے ایک ہلکی سی مدہم آواز نکل رہی تھی ــــ گیت کی طرح نرم اور شیریں۔ شاعر کے دل سے بھی ایک آواز نکل رہی تھی، ایک نرم اور مسلسل گیت۔ جس میں وہی روانی تھی۔ وہی عظمت تھی۔ دُور بہت دور کوئی ملّاح کشتی کھے رہا تھا۔ اُس کے گانے کی مدہم آواز۔ فضا کی خاموشی کو چھیڑتی ہوئی سُنائی دے رہی تھی۔

شاعر نے ایک آہ بھری ایک سرد آہ۔ "کاش میرے نغموں میں بھی یہی سادگی ہوتی جو اس ملّاح کے نغموں میں ہے۔ کاش میرے نغموں میں بھی یہی جادو ہوتا۔" اور پھر اُس نے چاند کی طرف ایک نگہ نیم باز

سے دیکھا - اور مسکرا کر خاموش ہو گیا - اُس کی خاموشی مسرت و الم کا ایک دلکش اجتماع تھی -

اور پھر وہ گانے لگا - رسیلے - مدبھرے گیت - روح افزا نغمے - فضا میں پریشان گم کردہ آشیاں طائروں کی طرح منڈلانے لگے - شاعر نے چاند کی طرف ایک از دارِ تبسم کے ساتھ نظر ڈالی - چاند اپنے ہالے میں اس طرح فروزاں تھا جیسے تخت پر کوئی بادشاہ ہو - شاعر نے اسی بادشاہ کو اپنے گیت سنائے -

شاعر گا رہا تھا - کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے نغموں سے طرب اندوز ہو رہا تھا - شاعر کائنات کے ذرّے ذرّے کا رازدار تھا - اور کائنات کا ذرہ ذرہ شاعر کے دل کا -

شاعر کے نغمے وہ نغمے جن میں سرمدی رموز پوشیدہ ہوتے ہیں - جو کائنات کی دلی گہرائیوں کے رازدار ہوتے ہیں اُس کے دل سے مچل مچل کر اُس کے لبوں سے نکل نکل کر فضا کو اپنی شیرینی سے اپنی دل آویزی سے وجد میں لا رہے تھے - میرے دل پر بھی اثر کیے بغیر نہ رہ سکے - (ناظرین میں معافی چاہتا ہوں کہ یہ کہنا بھول گیا کہ میں بھی ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھا ہوا - قدرت کے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا) میں اُٹھا اور دبے پاؤں شاعر کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا -

غالباً شاعر نے میرے قدموں کی آہٹ سن لی - مڑ کر میری طرف دیکھا - اور بغیر کسی قسم کا استعجاب ظاہر کیے ہوئے کہنے لگا - "تم بھی غالباً میری طرح فطرت کی گلریزیوں سے دامن بھرنے آئے ہو؟"
میں نے سرسری طور پر سر ہلا دیا - مگر یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ شاعر کے دل میں بے پایاں مسرت کا ایک طوفان ہے -

"ایک زمانہ میں میں بھی تمہاری طرح جوان تھا" شاعر کہہ رہا تھا "اور جب میرا دل بھی جوان تھا - میں اور گرم میرا دل ایک نوشگفتہ پھول تھا جس میں حسن تھا اور مہک - مگر اب ـــــ اب کیا چند مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں اور بس!"

میں ایک شیریں احساسِ بیخودی سے شاعر کی باتیں سن رہا تھا -

"شباب، دل کی اُمنگیں، دل کے ولولے اب سب ایک خواب و خیال معلوم ہوتے ہیں - شباب میرے لیے کسی محبت کی یادگار نہیں - میں نے کسی سے محبت نہیں کی - کسی عورت سے نہیں تاہم پھر مجھے محبت تھی ہر شئے سے - ہر چیز سے مجھے سخت محبت تھی - کائنات کی ہر شئے سے مجھے محبت تھی - اُس حیات سے جو کائنات کی زندگی کا باعث ہے اُسی ہستی سے جو کائنات کی رگ رگ میں

طاری و ساری ہے ۔ مجھے محبت تھی ۔ اور اب بھی ہے ۔ اب بھی مجھے اُس جاودانی حُسن سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ وہ جاودانی حُسن جو اپنی ساری خوبیوں کے ساتھ ایک کانٹے میں بھی اُسی طرح جلوہ فرما ہے جیسے کہ گلاب کے کسی تازہ، خوشبودار پھول میں ۔ میں ایک نامعلوم ہستی کا عاشق ہوں ۔ ایسی ہستی کا ــــ جسے میں اب تک نہ جان سکا ۔ آہ اُس کی محبت میں کس قدر لطف ہے جس کو ہم نہیں جانتے ۔ مگر محبت ..... آہ محبت فانی نہیں ۔ شباب رخصت ہوا ۔ دل بجھ گیا ۔ مگر محبت باقی ہے ۔ جیسے کسی مُرجھائے ہوئے پھول میں بھی حُسن باقی رہتا ہے اسی طرح میرے شکستہ دل میں بھی محبت باقی ہے ۔

اور اے اجنبی! میں اس رات کو اس دور دراز مقام پر محض اس لئے آیا ہوں کہ آرام اور اطمینان سے اُس نامعلوم حُسن کی ایک جھلک دیکھ لوں ۔"

شاعر بے خودی میں کہتا جا رہا تھا ۔ اُس کے الفاظ ، رات کے سناٹے میں بہت دلکش معلوم ہو رہے تھے ۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا ۔

"اے اجنبی! تو میری محبت کی داستان کو دلچسپی سے سنے گا؟" شاعر نے سوال کیا ۔

میں نے متاثر لہجے میں اپنا اشتیاق ظاہر کیا ۔

شاعر کہہ رہا تھا :۔

(۲)

بہت دنوں، آہ بہت دنوں کی بات ہے کہ میرے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل تھا ۔ میرے خون میں حرارت تھی، میری آنکھوں میں کشش تھی ۔ اور میری ہستی ایک برق تھی ــــ برق جو میرے خیال میں ساری دنیا کو جلا دینے کے لئے کافی تھی ۔ اسی طرح چاندنی میں بیٹھ کر میں شراب پیتا ۔ تو ایک خاص لذت ایک خاص حظ، میرے دل میں اشتیاق کا ایک مجنونانہ جذبہ پیدا کر دیتی ۔ ایک اشتیاق ــــ ایک مجنونانہ اشتیاق ۔ مجھے بے خود کر دیتا ۔ مجھے ہر چیز حاصل تھی ۔ دولت، عزت، شباب، حُسن، طاقت تمام وہ چیزیں جن کی دوسرے تمنا کرتے رہ جاتے ہیں، مجھے میسر تھیں ۔ میں مسرور تھا ۔ مطمئن تھا ۔ مگر میرا دل ــــ میرا دل مطمئن نہ تھا ۔ وہ دھڑکتا رہتا تھا ۔ اُسے کسی چیز کی تمنا تھی ۔ میرے دل کی دھڑکنیں میرے سکون و اطمینان کو ایک کاوش و اضطراب میں تبدیل کر دیتیں ۔ میں بیتاب تھا ــــ ہاں بے تاب اور بے قرار میرے پاس ایک چیز کی کمی تھی جس کے سامنے وہ تمام نعمتیں جو مجھے میسر تھیں

ہیچ نظر آتی تھیں۔ آہ اے اجنبی مجھے محبت کی تلاش تھی۔

فطرت نے میرے پہلو میں ایک حساس اور درد آشنا دل بنایا تھا۔ جو ایک نغمہ کو سُن کر ایک پھول کو دیکھکر دھڑکنے لگتا۔ میرے دل کی تعمیر محبت سے ہوئی تھی اور وہ محبت کا جویا تھا۔ محبت، اے حقیقی محبت آہ تجھے پانا کسی قدر دشوار ہے۔ تیرا راستہ کسی قدر گمراہ کن ہے۔ لیکن تو خود کتنی بڑی نعمت ہے!۔

محبت! ایک فطری جذبہ ہے جو خدا نے ہر انسان کو ودیعت کیا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ یہ ایک کڑی ہے۔ جس میں ساری کائنات منسلک ہے۔ انسان کو دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے محبت ہی کا سبق دیا گیا۔ پہلے اُس نے ماں سے محبت کی پھر وہ جوان ہوا اور اپنی محبوبہ سے محبت کی اور پھر بڈھا ہوگیا تو اپنی اولاد سے محبت کی۔ یہ تو عام محبتیں ہیں جو ہر شخص کے لئے بنائی گئی ہیں۔ مگر حقیقی محبت کچھ اور ہی ہے .... اے اجنبی حقیقی محبت وہ ہے جو حُسن کے ساتھ کی جاتی ہے۔ بچہ کی محبت چراغ سے' یا بلبل کی محبت پھول سے' اس حقیقی محبت کی مثالیں ہیں۔ بچہ چراغ کی لو کو دیکھتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ دُنیا کیا ہے' وہ خود کیا ہے' اور چراغ کیا ہے۔ مگر وہ صرف چراغ میں ایک نور دیکھتا ہے ...... ایک حسین یہ نور' اسے بیتاب کر دیتا ہے۔ اُس کی روح بھی نور ہوتی ہے' اور چراغ کے نور کی ہم آہنگی سے وہ بیتاب ہو جاتی ہے۔ سچی محبت ہے۔ میں بھی اسی قسم کی حقیقی محبت کا خواہاں تھا۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی راتیں میں نے اس اُلجھن میں اور کاوش میں کاٹی ہیں۔ میں محبت کرنا چاہتا تھا۔ میری رگ رگ میں محبت بسی تھی۔ مگر آہ میرا کوئی محبوب نہ تھا۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے میں محبت کر سکتا۔

اور آخر کار میں نے محبت کے لئے ایک چیز انتخاب کر ہی لی۔ ایک حسین' اور بے چین ہستی.. یعنی عورت ....

ہاں اے اجنبی .... عورت ...... میں نے عورت کو اپنے دل کے معبد میں معبود بنا کر بٹھایا۔ آہ حُسن۔ حُسن کیا شئے ہے۔ ایک آگ .... ایک شرار ....

میں کہہ آیا ہوں کہ جوانی کے دنوں میں میرے خد و خال کافی دلکش تھے۔ عورتیں میری طرف محبت بھری، اور مرد حاسدانہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ مگر میں ان معمولی باتوں پر مطلق غور نہ کرتا۔ میں اپنے کو ایسا انسان سمجھتا تھا جو سوسائٹی کے بندھنوں سے آزاد ہو۔

ندیم کے یہاں جلسۂ رقص تھا، اس نے مجھکو خاص طور پر مدعو کیا۔ گانا ہوا قہقہے لگائے گئے شراب کی بوتلیں خالی کی گئیں۔ میں بھی کسی قدر دلچسپی، کسی قدر تعجب، اور کسی قدر تنفر کے ساتھ لوگوں کی حرکتیں دیکھتا رہا۔

ندیم نے میرا ہاتھ دبا کر کہا "ریاض، تم بڑے احمق ہی رہے۔ ان دلچسپیوں میں حصّہ لو۔ مرد خدا شاعر ہونے کا تو دعوےٰ ہے، اور موسیقی سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا "تاثر کا اظہار قہقہوں سے نہیں ہو سکتا۔"

مگر ندیم نے آہستہ سے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا۔ مرد خدا۔ دنیا میں صرف چند شعر لکھ لینا یا سر ہلا لینا کافی نہیں۔ ذرا سامنے دیکھو۔ عورتیں تمہاری طرف کس طرح دیکھ رہی ہیں۔ اگر تمہاری جیسی بڑی بڑی دلکش آنکھیں میری بھی ہوتیں تو پھر کیا تھا۔ افسوس ہے کہ حسن تمہارے قدموں پر گر رہا ہے اور تمہیں خبر نہیں۔"

خیر میں نے اس دن سے سوسائٹی میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اور آخر کار میں نے اپنے لئے ایک محبوبہ انتخاب کر لی۔ فرض کر لو کہ اُس کا نام یاسمین تھا........ ہاں یاسمین۔ کیونکہ وہ یاسمین کی طرح نازک اور حسین تھی۔ اور اُس کا اصلی نام، افسوس ہے میں نہیں بتا سکتا۔

اب میں اُس کا مالک تھا۔ مجھے حسن مل گیا تھا جو خود میری پرستش کر رہا تھا۔ آہ وہ عورت۔ اُس کا تبسم، اُس کی آنکھیں۔ اب یہ سب چیزیں یاد آتی ہیں۔ خیر تو اسے اجنبی۔ اب میرے پاس ایک عورت تھی .... تم کو کبھی کسی عورت کے ساتھ محبت کا اتفاق ہوا ہے؟ حرارت کا وہ مرمریں مجسمہ اپنے اندر کس بلا کی دلکشی رکھتا ہے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں۔ بالکل سچ کہ اب بھی میں مطمئن نہ تھا۔ میرے دل میں کانٹا سا کھٹک رہا تھا اور برابر کھٹکتا رہا۔ عورت مرد کے جذبات کی تسکین کر سکتی ہے۔ عورت زندگی کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ مگر شاعر کا دل؟ کیا شاعر کا دل بھی حرارت کے اس مرمریں مجسمہ سے جس کی حرارت فی الاصل برودت ہے، تسکین پا سکتا ہے؟ آہ نہیں........ تو نہیں جانتا کہ شاعر کے دل میں کس بلا کی وسعت ہوتی ہے۔

اے اجنبی میں نے حسن پا لیا تھا۔ مگر محبت نہیں پائی تھی۔ .... عورت میں حسن ہے لیکن کامل نہیں ...... میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ عورت کا حسن بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ پھول کا حسن۔ مگر اصلی حسن اور ہی چیز ہے۔ آہ میں نے حسن کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ چراغ کا حسن اس کے خوبصورت فانوس میں نہیں بلکہ اس کی روشنی میں نہاں ہے۔ اس کا فانوس روشنی کو بڑھا دیتا ہے۔ مگر خود روشنی نہیں۔ بس بالکل یہی حال دنیا کی تمام حسین چیزوں کا ہے۔

تو پھر حسن کیا ہے؟ .... ایک نامعلوم شئے۔ بچہ چراغ کے نور کو دیکھتا ہے۔ لیکن نہیں جانتا کہ یہ نور کیا ہے۔ تاہم وہ اس نور سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح ایک نور ہے جو کائنات میں نہاں ہے۔ مگر ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نور ایک رازِ عیاں ہے۔ جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔

میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا۔ اور صحیح نتیجہ پر پہونچا۔ اب میں اس نامعلوم نور سے محبت کرنے لگا۔ آہ .... ایسی چیز سے محبت کرنا، جس سے ہم ناواقف ہوں، کس قدر لطف رکھتا ہے۔

اور اسی نور کے رازِ عیاں کو معلوم کرنے میں میں نے ساری عمر گنوا دی۔ میری کمر جھک گئی۔ میرے بال سفید ہو گئے میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئیں۔ مگر میں مطمئن ہوں۔ کیونکہ میرا دل محبت سے مالامال ہے۔ میں نے محبت میں سرشار ہو کر اس رازِ عیاں کو معلوم کرنا چاہا۔ میرے نغمے سن سن کر میرے شعر پڑھ پڑھ کر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ مجھے کائنات کا راز معلوم ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں کائنات کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔ مگر .... اے اجنبی میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ اب تک میں اس نامعلوم حسن کا راز معلوم نہیں کر سکا۔ اور جس دن مجھے وہ راز معلوم ہو جائے گا مجھے دنیا میں رہنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مگر اے رازِ عیاں .... اے مقدس راز ...."

(۳)

شاعر خاموش ہو گیا۔

دور، بہت دور ستارے سرگوشی کر رہے تھے "شاعر نامعلوم حسن کے رازِ عیاں سے خبردار ہو چکا ہے، اسی لئے وہ اس قدر حیران اور پریشان ہے۔"

اور غالباً موجیں شاعر سے کہہ رہی تھیں، "تو منزل پر ہے۔ مگر اپنے کو منزل سے دور سمجھ رہا ہے۔"

میں نے کہا" اے شاعر۔ تو کائنات کا حُسنِ قدیم کا رازداں ہے تو حُسنِ قدیم کا پیغام سُنانے والا ہے۔ اے میرے شاعر تو فطرت کی کائنات کی گہرائیوں کا رازدار ہے "
شاعر کے لب پر ایک دلگداز سا تبسم نمودار ہوا۔ جس کے بعد اُس کی روح بھی اُس رازِ عیاں کو اور زیادہ اُلجھانے کے لئے' نامعلوم حُسن سے ہمکنار ہو گئی
ستارے ایک ایک کر کے' شاعر کے مُردہ جسم پر روشنی ڈالتے ہوئے رخصت ہونے لگے۔

غزل

از جناب ابوالشجاع صاحب محبت

شکایت ہم کو دل سے ہے نہ شکوہ کوئی دلبر سے
ارادہ ان کا جانبکا ہے شاید اب مرے گھر سے

اگر وہ میرے گھر آئیں تو صدقے جان اُن پر سے
کسی بے درد ظالم بیوفا کافر کی فرقت میں

بتادونگا کہ اِک دن رحم فرما ہوگا تو مجھ پہ
دمِ نظارہ دیکھو بھی عیاں کیا ہے یہاں کیا ہے

پریشاں حال دامن چاک گھبرائی ہوئی صورت
عدو سے آج ٹھیری وصل کی تم کیا چھپاتے ہو

ترا گھر ہی کہ کعبہ ہی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

گر ہاں کچھ گلہ ہے وہ بھی کس سے ہے مقدر سے
الٰہی بجلیاں چمکیں گھٹائیں چھائیں مینہ برسے

بُلائیں گر وہ گھر اپنے تو چلا جاؤں گا سر سے
بہت لوٹے بہت چیخے بہت تڑپے بہت ترسے

سبھی فریادیں ہیں کہ لینگی داد ستمگر سے
تمہارے چشم افسوں سے ہمارے دیدۂ تر سے

ہوا معلوم تم آتے ہو شاید غیر کے گھر سے
سمجھتے ہیں سمجھنے والے دل کی بات تیور سے

ہزاروں سر لگے ہیں اُ دبت کا در تیرے در سے

سرِ مقتل تہِ خنجر محبت اس طرح تڑپا
نگاہیں جھک گئیں قاتل کی دردانگیز منظر سے

ادب (ماہوار) مدیر مولوی سید اعظم حسین ضخامت (۶۴) صفحات سالانہ چندہ للعہ - پتہ دفتر ادب
بچی گنج چوراہا لکھنؤ۔

لکھنؤ سے یہ نیا رسالہ اُردو ادب کی خدمت گزاری کے شوق میں اور ظاہری و معنوی دونوں نوع کی خوبیوں سے آراستہ شائع کیا جارہا ہے۔ آج کل عامیانہ مذاق کے رسائل کی کثرت اور ظاہری زیبائش کے پرچوں کی زیادتی نے اچھے مذاق کی نشوونما میں ایک طرح کی رکاوٹ سی پیدا کردی ہے اور اس طوفان بے تمیزی میں سنجیدہ رسائل کا خاص و عام کے دلوں میں گھر کرنا اور روز بروز زیادہ مقبولیت پانا مشکل نظر آتا ہے۔ اس حوصلہ شکن صورت حال نے اُردو کے نئے پرانے کئی معیاری پرچوں کو بند ہونے پر مجبور کردیا اور بہت سے پرچے کس مپرسی کے عالم میں ہیں جو کبھی تو تصاویر میں رنگینی پیدا کرکے اور کبھی اپنے بلند معیار سے نیچے اتر کر پبلک کو اعانت کے لئے اپیل کرتے رہتے ہیں۔ اس ناموافق سی فضا میں بلدۂ لکھنؤ سے ادب کا اجرا ہوا ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اردو ادب کا یہ نومولود تین ماہ سے زیادہ کا ہوگیا ہے اور اس میں توانائی اور تنومندی روز بروز زیادہ ہوتی نظر آرہی ہے اس وقت اس کے جو نمبر شائع ہو چکے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہم اس رائے کے قائم کرنے پر آمادہ ہیں کہ ادب سنجیدگی کے ساتھ ادب اور اس کے متعلقات پر اعلیٰ پایہ مضامین پیش کرے گا۔ اس کے علاوہ علم و فن کے دوسرے موضوعات پر بھی اچھے اچھے مضمون اُس کی زینت ہونگے اس وقت تک ادبی تنقید اور ادبی تحقیقات کے مضامین اور بالخصوص پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب ادیب کی خاموش تحقیقات کے نتائج جو اس پرچے میں شائع ہوئے ہیں اس امر کی کافی ضمانت ہیں کہ آئندہ اس نہج پر اس میں بہت کچھ شائع ہوگا۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب نے جو خوش قسمتی سے مخطوطات کا ایک پاکیزہ ذخیرہ بھی رکھتے ہیں، ماہ بماہ اپنے تحقیقاتی مقالات سے اس رسالے کی اعانت

خاص کا وعدہ کیا ہے۔ یہ مضامین چونکہ اُردوئے قدیم سے متعلق ہوں گے اس لئے "اوراقِ پارینہ" کی سرخی سے بالتزام دیئے جائیں گے۔ مدیرِ ادب مولوی سید اعظم حسین صاحب اپنے اچھے ذوق اور عمدہ انتخاب مضامین کے لئے نہ صرف قابلِ مبارکباد بلکہ ہر طرح قابلِ اعانت ہیں۔ بعض نمبروں میں تصاویر بھی ہیں۔ مگر علمی اور مضامین سے متعلق۔ رسالے کی طباعت کتابت ہر طرح دیدہ زیب ہے۔

جن (ماہوار) مدیر مولوی نیاز فتح پوری۔

سالانہ چندہ عالم۔ پتہ دفتر نگار شعبہ (جن) نظیر آباد لکھنؤ۔

دفتر نگار اور خود مدیر نگار مولوی نیاز فتح پوری کے سحر طراز قلم سے یہ رسالہ جو اُردو رسائل میں اپنی نوعیت کا واحد ہے، جنوری سے نکلنے لگا ہے۔ سحر طراز مدیر کو جن اور جنیات (یا علم اجنہ) وغیرہ سے بڑا لگاؤ نظر آتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر ایسے حالات و واقعات کو بغور سنتے رہتے ہیں جو جنوں کے متعلق کسی بات کی طرف رہنمائی کرتے ہوں۔ اس رسالے کے اجرا سے اُن کا مقصد ایک تو جنوں کے متعلق علمی حیثیت سے مضامین شائع کرنا ہے اور دوسری طرف وہ پبلک کے جذبۂ تجسس اعجوبہ پسندی کی ضیافت کے لئے جگہ جگہ سے جنوں کے متعلق شنیدہ دیدہ اور تراشیدہ غرض ہر قسم کے قصے کہانیاں اور واقعات چھاپنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ کارپردازانِ جن اپنے قارئین سے اُمیدوار ہیں کہ جنوں کی نسبت جو کچھ بھی انہوں نے سنا ہو یا اُن کے حافظے کسی کونے میں کوئی بات اس گروہ کے متعلق ہو تو اس کو جس طرح بھی بن پڑے لکھ کر دفتر [illegible] بھیج دیں تاکہ [illegible] رنگ دے کر جن کے اوراق پر لایا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن ایک مفید رسالہ ثابت ہوگا۔ موجودہ زمانے میں جب کہ مادیات کا غلبہ ہماری روحوں کو اگلے زمانے والوں کی لطافتوں سے محروم کر کے روز بروز ہمیں صنعتی آدمی یا کل بناتا جا رہا ہے، بعض لوگ خود مادیت کے مرکز یعنے یورپ میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو مادیت سے متاثر اور کثیف شدہ دل و دماغ کو ایسے ہی واقعات و کیفیات کی بحث میں الجھا کر تفنن اور تفریح کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں جیسا کہ اس رسالے سے توقع کی جاتی ہے۔ سائنس اور عقل کے دورِ حاضر میں جب طلسم ہوش ربا اور داستانِ امیر حمزہ وغیرہ کا طلسم ٹوٹ چکا ہے، ایسے رسالے اور کتابیں جن میں روحانیات وغیرہ عالمانہ مباحث کا ادعا بھی ہوتا ہے، خاص و عام کے اس جذبہ کی تسکین و تسلی کے لئے ضروری ہیں جس سے لوگ دنیا کی

حقیقتوں کے ملاحظے سے تھکاوٹ اور بیزاری محسوس کرکے خیالات کی دنیا میں چکر لگانے لگتے ہیں۔
اور ایسے سیمیائی جلوؤں سے قلبی کثافت اور گرانی روح دور کرنا چاہتے ہیں۔

دیوان تاباں | مرتبہ جناب سید بادشاہ حسن صاحب۔ چھوٹی تقطیع (۹۲) صفحات۔ قیمت ۸؎۔
ملنے کا پتہ:۔ محمد اعظم معین الدین سوداگر سالار جنگ بلڈنگ حیدرآباد دکن۔

بزم ادب نظام کالج کے سلسلۂ مطبوعات اُردو کی یہ دوسری کڑی ہے۔ میر عبد الحی تاباںؔ۔ دور میر تقی کے ان چند چیدہ شاعروں میں ہیں جن کی وجہ سے یہ دور اُردو ادب کی تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ قدرت نے انہیں بہت ہی حسین و جمیل پیدا کیا تھا۔ اور یہ اپنے عہد میں یوسف ہند کہلاتے تھے۔ عین جوانی میں کثرت بادہ نوشی سے مرض استسقا میں مبتلا ہوکر داعی اجل کو لبیک کہا اور اس عہد کی اُردو شاعری کی بزم کو بہت نقصان پہنچا گئے۔ تاباںؔ، حاتمؔ کے شاگرد تھے اور جو کچھ استاد سے حاصل کرتے تھے اس کو اپنی طبیعت کی براقی اور جولانی سے بہت زیادہ کارآمد بنالیتے تھے۔ اُردو کے تقریباً ہر ایک قدیم تذکرے میں اس جواں مرگ شاعر کا ذکر ملتا ہے مگر بہت سے امور انتشار بیاں کی وجہ سے اور بعض واقعی مبہم و غیر معلوم رہ گئے۔ سید بادشاہ حسن صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی تلاش اور کوشش سے اُردو شاعری کے ایک گم شدہ ستارے سے پبلک کو روشناس کرایا اور تاباں کی حیات پر بصیرت افروز طریقے سے روشنی ڈالکر تذکروں کے بہت سے ابہام رفع کردے۔ نیز شاعری پر بھی خاصی دلچسپ بحث کی ہے اور تاباں کے کلام کی خوبیاں اور خرابیاں بے لاگ بنکر دکھائی ہیں۔

تاباںؔ نے زیادہ عمر نہیں پائی تھی اور غالباً تیس چالیس کے درمیان سن میں ان کا انتقال ہوگیا اس لئے قدرتاً اُن کے کلام کی مقدار زیادہ نہیں۔

اس پر بھی بعض انتخاب کرنے والوں نے اُن کے کلام کو کانٹ چھانٹ کرکے بہت کم کردیا۔ پیش نظر نسخہ میں جس کو بحالات موجودہ کلیات ہی کہنا چاہئے، تاباں کا جس قدر کلام بھی مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے علاوہ تذکروں کے انتخابات سے مل سکا شریک کرلیا گیا ہے۔ دور میر تقی کی شاعری کے تمام محاسن جستہ جستہ تاباں کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور بالخصوص زبان کی لطافت لوچ اور دیگر خوبیوں کے لحاظ سے اس دور کی شاعری کو جو امتیاز حاصل ہے اس کے مدنظر دیوان تاباں متعلمین ادب اُردو کے مطالعہ کی چیز ہے۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ ۰ نکات الشعرا میں جو ۱۱۶۵ھ کی تالیف ہے تاباں کو مرحوم

بتایا ہے اور دیگر تذکروں کے بیانات سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۶۵ھ سے قبل انتقال کر گئے
تھے۔ دیوان تاباں کی زبان بارھویں صدی کے نصف اول کا بہترین نمونہ ہے اور اردو زبان کی وقت
بوقت کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے مطالعہ میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

اردو میں سستے مگر ناقص ایڈیشنوں کا جو عرصہ سے رواج چلا آرہا ہے اس نے ہمارے ادب کو
ظاہری حیثیت سے نہایت مکروہ اور بدنما بنا دیا ہے۔ نیز اہل کاروبار کی کم علمی اور بے پروائی سے
ہمارے اکثر شاعروں کے دیوانوں کا یہی حال ہے کہ اگر ایک طرف خراب کاغذ اور بری تقطیع اور غلیظ
طباعت سے بدنما ہیں تو دوسری طرف بدنما اور مکروہ اور اغلاط سے مملو۔ تاباں کا کوئی اچھا مطبوعہ
دیوان تو سرے سے مفقود ہے۔ دیوان کے نام سے جو انتخاب شائع ہوئے وہ بھی عام کتابوں
کی طرح غلطیوں سے معمور نکلے۔ چونکہ اس نسخہ کی ترتیب میں قلمی نسخوں کا مقابلہ کر کے غلطیاں دور کر دی گئی
ہیں، اور طباعت و کتابت کے بھی ظاہری اوصاف سے یہ نسخہ متصف ہے اس لئے توقع ہے کہ
اردو ادب کے نفاست پسند قارئین اس کے مطالعہ سے بہ ہر طور محظوظ ہوں گے۔

پردہ | از جناب محمد فضل الرحمن صاحب لکچرار سٹی کالج چھوٹی تقطیع (۸۴) صفحے قیمت عہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

یہ ایک تین ایکٹ کا ڈرامہ ہے جس کا موضوع اس کے نام سے بالکل ظاہر ہے۔ آج کل
تبدیلی حالات کے مد نظر سماجی اصلاحات کی جس قدر زیادہ ضرورت ہے اس سے کوئی انکار نہیں
کر سکتا۔ حیات عامہ میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے ساتھ اس کی طرف بھی گاہے ماہے ہمارے
لیڈروں اور رہنماؤں کی توجہ ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اب تک سماجی اصلاح کا کام وسیع اور منظم پیمانے
پر نظر نہیں آتا تھا تاہم انفرادی کوششیں اکثر موقعوں پر بڑی تندی و تیزی سے جاری ہیں اور بفضلہ مفید
نتائج بھی پیدا کر رہی ہیں۔ ہندوستان میں بالعموم اور مسلمانان ہند میں بالخصوص پردہ کو سماجی اصلاح
میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے اور مصلحین کی ایک جماعت کا یہ خیال کیا بلکہ ایقان ہو چلا ہے کہ
جب تک عورتیں پردہ نہ اٹھا دیں گی اور مرد عورتوں کو صنف نازک سمجھ کر اُن کے ساتھ رعایت اور
قوائے انسانی میں اپنے برابر سمجھ کر نہ صرف اپنے مساوی بلکہ اپنے سے ایک حیثیت سے بالاقرار
نہ دیں گے ہندوستان ترقی و رفعت [illegible] پردہ ڈرامہ انہی خیالات کی نشرو

اشاعت کا آلہ ہے اور چابک دست مصنف نے تین ایکٹ میں موجودہ رواجی پردے کی جس طرح برائیاں کھول کر رکھدی ہیں۔ علماء کا اس ڈرامے میں بڑا بڑا حصہ ہے اور خوب مضحک طور پر اُن کو پیش کیا گیا ہے۔

تاریخ (رسالہ) مدیر مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری کتابی تقطیع ضخامت تقریباً ایک سو صفحات، سالانہ چندہ مع خرچ ڈاک ۸ر۔ دفتر تاریخ کوٹلہ اکبر جاہ حیدرآباد دکن۔

مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری اُردو دنیا میں تاریخی معلومات اور تحقیقاتی مضامین کے لیئے خاص شہرت کے مالک ہیں۔ آپ کی اُردوئے قدیم سے جو اُردو کے ابتدائی دور کی ادبی تاریخ ہے، اکثر اُردو داں واقف ہوں گے۔ حکیم صاحب تاریخ و اثریات سے جو شغف رکھتے ہیں، اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ آپ کی ادارت میں اس موضوع پر کوئی خاص فنی مجلہ جاری ہو تو ضرور اعلیٰ پایہ ہوگا۔ چنانچہ تاریخ جس کے اس وقت تک تین نمبر نکل چکے ہیں توقع کے موافق ہے۔ اس کے اعلیٰ پایہ مضامین اور تاریخی معلومات ضرور اہل ملک میں تاریخی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے عمدہ سامان ضیافت ہیں۔ تاریخی کتابوں پر بہ التزام طویل ریویو بھی شائع ہوتے ہیں۔ نیز دکن کی تاریخ پر بطور خاص مقالات کی اشاعت اس کا ایک قابل ستائش مقصد ہے۔ حیدرآباد کی تاریخ پر ابتک کچھ بھی کام نہیں ہوا اور ہمارا ماضی جس کی عظمت و رفعت کا سرسری سا اندازہ مٹے ہوئے آثار اور ڈھیئے ہوئے گنبدوں اور قلعوں سے ہوتا ہے، ہمارے لیئے راز سربستہ ہی ہے، اس کا آئینہ دار اور درس حال ہونا تو بڑی بات ہے ہم سرے سے یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے حال کا دامن جس ماضی سے وابستہ ہے وہ کیا بلحاظ تمدن و تہذیب اور کیا بلحاظ شوکت و حکومت ہمارے لیے کس طرح موجب افتخار ہے۔ حکیم صاحب کی یہ کوشش قابل شکریہ ہے اور امید ہے کہ تاریخ کے متعلین اس رسالے میں گہری دلچسپی لے کر دائے، سخنے اور قلمے اس کی اعانت سے دریغ نہ کریں گے۔

نیرنگ رامپور سے دہلی کو منتقل کر دیا گیا

اس عظیم انقلاب کے ماتحت جنوری سنہ ۱۹۳۰ع کا تمام پروگرام تبدیل ہو گیا۔ اس لئے

امیر نمبر

جس کے جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اب ایک ماہ کی تاخیر سے آخر ماہِ فروری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوگا اور امیر نمبر کی بجائے

دہلی نمبر

جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوگا۔ یہ نمبر نیرنگ کے انقلابی پروگرام کی یادگار ہوگا اور ہر حیثیت سے قابلِ قدر اور کامیاب ہوگا

آئندہ جملہ مراسلت اور ترسیلِ زر حضرت عشرت رحمانی مدیر نیرنگ دار السلطنت دہلی کے نام ہونی چاہیئے

سنہ ۱۹۳۰ء سے رسالہ کے لئے جس قدر آرڈر موصول ہوئے ہیں اُن کی تعمیل دہلی سے ہوگی۔ نیرنگ کے قدیمی معاون اور قدرداں حضرات سے اُمید ہے کہ وہ نیرنگ کی بدستور معاونت فرمائیں گے اور بہ لحاظِ ضرورت مجھے اپنے گرامی ناموں سے یاد فرماتے رہیں گے

معزز معاصرین اپنے رسائل اور اخبارات بدستور رامپور کے پتہ پر ارسال فرماتے رہیں۔ نیرنگ دہلی سے اُن کی خدمت میں پہنچتا رہے گا

محمد عزیز اللہ خان مدیر نیرنگ

پتہ ...... مطبع سعیدی ریاست رامپور

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لیے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور جو حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔
خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب اعلان رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی آدمی مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

دار الاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکا

سید محمد ایم اے

عمر یافعی

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶/

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کیلئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت منتظم مجلّہ مکتبہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجیے۔

مجلہ مکتبہ

بابتہ ماہ فروردی ۱۳۳۹ ف م فبروری ۱۹۳۰ء

تصویر :— "ایک راگنی"

فہرست مضامین

جلد (۴) شمارہ (۵)

شذرات

کچھ روز پہلے مسٹر بالڈون نے اپنے ایک خطبہ میں عوام کی معلومات سائنس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ عوام سائنس کے حقایق سے اس قدر بے بہرہ ہیں کہ جو نظریے سائنس داں کے پاس فرسودہ ہو جاتے ہیں وہ ان کی معلومات کا سرمایہ بنے رہتے ہیں حالانکہ سائنس کی تحقیقات کے لیے کوئی نقطۂ انتہا نہیں ہے انھیں خیالات کو اپنا موضوع بناتے ہوے جان میکلن نے سائنس کی تعلیم اور اس کے مقصد پر بحث کی ہے حقیقت یہ ہے کہ خود سائنس داں اپنی تحقیقات سے عوام کو مانوس رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں رکھتے۔ اکثر صرف اسی کو کنفی بخش سمجھتے ہیں کہ وہ مدرسوں سے ایسے سائنس داں پیدا کر رہے ہیں جن پر سند کی مہریں ثبت ہیں۔ رہی یہ بات کہ عوام کو سائنس سے کہاں تک تعلق ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے اس کی ضرورت نہیں ان میں سائنس کی ٹھوس معلومات بھری جائیں، بلکہ یہ کافی ہے کہ ان کی نظر سائنٹفک ہو جاے اور وہ چیزوں کا مطالعہ اور مشاہدہ سائنٹفک نقطۂ نظر سے کرنے لگیں۔

جامعات کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب سر سی، وی وامن نے اپنے ایک مضمون میں یہ دیا ہے کہ جامعات قومی ترقی اور استفادہ کا بہترین مرکز بن سکتی ہیں اگر ان کی توجہ اعلیٰ دماغی مشاغل کی طرف منعطف ہو جاے افسوس ہے کہ یہ مطمح نظر ہماری جامعات کے سامنے سے ہٹتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ صرف خشک تعلیم اور امتحانات کی بازابطگی لیتی جا رہی ہے جامعہ میں متعلم اور معلم دونوں کی مخصوص اور غیر معمولی قابلیتوں کے بروے کار لانے کی غرض سے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی جانی چاہئیے۔ یہی جامعہ کا مطمح نظر ہے جس کی طرف عموماً ہندی جامعات کی رفتار نہایت سست معلوم ہوتی ہے۔ سر وامن کے خیال میں متعلم اور معلم کی مخصوص پوشیدہ غیر معمولی قوتیں اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتیں جب تک جامعات میں اعلیٰ تحقیقات اور ریسرچ کی فضا نہ پیدا ہو جاے اس موازنہ سے جب ہم ہندوستان کی جامعات پر نظر ڈالتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے تقریباً سب میں ریسرچ اعلیٰ علمی تحقیقات اپچ کے اور تخیل کارناموں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ جدھر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کا رجحان ایک کارخانہ بننے کی طرف جس سے صدہا ادھورے سند یافتہ منشی بن بن کر نکلتے جا رہے ہیں اس سے علیم یافتوں کی توہین ہمارا مقصد نہیں کیونکہ ملک کو ان کی جیسی کچھ ضرورت ہے ظاہر ہے لیکن انھیں میں سے چند ایسے بھی پیدا ہوں جنکو علمی تحقیقات میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کرنے کی عزت حاصل ہو۔ اس مقصد کو ہندی

جامعات جس قدر پھیلاتی جارہی ہیں اسی قدر تمدنی اور علمی حیثیتوں سے وہ مغربی اقوام کی کورانہ مقلد بلکہ مجہول خادم بنتی جارہی ہیں۔

یورپ کے "خصوصی ماہرین" بھی عجیب بلائے ناگہانی ہوتے ہیں ان میں سے بعض تو بلاشبہ اپنے معینہ موضوع پر بڑی حد تک وسیع نظر رکھتے ہیں لیکن انھیں کے سہارے بہت سے خودساختہ خصوصی ماہرین بھی پاؤں پھیلانے لگے ہیں اسلامی ممالک میں آج کل جو بے چینی کش مکش حیات کی پیدا ہوگئی ہے اس کو دنیا عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے لیکن سب سے زیادہ عجیب نقطۂ نظر شاید اُن ماہرین خصوصی کا ہے جن کے متعلق بعض ارباب صحافت کا خیال ہے کہ وہ اس اسلامی ہیجان کے بڑے نقاد اور شاہد ہیں اسی طرح کے ایک ماہر خصوصی مسٹر لطفی لیوینین نے "انٹرنیشنل ریویو آف مشن" میں ایک مضمون "اسلام سے بغاوت" کے عنوان سے لکھا ہے جس کے معنی خود اسلامی اصطلاح میں "ارتداد" کے ہوں گے۔ ان بزرگ کی نظر عنایت اپنے اکثر ہمجنسوں کی طرح "آزاد ترک" پر بُری طرح جمی ہوی ہے، آزاد ترک کی رواُتی تلوار ان کے دل پر آرے کا کام کر رہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانان عالم خصوصاً ترکوں میں تمام اسلامی عقاید سے باغیانہ خیالات پیدا ہوگئے ہیں۔ تاریخ اسلام میں مذہب اسلام اور حضرت محمدؐ کے ارشادات پر کبھی ایسی تنقیدیں نہیں ہویں جیسی گذشتہ دس سال سے ترکی میں ہونے لگی ہیں۔ اس کے بعد وہ ترکی تمدنی، معاشرتی اور قومی زندگی میں جو تبدیلیاں ہورہی ہیں ان کا ایک خاکہ کھینچ کر اپنے طور پر یہ ثابت کرلیتے ہیں کہ یہ سب کچھ اسلام سے بغاوت کے طور پر ہورہا ہے۔

ان بزرگ کے رطب ویابس کو اگر ہم صحیح مان لیتے ہیں تو پھر خود اپنے آپ پر اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم اب تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ ترک ہوں یا افغانی وایرانی، مصری ہوں یا عرب اور ہندی وچینی سب کے دل میں عقیدتی احساس مذہب کی جگہ، اصلی اور سادہ دین فطرت کی طرف واپس ہونے کی خواہش پیدا ہورہی ہے۔ عقیدوں سے قطع نظر تمدن ومعاشرت میں بھی وہ ایک معیاری اور بین القومی نقطہ پر آنا چاہتے ہیں۔ یہ قومی تحریک کا سوال ہے۔ جس کا نتیجہ اس قدر پیش پا افتادہ نہیں ہے جیسے ہمارے خصوصی ماہر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اب رہا تعبیر کا حق وہ ہر ایک کو حاصل ہے۔

یہ خبر ہندوستان کے علمی حلقوں میں مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ پروفیسر بنوائے کمار سرکار پروفیسر معاشیات کلکتہ یونیورسٹی کو ادارۂ ہند کی تحریک پر بویریائی وزارت تعلیمات نے میونخ کے ٹکنیکل اسکول میں موجودہ

ایک راگنی

ہندوستانی مسایل پر لکچر دینے کے لیے ایک سال کے واسطے مقرر کیا ہے ۔ اس تقرر کا مقصد ظاہر ہے جرمنی میں کئی سال سے ہندوستانی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی متواتر سعی کی جارہی ہے جس کے لیے سرریہ آور دہ ہندی علما کو وظیفے بھی عطا ہوتے رہے ہیں ۔

کچھ سال ہوے کہ بلدہ حیدر آباد دکن کے ایک روشن خیال مولوی عبدالمجید صاحب نے "صفتہ الاسلام" کے نام سے ایک اصلاحی اور تبلیغی انجمن مسلمان آوارہ گرد لڑکوں کے لیے قایم کی تھی جس میں ایک کافی تعداد مسلمان بچوں کی نہ صرف پرورش پاتی رہی بلکہ علم اور صنعت کاری سے بھی بہرہ اندوز ہوتی رہی ۔ مولوی عبدالمجید صاحب کی سعی اور انکے شریک کار مولوی میر تہور علی صاحب کی اعانت سے عرصہ تک انجمن کا کام خوب ترقی پذیر رہا ۔ صفتہ الاسلام کے عروج وکمال کے زمانے میں ان دونو بزرگوں نے اس کو مرکزی انجمن بنا کر اس کی ذیلی انجمنیں "انصار الصفہ" کے نام سے اکثر محلوں میں قایم کیں جن کا مقصد آوارہ گرد بچوں کی تعلیم اور اصلاح معاشرت تھی ۔ گلبرگہ ، مغلپورہ ، سلطان شاہی ، سلطان پورہ میں انصار الصفہ کی انجمنیں قایم تھیں جہاں تک ہمیں علم ہے ان میں سے اکثر انجمنیں ناواقف کار اراکین کی نفسانیت کی بدولت یا شخصی دلچسپی پر انحصار کی وجہ سے اب صرف قسم کھانے کو باقی رہ گئی ہیں ، سلطان شاہی کی انجمن جواب سسک رہی تھی ۔ اسکے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اس کے جدید معتمد مولوی میر مظہر علی صاحب وکیل ہائیکورٹ نے اس کے احیا کا ذمہ لیا ہے باقی انجمنوں میں گلبرگہ کی انجمن بذات خود ایک مرکز بنی ہوی شاندار پیمانے پر کام کررہی ہے ۔ سلطان پورہ کی انجمن غالباً سلطان شاہی کی انجمن سے کچھ بہتر نہیں ہے ۔ مغلپورہ کی انجمن کے معتمد میر تہور علی صاحب کی ہمت پر صد ہزار آفریں ہے کہ موصوف کی مستعدی سے وہ اب تک برابر کام کیے جارہی ہے اور ترقی بھی کررہی ہے انجمن نے اپنا ایک کتب خانہ بھی قایم کیا ہے اس کا کام بھی اطمینان بخش طریقہ پر جاری ہے لیکن جب تک اسکی زندگی میں نئے نئے معاونین کے ہاتھ دلچسپی سے ساتھ نہ بڑھتے جائیں اس کے ابھرنے کی امید نہیں ۔ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر کتب خانے کے مہتمم جناب محمد محمود علی خاں صاحب نے امداد کیلیے اپیل شایع کی ہے ۔

ملکوں کے ارتقا میں اشاعت علم کی بنیادی ضرورت پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہی ہے تاہم ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بڑودہ دیسی ریاستوں میں ایک بہت ہی چھوٹی ریاست ہے لیکن وہاں اشاعت علم کے لیے جس قدر نظام مرتب اور مروج ہے اس میں کتب خانوں ہی کو بڑا دخل ہے بڑودہ لائبریری تحریکات خود برطانوی ہند سے بھی پیش پیش ہیں ۔ حتیٰ کہ ویسرائے بہادر اپنے گذشتہ دورہ میں ریاست کی طرف سے دعوت کے موقعہ پر مہاراجہ صاحب کا جام صحت تجویز کرتے ہوے بڑودہ کی چھوٹی سی ریاست کی وہ تعریف کی کہ یاد ہی رہے گی ۔ ہماری اس وسیع مملکت کے متطیع باشندوں سے توقع ہے کہ وہ مہتمم صاحب کی اپیل پر اخبار و کتابوں فرنیچر یا رقم سے غرض جس طرح ممکن ہو کتب خانہ کی مدد فرمائینگے کیونکہ یہ بلدہ کے خانگی کتب خانوں میں ہے جو عوام کی توجہ کی امید میں کام کررہا ہے اور اس طرح کہ دوسرے نام نہاد کتب خانوں کی طرح نہیں ۔

شاعری او ترجمانی حیات

از جناب ابوالحامد محمد بشارت علی صاحب قریشی (کلیہ جامعہ عثمانیہ)

میتھو آرنالڈ کی تعریف کے مطابق شعر انسانی زندگی کی ایک تفسیر ہے۔ فطرت انسانی کی تحلیل امور ممکنہ سے نہیں اس لئے شاعری کی جامع اور مانع تعریف ممکن نہیں۔ تعریف اگر ٹھیک ٹھیک ہوجائے تو اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ اس میں تحلیل وتقسیم کا امکان موجود ہے۔ انسان کے خیالات کے اظہار کے لئے کتم عدم سے بہت سے فنون دجود میں آئے جیسے رنگ روپ کے اظہار کے لئے مصوری او نقاشی آواز اور زبان کی ترجمانی کے لئے موسیقی اور شاعری۔ چونکہ شاعری زیادہ احساسی ذہنی اور روحانی ہے اسوجہ سے قدرت کی طرف سے اس میں یہ مادہ رکھا گیا ہے کہ وہ قلب انسانی کے لئے باعث مسرت اور تسکین دہ ہو اس لئے اس کی عمارت کی بنیاد ایسی مستحکم اور مضبوط ہونی چاہیئے کہ اس میں تزلزل کا احتمال نہ ہو۔

فطری شاعر سے صحیح معنوں میں وہ مبارک ہستی مخاطب ہوسکتی ہے جس میں مجاز او حقیقت کے درک وادراک کا مادہ ہو ایسے شاعر کا کلام جاذبیت سے مملو ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے مشاہدات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے تو وہی سما ہماری آنکھوں میں بندھ جاتا ہے اور ہمارے جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں۔ شاعری کا مقصد صرف یہی نہیں کہ انسان میں طمانیت قلب کی جھلک پیدا کرے یا یہ کہ جذبات میں پاکیزگی اور حیات تازہ پیدا کردے یا روح کو جلا اور ضیا بخشے۔ بلکہ شاعر قدرتاً عام انسانی ہستیوں سے زیادہ قوت تمیز وامتیاز اور احساس رکھتا ہے اور اس کے تجارب عام انسانی دنیا سے زیادہ گہرے اور وسیع ہوتے ہیں۔ اگر بہ امعان نظر سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوجائے گا کہ اسرار حیات کی ترجمانی کا نام شاعری ہے۔ اس لئے شاعری کا تمام میٹریل زندگی اور زندگی کے متعلقات میں یہ کوئی ڈھکوسلا یا خیالی بات نہیں بلکہ دنیا کے نامور شعرا اور نقاد اس کو مانتے آئے ہیں چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے ہرگز یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لاسکے۔ اس کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دیکر اس میں ایک نئی صورت پیدا کردے۔ پس

جس طرح معمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ مٹی اور چونے کا یا پھر بھی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے اسی طرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب دینے میں کسی ایسے مصالح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو ۔ وہ مصالح کیا ہے یہی دنیا کے حالات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گذرتے ہیں خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں یا زمین آسمان چاند سورج پہاڑ اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا پتھر لکڑی اور بھینگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی اس کی مثال اُس معمار کی سی ہوگی جو عمارت بنانے کے لئے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصالح کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی ۔ [۵]

وہ مقدمہ شعر و شاعری میں شرائط شاعری کی سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں :۔۔۔

اگرچہ قوت متخیلہ اس حالت میں بھی جب کہ شاعر کے معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اُسی معمولی ذخیرہ سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ نسخۂ کائنات اور اس میں سے خاصکر نسخۂ فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے ۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا جو امور مشاہدہ میں آئیں اُن کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدے کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے ۔

مولانا شبلی بھی حالی کے ہم خیال ہیں۔ چنانچہ شعر کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں :۔۔۔

شاعری قوت متخیلہ کا انکشاف ہے ۔ دراصل یہ وہ فن ہے کہ جس کے ذریعے سے لفظوں کا استعمال کر کے پردہ تصویر پر خیالی نقش و نگار ثبت کئے جاتے ہیں ۔ جو کام مصور رنگوں کے استعمال سے لیتا ہے وہی کام شاعر الفاظ کے ذریعہ سے نکالتا ہے ۔ شاعری جذبات اور خیالات کی بولتی ہوئی تصویر اور حسن و حقیقت کی تشریح سے یہ انسانی قلب کے کیفیات کو سریلی زبان کے ذریعہ معترض بیان میں لاتی ہے ۔ [۶]

---

[۵] ملاحظہ ہو دیوان حالی دیباچہ ص۔ مطبوعہ انوار احمدی پریس پہلا اڈیشن ۱۹۲۴ء ۔

[۶] مقدمہ [illegible] ازڈاکٹر سید محمود نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۳ء

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری بھی شاعری کی جو تعریف کرتے ہیں وہ قابل غور ہے :ـــ

شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حدنگاہ کے مطابق حقیقت اور مجازیہ جذبہ اور وجدان ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ تقسیم خود انکی نارسی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمو میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ کونسا نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔ جمال الٰہی ہر شئے میں رونما ہے آفرینش کی قدرت جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانہ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے ۔ [1]

روحی فداہ آقائے نامدار سرکار دوعالم صلعم عنترہ اور امرالقیس پر ناقدانہ روشنی ڈالکران کی شاعری کی جو حمد و ثنا فرمائی ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ اُن کے اشعار کائنات انسان اور انسانی متعلقات سے مملو ہیں۔ اُن سے سیاسی ماحول ۔ رسم و رواج' مسرت و غم ۔ عوام کی طرز معاشرت' تروتازہ کی نفسیاتی کیفیات' شجاعت' بہادری' جانبازی' ایثار' اضحام حرب' عشق و محبت کے جذبات غرض یہ کہ فطرت انسانی اور کائنات کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے قدرت کے لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت جس کے وہ خود حصہ دار ہیں تمام انسانی ہستیوں کو جو انکی دنیائے علیین میں سیر کرنا چاہتے ہیں حصہ دار بنایا ہے۔ بہرحال شاعری دراصل تخیل و احساسات کی وساطت سے زندگی کی ترجمانی کا نام ہے۔ علی گڑھ میگزین کے قابل مدیر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے :ـــ

علم ادب بالخصوص شاعری کا سب سے بڑا فرض عوام کے ضمیر میں اس نئی دنیا کا مفہوم اور اہمیت واضح اور روشن کرنا ہے جو بقول علامہ موصوف "فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کرائی ہے" [2]

مولوی [3] ظفر علی خاں نے جنگ طرابلس کے سلسلے میں اقبال کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں وہ شاعری کی کامیابی کا انحصار اسی پر بتاتے ہیں کہ وہ زندگی کی ترجمان ہونے کے علاوہ اقتضائے وقت اور زمانہ کے موافق ہو۔ "گروہ علمائو شعرا میں وہی لوگ کامیاب ہو سکے جو اپنے اقوال کے ذریعہ سے اہل زمانہ کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں"

---

[1] رسالہ تحفہ حیدرآباد بابتہ شعبان المعظم ۱۳۴۳ھ

[2] و [3] ماخوذ از دیباچہ کلیات اقبال مرتبہ عبدالرزاق صاحب مددگار صدر محاسب ۔

آگے چلکر وہ شاعری کی کامیابی اور بقائے دوام کے لئے پھر اس امر پر زور دیتے ہیں کہ زمانہ کی رفتار پر نظر رکھی جائے اور اس کے مطابق شاعر اپنے توسن فکر کو گرم جولاں کرے ۔

اس بنیادی اصول کو مدنظر رکھ کر جن شعرا نے شاعری کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور زندگی کو بخوبی سمجھنے اور اس کی صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے وہی دنیا میں باعظمت شاعر کہلاتے رہے ہیں ۔

اوپر ہم نے دو جگہ مولانا حالی کی کتاب سے اقتباسات پیش کئے ہیں ۔ موضوع کی اہمیت کی بناء پر مزید توضیح کے لئے ہم یہاں دو اور مختصر سے اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے اس نظریہ کی اہمیت زیادہ مدلل ہوجائیگی

"اس میں فطرت انسانی کے دقائق وغوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے" اس سے آگے بڑھکر اس کی مزید توضیح یوں کرتے ہیں ۔ "اس کا اصلی مقصد فطرت انسانی کی کرید اور واقعات دہر سے متاثر ہوکر دل کی بھڑاس نکالنی ہے" [۱]

[۲] جارج مور جو انگریزی ادبیات کا بڑا حامی گزرا ہے شاعری کی دو قسمیں قرار دیتا ہے ۔ ایک وہ شاعری جس میں شاعر صرف اپنے جذبات احساسات اور واردات قلبی کا اظہار کرتا ہے ۔

دوسری وہ شاعری جس میں شاعر اپنی قوت متخیلہ سے واقعات واشیا کی اصل حقیقت وماہیت کو زیادہ واضح کردیتا ہے ۔

اول الذکر شاعری ہر زمانہ اور ہر ملک میں یکساں تاثیر رکھتی ہے مگر باوجود تاثیر کے اپنی قلبی واردات و کیفیات کی وجہ سے ایسی شاعری سچی شاعری کہلانے کی مستحق نہیں کیونکہ یہ واردات قلبی عارضی وجود رکھتے ہیں اور ان کی بساط نقش آب سے زیادہ نہیں ۔ اس لئے ایسی شاعری کو بقا اور عظمت حاصل نہیں ہوسکتی ۔ آخر الذکر میں تغیرات اور انقلابات ممکنات سے ہے مگر اشیا اور واقعات کے استقلال کی بنا پر یہ شاعری ابدی ہوگی ۔ اس میں شک نہیں کہ خیالات کے مدوجزر کے تحت اس میں بھی گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی خاص ملک یا خاص زمانے میں موثر سمجھی جائے مگر اشیا اور واقعات تعین کی بنا پر شاعری بھی ابدی ہوگی اسی کو ڈاکٹر عبداللطیف یوں ادا کرتے ہیں :- [۳]

شاعر طرح طرح کے تجربات محسوس کرتا ہے اور ان میں کا ہر تجربہ اس کے ذہن کے ایک پہلو کا

---

[۱] دیباچہ دیوان حالی ۔

[۲] ہمایوں بابت جنوری ۱۹۲۸ء

[۳] ملاحظہ ہو۔ GHALIB BY S. A. LATEF P. H. D. اور مجلہ عثمانیہ بابتہ بہمن وار دی بہشت ۱۳۴۰ ف ۔

آئینہ بردار ہو۔ اس پہلو کی ترجمان بجائے خود موثر ہو سکتی ہے اور بڑا شاعرانہ تجربہ بڑھتے ہوئے احساس ہم آہنگی سے گیل مل کر اعلیٰ شعر کی صورت میں ٹپک پڑتا ہے۔

متذکرہ امثال اور اقتباسات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ شاعری کا براہ راست تعلق زندگی سے ہے گویا اس کی صاف توضیح یہ ہے کہ شاعری کی بیخ و بنیاد زندگی ہے، شاعری کی تخلیق زندگی ہے۔

شاعری کا ارتقا اور عظمت زندگی پر اسی لئے اسرار حیات اور دقائق جو عام طور پر لاینحل سمجھے جاتے ہیں۔ شاعران کے حجاب سربستہ رموز کو توڑ کر نوامیس فطرت و حیات کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ بہر حال شاعری کسی طور پر بھی زندگی سے بغاوت نہیں کر سکتی اگر وہ انحراف اور بغاوت کرے تو گویا قضا و قدر سے انحراف اور بغاوت ہے جیسے سفر میں منزل مقصود کا حصول مقصد اعظم ہوتا ہے۔ شاعری کا مقصد اعظم یا منزل مقصود زندگی ہے۔

شاعری اور زندگی کا قدیم سے چولی دامن کا ساتھ ہے "قوموں کے بچپن میں اگر ہم کوئی ادب پاتے ہیں تو وہ بھی شاعری ہے جب فن کتابت بطن عدم میں تھا اور صرف حافظۂ انسان کے لئے ایک کتب خانہ کی حیثیت رکھتا تھا اس وقت بھی شاعری جلوہ گر تھی اور لوگ سینہ بہ سینہ اشعار یاد رکھتے چلے آتے تھے بلکہ شاعری کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے اسے اپنے رسم و روایات اور فضل و ہنر کے سانچوں میں ڈھال لیا۔ اسی جگہ سے یہ خیال چلا ہے کہ شاعری ایک الہامی چیز ہے اور خدائی پیغامات کا مظہر ہے" ؎۵

انہیں اسباب و علل کی بنا پر شاعر اور شاعری ہمارے اعتماد اور یقین کے مستحق ہیں اور شاعری سے متمتع ہونا عقل و فراست کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ وہ ہماری زندگی ہے اور ایسی زندگی جس کو روحانی زندگی کے نام سے مخاطب کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اعلیٰ ترین رجحانات، ارفع عقائد، پیاری امیدوں، شدید غموں اور مقدس تصورات اسرار حیات اور نکات زندگی کی عقدہ کشا ہے اور یہی ذوق صحیح قاری کے دل و دماغ کو لطیف تحریکات سے مملو کر دیگا ؎۶ بقولے

> اگر الفاظ کے ذریعہ فطرت کے اسرار روز روشن میں لائے جاتے ہوں، روح کی تکلیف دور کیجاتی ہو، پوشیدہ ملال فنا ہو جاتا ہو، ہمدردی کا جذبہ جنبش میں لایا جاتا ہو، نصیحت کے گھونٹ پلائے جاتے ہوں تجربہ کی تاریخ لکھی جاتی ہو۔ ماضی و حال اور مشرق و مغرب ایک رشتہ میں منسلک کئے جا سکتے ہوں

؎۵ مجلۂ عثمانیہ جلد اول شمارہ چہارم بہمن ۱۳۳۷ف فصلی مضمون شاعری اور حیات انسانی۔

؎۶ محمد امیر صاحب اورنگ آبادی بی۔ اے۔ بی ٹی۔

تو پھر واقعی شاعری قوموں کی زندگی کا ست ہے ۔

شاعری حرکت میں لانے والی قوتوں اور انمٹ یادوں کا خزانہ ہے اور ان انمول خوشبوں کا دلاویز ذخیرہ ہے جو دنیا کے بازاروں میں کبھی بکنے نہ آئی ہوں شاعری اُن لوگوں کے لئے جو نہایت ہی قید اور تکلیف میں ہیں آزادی کا مژدہ اور زندگی کا سانس ہے شاعری غیر فانی ہے اور حادثات سے آزاد ؎ ۱

غزل

(از جناب توفیق الحسن صاحب توفیق ۔ بی ۔ اے علیگ)

گوارا شوق سے ہر ظلم ہر بیداد کر لینا
دلِ رنجور پاسِ خاطرِ صیاد کر لینا

جفائیں ہم پہ جتنی چاہنا صیاد کر لینا
مگر پہلے خیالِ خاطرِ ناشاد کر لینا

یہ بولی گردشِ قسمت قفس میں دل جو گھبرائے
کبھی نالہ کبھی شیون کبھی فریاد کر لینا

قفس میں بھی نظر آجائینگے جلوے گلستاں کے
نظر کو قیدِ محسوسات سے آزاد کر لینا

بہار آئے اگر اے ہمصفیرو صحنِ گلشن میں
اسیرانِ قفس کی بے بسی بھی یاد کر لینا

قفس سے چھوٹ کر آئے نہ آئے کیا خبر ہم بیں
تو اب صحنِ گلستاں شوق سے آباد کر لینا

چمن والو اگر میری مصیبت یاد آجائے
تو اک دن شکوۂ بیمہری صیاد کر لینا

نشاط و عیشِ عالم سے اگر فرصت ملے تمکو
تو ذکرِ خیر سے توفیق کو بھی یاد کر لینا

؎ ۱ مجلہ عثمانیہ جلد اول شمارہ چہارم بہمن ۱۳۳۶ف مضمون شاعری اور حیاتِ انسانی ص ۱۸

محبّت کی فتح

(از جناب مسعود الرّحمٰن صاحب ندوی)

خلیق الزماں صوبہ مدراس کے نہایت کامیاب و مقتدر طبقۂ وکلا میں تھے وہ عرصہ تک بسلسلۂ تعلیم ممالک یورپ میں رہے اب عرصہ سے یو۔پی۔ کے مشہور شہر اور ہندوستان کے واحد دار العلم علی گڈھ میں سکونت اختیار کرچکے ہیں۔ وہ مغربی و مشرقی تہذیب و تمدن کے کامیاب نمونہ تھے۔ اپنے خاندان میں پہلے شخص تھے جو بغرض تعلیم یورپ گئے۔ اُن کے سوائے ایک لڑکی منصورہ کے اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ اردو فارسی کے علاوہ منصورہ کو انگریزی کی ضروری تعلیم بھی دلائی تھی۔ لڑکیوں کے سلسلہ مناکحت کے بارے میں وہ کسی قدر وسیع خیال رکھتے تھے وہ زبردستی کے رشتہ کے بہت سخت مخالف تھے۔ گھر میں چونکہ ایک بچی تھی لہٰذا سب کی محبت کا مرکز تنہا وہی تھی نیز اپنے حسن ظاہری اور سلیقہ و تہذیب کے لحاظ سے بھی منصورہ انتہائی محبت کیے جانے کے قابل تھی۔

"آہ ــــ کشوری! میں اس دل کو کیا کروں۔ لاکھ لاکھ کوشش کرتی ہوں کہ یہ سنبھل جائے مگر کمبخت کسی پہلو چین نہیں پڑتا"۔

مذکورہ بالا الفاظ منصورہ نے اپنی ماما سے کہے وہ ایک صوفہ پر بیٹھی گردن جھکائے ڈوپٹے کے پلو کو توڑ مروڑ رہی تھی

بی بی ــــ آپ کہاں ہیں یہ بچپن کی باتیں چھوڑئے جو شخص صرف چار یوم کا مہمان ہو اور اس کے حالات کا کسی کو علم نہ ہو وہ کہاں تک ان نوازشات کا متحمل ہوسکتا ہے۔ اور پھر بجائے خود بڑی حد تک ہر وقت دیوانگی کے اثرات اس پر قائم" کشوری نے کہا اور کہکر بنظر غائر منصورہ کو دیکھنے لگی۔ "کشوری تم کیا جانو میں اس کے اس انداز دیوانگی و محویت کی قتیل ہوں۔ ہائے ان جذبات سے تم کو کیونکر باخبر بناؤں جو سینہ کو اندر ہی اندر سلگا رہے ہیں اور جن کی تپش سے میں اپنے تمام جسم کو سخت اذیت میں مبتلا پاتی ہوں میں جسقدر اس دیوانے کی شکل کو بھولا دینے کی کوشش کرتی ہوں وہ اور میرے لئے مصیبت ہوئی جا رہی ہے۔ آخر اس آزار سے پناہ و دوری کی کیا شکل ہوسکتی ہے.......

.... اب میں اس نتیجہ تک پہونچی ہوں کہ تم ان تک میری تحریر پہنچا دو آیندہ میری قسمت جسقدر جو کچھ دکھلائے دیکھنا اور سہنا پڑیگا۔" منصورہ نے کہا اور بادیدۂ پرنم کشوری کو دیکھا۔

احمد دوپہر کو خلیق الزماں صاحب کی کوٹھی واقع متصل نمایش گاہ لیٹا ہوا اپنے خیالات میں منہمک تھا کہ اتنے

میں کشوری پہونچی اور خاصدان دیکر چلی گئی خاصدان سرکایا احمد کو حیرت ہوئی کہ پانوں کے نیچے ایک تحریر موجود ہے۔

"آپ کیوں اسقدر ظلم و تشدد کے خوگر ہیں۔ یہ عادت تو احسن نہیں اگر فرصت ہو ـــــــ تو نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں"

احمد (بمبئی یونیورسٹی کا لائق گریجویٹ) پہلے ہی سے کسی ادارہ محبت کی تلاش میں سرگرداں و پریشان پھر رہا تھا۔ اس تحریر کو پڑھ کر زار و قطار رونے لگا۔ احمد نے سکون پانے پر پھر تحریر کو بغور پڑھا وہ اپنے قلب و دماغ میں سوائے ایک خیال کے کسی دوسرے کے خیال کو دخیل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

مگر اس تحریر سے متاثر نہ ہونا بھی اس کے لئے ایک سخت آزار تھا۔ پرچہ کی پشت پر اس نے یہ شعر لکھا۔

"ریاض دہر میں نا آشنائے بزم عشرت ہوں — خوشی روتی ہے جسکو میں وہ محروم مسرت ہوں"

کشوری نے پرچہ احمد سے لے جاکر منصور کو دیدیا۔ منصور ایک متمول خاندان کی چشم و چراغ نہایت فہیم و ذکی حسن صورت کے ساتھ فطرتاً شاعرانہ مزاج و جذبات لطیف کی حامل عنفوان شباب کے ناقابل ضبط جوش سے مست و بے قابو یہ سب اسباب یونہی اوسکی تباہی و بربادی کے لئے کیا کم تھے کہ دفعتاً احمد جیسے نوجوان کا حسن سحر کار منصور کی تباہی کا بہانہ بن گیا۔ منصور کا نازک دل و دماغ اس حادثہ کا کب متحمل ہو سکتا تھا گھر بیٹھے اس کو ایک حیلہ ہاتھ آگیا اور وہ مزے لیکر تڑپنے لگی۔ وہ محبت کو اپنے نقطۂ نظر سے ایک سرور و انبساط سمجھا کی اس کو کیا خبر تھی کہ محبت صرف ایک جذبۂ پسندیدگی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک پر کیف و خاموش آزار پر سکون خلش۔ اک جان کو گھلا دینے والی لیکن وجدانی کیفیتوں سے بھر دینے والی تپش کا نام محبت ہے جب وقت تک اس نے احمد کو نہیں دیکھا تھا وہ اس کو ایک خوبصورت شے سمجھکر متاثر ہوتی مگر جب احمد پر نگاہیں پڑیں تو منصور احمد کو سخت ظالم و دل آزار سمجھنے لگی وہ بار بار سوچتی کہ آخر یہ کیا تھا کہ جب احمد باغ میں مصروف خرام ہوتا تو میرا دل یہی چاہتا کہ میں اپنا دل اس کے قدموں کے نیچے ڈالدوں گھنٹوں احمد سکوت و محویت کے عالم میں باغ میں ٹہلا کرتا حوض پر بیٹھکر چھڑی سے سرخ سرخ مچھلیوں کے ساتھ کھیلتا کبھی کبھی شیروان کی جیب میں سے کوئی چیز نکال کر مچھلیوں کو ڈالتا یا یہ ہئیت کذائی کہ اس کی پیشانی پر گھونگر دار بالوں کے لچھے آجاتے شروان کا گلا کھلا ہوا کبھی کبھی باریک تنزیب کے کرتے کا گلا بھی چاک منصور دیوانے احمد کو پہروں بیٹھے دیکھا کرتی معلوم نہیں وہ فطرتاً اس افتاد طبیعت کا انسان تھا یا یہ وقتی ہیجان تھا پورے ایک ہفتہ تک مسلسل غور و فکر کے بعد منصور نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر زندگی اور زندگی ہی مسرت و شادمانی سے لبریز حاصل کرنا ہے تو پھر احمد کو شریک زندگی بنایا جائے ورنہ جینے کا لطف نہیں۔ منصور فطرتاً بہت مضبوط عزم

وارادہ کی مالک تھی اس کا خیال تھا جس پر وہ بہت مضبوطی سے قائم تھی کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زندگی کا فیصلہ کریں اور یہی وجہ تھی جو اس نے ایک مختصر تحریر خاصدان میں رکھ کر احمد کو روانہ کر دی تھی وہ صرف یہ جانتی تھی کہ احمد بمبئی پریسیڈنسی کالج کا لائق گریجویٹ اور اس کے والد کا مہمان ہے اس سے زیادہ اسے کچھ علم نہ تھا پرچہ کا جواب ایک شعر کے ذریعہ دیا گیا اس نے ذرا اجرأت سے کام لیکر مفصل تحریر لکھی

"احمد صاحب۔ طرز مخاطبہ کی معافی۔ آپ نے میرے لیئے کیوں سامان ہلاکت و بربادی پیدا کئے

آخر میں ہی تو ؟ مسافروں کا کیا آج یہاں کل وہاں
اک جا رہتے ہیں عاشق بد نام کہیں
....

آپ "محروم مسرت" کیوں ہیں "دہر" کی شکایت آپ جیسے خوش قسمت شخص کو بجائے حیرت و استعجاب ہے آپ نے سرائے سامان تپش و اضطراب کیوں مہیا کیا اس کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی ؟ پھر اس پر طرہ یہ کہ ہم مسافر اور "ریاض دہر" میں "محروم مسرت" ہیں۔ آپ ہمیشہ یہاں رہنے کے لئے تشریف نہیں لائے یہی تخیلات ہیں جس کی وجہ سے میں سخت پریشان و سراسیمہ ہوں۔

تھوڑی سی بھیک مانگتی ہوں۔ عنایت و محبت سے چند لمحات اور اک غریب و مہجور دردمند محبت کی بپتا چند منٹوں میں سن لو۔ خدا تم کو اس کا اجر دیگا۔

مہجور منصور

احمد مذکورہ تحریر کو پڑھکر دنگ رہ گیا منصور کی جرأت بیباکی سے وہ متاثر نظر آتا تھا مگر اس کے مذہب میں صنف نازک کے کس فرد کی دل آزاری بھی جائز نہ تھی اس نے اسی اصول پر غور کرتے ہوئے منصور کی تحریر کا حسب ذیل جواب دیا۔

"آپ کا بیتاب نامہ ملا۔ نوازشات کا مشکور، مسافرنوازی کا ممنوں۔ آپ کے خط میں واقفیت ہو یا نہو مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے لئے اس میں سامان جراحت بہت کافی ہے۔ اگر میری وجہ اور اس غریب کی موجودگی آپ کے لئے سبب آزار و تکلیف ہوئی تو للہ اس کو معاف کر دیجئے میری رام کہانی بہت ہی دردناک ہے میرا یہاں اجنبیانہ قیام کسی ہستی کی تلاش و جستجو کا حامل ہے جس کی اک اک ادا پر میں اپنی کل ہستی فروخت کر چکا ہوں اب اس میں میرا کیا یہی مجبوریاں ہیں جس کی وجہ سے میں شاید آپ کے لئے باعث کلفت ثابت ہوا۔

آپ کی محبت سر آنکھوں پر۔ محبت میری نزدیک نام ہے ہر اک بے غرض انہماک اک خود فراموشی

محبت کا اور اس میں میرے لئے راحت و آرام ہے۔ اس لذت کی ہلاہل آپ سے کیا بیان کروں
آپ کے لئے یہ مقام بالکل اجنبی ہے۔ خدا را اس خار زار سے اپنے دامن کو بچائیے آپ جیسی نازنین
اور یہ دشوار پسندی۔ راہ محبت۔

اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔

مجھے توقع ہے کہ آپ نے میری تحریر سے کوئی غلط راہ قائم نہیں کی ہوگی۔ آپ کی جملہ عنایتوں و
احسانات کا مشکور۔

احمد

تحریر کو پڑھکر منصور کو انتہائی اذیت ہوئی اُسے قطعی توقع نہ تھی کہ احمد جیسا وارفتہ مزاج نوجوان اس کے جذبات
کو یوں ٹھکرا دیگا۔ منصور نے صرف احمد سے یہ کہا تھا کہ چند لمحات دید یجئے وہ صرف اس خواہش کو لئے ہوئے ہے کہ اگر
ایک بار احمد سے لطف ہمکلامی حاصل ہو گیا تو دشوار ہے کہ ایسے منظر کو احمد جیسا رقیق القلب انسان دیر تک برداشت کر سکے
"محبت کرنے والا چاہتا ہے کہ محبوب کی زندگی کو بھی اپنی زندگی کی طرح تباہ کر دے۔ محبوب خود اپنی بربادیوں
میں معین ہو جاتا ہے۔ اس لئے محبت مہلک ترین نفرت ہے وہ شخص جس سے براہ راست نفرت کیجائے اپنی ہستی
کے تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن محبت کی فریب کاریاں انسان کو خود اپنی ہلاکتوں پر مجبور کر دیتی ہیں۔ وہ
ہر دل جو حسن سے متاثر ہوتا رہتا ہے خود اپنی ہستی سے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ اس کی انفرادیت کا اضمحلال اس کا باعث
ہے کہ اسے دوسری ہستیاں اپنے وجود سے اہم تر نظر آتی ہیں۔ رفتہ رفتہ جذبات محبت کسی خاص محبوب کے محتاج
نہیں رہتے۔ بلکہ اک جذبۂ مخصوص طاری ہو جاتا ہے" اور یہی اصلی محبت کا مآل ہے۔ عورت عشق و محبت کے پیچیدہ
مراحل میں بہت جلد نتیجہ حاصل کر لیتی ہے وہ خود جب کسی کو چاہتی ہے تو اس کا دل اس کا بھی متمنی ہوتا ہے کہ میں جس
سے محبت کرتی ہوں وہ بھی مجھے چاہے اسی نظریہ کا ماحصل تھا جو اس نے احمد کو تحریر میں ظاہر کیا اسے یقین تھا کہ ایک
بار گفتگو کے بعد احمد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ منصور سے تغافل برتے منصور نے کسی ناجائز و خلاف اخلاق امر
کی جانب احمد کو دعوت نہیں دی تھی بلکہ اس کا مقصود یہ تھا کہ جائز طور پر اپنی ہستی احمد کے قدموں میں ڈالدے۔

احمد نے منصور کے خط کا جواب جس انداز میں دیا تھا اس پر وہ دیر تک غور کرتا رہا وہ اب طرح طرح کے
خدشات میں مبتلا و خراب نظر آتا تھا اس کو علی گڈھ آتے ہوئے تقریباً پندرہ دن ہو گئے وہ اپنے اوپر نفریں کر رہا ہے
کہ کیوں اس قدر دن فضول اپنے علی گڈھ میں گنوائے تعلیم کا حرج علیحدہ گھر والوں کی پریشانیاں جدا اس کی روح کو

اذیت پہونچا رہی تھیں ۔ اور پھر منصور کے نئے حادثے نے اس کی عقل کو خرچ کر دیا تھا وہ خاموشی سے ان حادثات پر غور کر رہا تھا کہ ملازم نے خلیق صاحب کا لفافہ لا کر پیش کیا جس کی عبارت حسب ذیل تھی ۔

"عزیز احمد ۔ تم اس عدیم الفرصتی کو نظر میں رکھتے ہوئے مجھے معاف کرو گے کہ میں زیادہ وقت تمہارے پاس نہ گذار سکا تمہاری شرافت و قابلیت تمہاری سنجیدہ اطوار و عادات نے گھر بھر کو تمہارا گرویدہ بنا رکھا ہے اب تمہاری جدائی کسی پہلو بھی گوارا نہیں ہو سکتی ۔

اک خاص معاملہ میں تمہاری توجہ مبذول کرانی چاہتا ہوں ۔ تمہاری سعادت مندی اور ان تعلقات کی بنا پر جو تم نے چند روز میں حاصل کر لئے ہیں اس کی جرأت ہوئی ۔ میری لڑکی منصور جس کے لئے میں تم سے زیادہ پسندیدہ نوجوان نہیں پا سکتا چاہتا ہوں کہ اس کو تمہاری خدمت کے لئے پیش کر دوں تمہارے طرز عمل سے مجھے امید و توقع ہے کہ تم میری اس جائز خواہش کو رد کر کے میرا دل نہ دکھاؤ گے اور اس معاملہ خاص میں جو شبہات تمہارے دل میں ہوں ان کو تم بذریعہ نظر جلد صاف کر لو گے ۔

مخلص خلیق

تحریر پڑھکر احمد کی حالت متغیر ہو گئی واقعات سے پردہ اٹھ گیا دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا سگرٹ کو کبھی جلاتا کبھی بجھاتا وہ مجنونانہ حرکات میں محو کسی بڑے اہم مسئلہ پر غور کناں نظر آ رہا تھا ۔ ابھی وہ اپنے تخیلات میں محو و منہمک تھا کہ دروازہ کا پردہ متحیر کو نظر آیا اور ایک ذی روح ہستی سر تا پا برقع میں ملبوس سامنے آ کر رک گئی اس نے ہزار کوشش کی کہ یہاں سے نکل بھاگے اب برقع کس کے چہرے سے علٰحدہ تھا یہ منظر دیکھکر احمد کرسی پر گر پڑا اس کا سر چکرا رہا تھا آنکھیں پتھرا گئیں وہ بالکل از خود رفتہ تھا ۔ سچ ہے کہ محبت اک آسمانی شعاع ہے جو انسانی عقل کو خیرہ کر دیتی ہے یہی حال منصور کا احمد کی محبت میں ہوا جس کا نتیجہ یہی ہونا چاہئیے تھا ۔ آدھ گھنٹہ کی اس خاموشی کے بعد احمد ہوش میں آیا وہ جلد سے جلد اس مقام کو چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر مجبور تھا منصور کا برقع جسم سے جدا تھا وہ احمد کے قدموں میں سر رکھے بیٹھی تھی احمد منصور کی اس حرکت پر دل میں سخت نادم و منفعل تھا وہ خاموش تھا کہ اس سین کا کیا انجام ہونے والا ہے ۔ منصور کے آنسوؤں سے احمد کے پاؤں تر اور نظر آتے تھے احمد جیسا رقیق القلب انسان ایسے دردناک منظر کو کب تک برداشت کر سکتا تھا اٹھا منصور کو ہاتھ لگا کر قدموں سے جدا کرنا تھا کہ منصور احمد کے آغوش میں تھی اور بیہوش زانو پر سر رکھکر احمد وہیں فرش پر بیٹھ گیا تھوڑے عرصہ میں ہوش آیا احمد نے کہا "آپ کیوں میری

بربادی کے درپے ہیں منصور کو اب ہوش آچکا تھا منصور کو نہ اپنے ناموس و عزت کا خیال تھا اور نہ اس بے پردگی کا وہ بالکل مبہوت تھی اور اپنی زندگی کا فیصلہ سننے کے لئے بیتاب۔ احمد اس سکر آمیز شباب کشیدہ قامتی اور محبت سے بڑی حد تک موم ہو چکا تھا آخر الامر اس نے دل پر جبر کر کے منصور سے پوچھا "آپ اس غریب الدیار شخص سے کس امر کی متمنی ہیں"۔

اس گفتگو و انداز مخاطب کو سنکر منصور کے چہرے پر آثار شگفتگی پیدا ہوئی وہ بہت سنبھلی ضبط کیا بے اختیار ہو کر احمد کو لپٹ گئی دیر تک روتی رہی اب وہ کامیاب تھی احمد زخمی ہو چکا تھا اور مجبور و مایوس ہو کر منصور کے قدموں میں نظر آتا تھا۔ وہ منصور کے عالم آشوب حسن سے مسحور ہو چکا تھا اب سوائے اقرار کے اس کے لئے کوئی چارا نہیں تھا۔ منصور کی ہر خواہش پر لبیک کہنا اب اس کا فرض عین تھا۔

احمد بڑی حد تک اپنے آپ کو مضبوط دل و دماغ کا انسان سمجھتا تھا مگر یہ اس کے شباب کا فریب اور جوانی کا دھوکا تھا۔ وہ ہمیشہ امادہ ہلاک نظر آتا اس کے زخم کو صرف ذرا سے نشتر کی ضرورت تھی جو منصور کی تھوڑی سی توجہ میں حاصل ہو گیا۔ پہلے منصور کو اپنے سینہ و شانہ کی عریانی کی مطلق پروا نہ تھی اور اب وہ اپنے ہاتھ بھی احمد کو دکھلانا پسند نہیں کرتی تھی۔

محبت کا تعلق روح سے براہ راست ہے تعلق ازدواج میں مبتلا ہو کر بھی اس میں وہی لطافت باقی و ساری رہتی ہے احساس مند دل و دماغ صرف اس کی لطافت و نزاکت ہی میں سرشار رہنا سرمایہ زندگی سمجھتے ہیں محبت اک قسم کی خوشبو ہے جس کا پوشیدہ رہنا ناممکن ہے۔

صبح کو احمد جب سو کر اٹھا تو بجائے مردانے کے زنانے میں اپنے آپ کو پایا منصور اس کے پہلو میں تھی اب وہ ایک غریب الوطن مایوس قسمت نوجوان احمد نہ تھا بلکہ حسین منصور کا چہیتا شوہر اور خلیق الزماں کا عزیز داماد بھی تھا۔ یہ ہے دراصل "محبت کی فتح"

ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست | وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خورسند ست
بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست | نگاہ اہل محبت تمام سوگند ست

خود اعانتی

(از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے)

بسلسلہ سابقہ

(۲)

انگریزوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی محنت کا جوش اور شوق ہے تاریخ ماضیہ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں نیز موجودہ زمانہ میں بھی مثل سابق ان میں یہ صفت خاص طور پر پائی جاتی ہے سلطنت برطانیہ کی اساسی اور صنفی برتری انگلستان کے عوام (COMMONS.) کی اسی جوش سے قائم ہوئی اس قوم کو جو زبردست ترقی حاصل ہوئی ہے وہ خاصکر افراد قوم ہی کی ازادانہ محنت کا نتیجہ ہے اور کاشتکاروں مفید آلات اور مشنوں کے موجدوں صنعتوں یا فن کاروں نے ہی اپنی دماغی اور جسمانی محنت سے قوم کو بنایا ہے محنت کا یہ جوش اس قوم کا اصل اصول یا مطمح نظر ہی نہیں رہا بلکہ اس کا محافظ اور مصلح بھی بنا رہا اور اس سے وقتاً فوقتاً ان کے قوانین کے اغلاط اور دستور کی خامیاں دور ہوئیں ۔

ین پی (N.P.) قوم نے محنت کو جو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا وہ اس کی مناسب اور بہترین تعلیم ثابت ہوا جس طرح تن دہی اور جانفشانی کی محنت سے ہر فرد کی مفید تربیت ہوتی ہے اسی طرح ریاست کی تربیت بھی ہوتی ہے ۔
محنت اور مفوضہ کام کی انجام دہی ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور قدرت نے ہر دو کا ثمرہ مسرت و شادمانی مقرر کیا ہے ایک شاعر کا قول ہے کہ خدا نے محنت کو اس راہ پر رکھا ہے جو (ELYSIAN FIELDS) کو جاتی ہے یہ بات یقینی ہے کہ انسان جو روٹی اپنی ذاتی محنت سے پیدا کرتا ہے اس کے مماثل کوئی روٹی خوش ذائقہ نہیں ہوتی محنت ہی سے انسان کو زمین پر قابو حاصل ہوا اور وہ جہالت کے غار سے نکلا ہے ۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب انسانی میں محنت کے بغیر ذرا بھی ترقی نہیں ہوئی ۔ محنت صرف ایک لازمہ اور فرض ہی نہیں بلکہ ایک برکت ہے صرف کاہل وجود انسان ہی اس کو برا سمجھتے ہیں محنت ابتدا ہی سے انسان کی رگ و پے ۔ دست و بازو اور دماغ میں لکھدی گئی ہے بالفاظ دیگر یہ کہ محنت انسان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور اس کی گھٹی میں پڑی ہے اور دماغ اور دست و بازو کی باقاعدہ محنت سے اطمینان قلب اور مسرت حاصل

ہوتی ہے محنت کی درس گاہ میں بہترین عملی دانشمندی سکھائی جاتی ہے اور محنت مشقت کی زندگی بھی جیسا کہ ہمیں آگے چلکر معلوم ہوگا اعلیٰ درجہ کی دماغی قابلیت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی ۔

ین پی' ہیو ملر جس سے بڑھکر محنت کی قوت اور کمزوری کا حال کسی کو معلوم نہ تھا اپنا تجربہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ محنت شاقہ میں بھی انسان کو فرحت حاصل ہوتی ہے نیز اس سے ذاتی ترقی میں مدد ملتی ہے وہ ایمانداری کی محنت کو بہترین معلم اور محنت کی درس گاہ کو اعلیٰ ترین درس گاہ سمجھتا تھا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ محنت ہی کی درس گاہ وہ مقام ہے جہاں انسان کو کارآمد بننے کی تعلیم دیجاتی ہے اور وہ آزادی کا سبق سیکھتا اور دلیرانہ محنت کا خوگر بنتا ہے ۔ ہیو ملر کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک میکانک کی تعلیم یعنے اصلی اور عملی اشیاء کا روزمرہ سابقہ اور انسانی زندگی کا گہرا تجربہ جس سے اس کے ذاتی جوہر ظاہر ہوتے ہیں میکانک کو سفر زندگی کو آسانی سے طے کرنے کے زیادہ اہل بنا دیتا ہے اور حقیقت میں اس کی ترقی میں کسی لو تعلیم و تربیت سے زیادہ ممد و معاون اور موزوں ہوتا ہے ۔

ین پی' ادنیٰ اشخاص نے جو معمولی صناعوں سے تھے مختلف شعبہ جات زندگی مثلاً سائنس ۔ تجارت ۔ علم و ادب اور فنون میں شہرت حاصل کی ۔ ایسے ہی اشخاص کے حالات سے جن کا اس کے قبل سرسری طور پر ذکر کیا جا چکا ہے ۔ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مفلسی تنگدستی اور محنت سے جو مصائب پیدا ہو جاتے ہیں وہ کسی صورت میں ناقابل عبور نہیں ہوتے ۔ بڑے بڑے ایجادات اور کارہائے نمایاں جن سے قوم کو زبردست قوت اور دولت حاصل ہوئی ان کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو بلاشبہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ایجادات کا بڑا حصہ معمولی انسانوں ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے جس کے سبب ہم ان کے احسانمند ہیں ۔ اگر شعبہ ایجادات سے ان کی کارگذاریوں کو خفیہ کر دیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ حقیقت میں قوم کے بنانے میں دیگر اشخاص کو بہت تھوڑا دخل رہا ہے

ین پی' موجدوں نے دنیا کی چند بڑی بڑی صنعتوں میں جان ڈالدی اور انہیں چالو کر دیا ۔ سوسائٹی اپنے اکثر بڑے بڑے احتیاجات عیش و آرام اور آسائشوں کی وجہ ان کی رہین منت ہے اور انہیں کی محنت ۔ اور قابلیت کا طفیل ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی ہر بات میں زیادہ آسان آرام دہ اور خوش کن ہوگئی ہے ۔ ہماری غذا ۔ لباس ۔ فرنیچر ۔ شیشے جن سے مکانوں میں روشنی داخل ہوتی اور ہم سردی سے محفوظ رہتے ہیں ۔ گیاس جس سے ہماری سڑکیں روشن و منور ہوتی ہیں ہمارے سمندری جہاز اور خشکی کی ریل بہت سے اوزار جن سے ہمارے ضروریات اور آرام و آسایش کی بے شمار چیزیں بنتی ہیں غرض یہ تمام باتیں بہت سے اشخاص اور دماغوں کی کوشش اور قابلیت کا نتیجہ ہیں ۔ انسانیت (MANKIND OF LAYES) اسی قسم کے ایجادات کی

وجہ خوش حال ہے اور ان سے انفرادی مرفعہ حالی اور قومی آسائش میں اضافہ ہونے سے انسان دن بدن ان کے فوائد سے مستفید ہو رہے ہیں۔

ین پی بخاری انجن کی ایجاد جس کو تمام گاؤں کا بادشاہ کہنا چاہیئے ہمارے زمانے کی ہے لیکن اس کا خیال صدیوں قبل پیدا ہو چکا تھا دیگر ایجادات وانکشافات کی طرح اس میں بھی بتدریج ترقی ہوئی ایک شخص کی محنت مشقت کے ثمرات جو اس وقت بالکل غیر مفید معلوم ہوتے تھے اس کے جانشینوں تک منتقل ہوئے جانشینوں نے ان ثمرات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی کوشش سے اس میں تھوڑا اضافہ کیا اس طرح اس تحقیق کی تکمیل کئی نسلوں تک جاری رہی چنانچہ ہیرو آف الگزنڈریا کے ذہن میں جو خیال پیدا ہوا وہ کبھی فراموش نہیں ہوا بلکہ تخم گندم کی طرح مصری ممی کے ہاتھ میں پوشیدہ رہا نشو نما پایا اور بالآخر عصر جدید کی سائنس کی پوری روشنی میں ظاہر ہوا۔ نظریہ اور اصول کی حد سے آگے بڑھنے اور میکانکوں کے ہاتھ میں عملی طور پر استعمال ہونے سے قبل بخاری انجن کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ یہ عجیب وغریب مشن صبر واستقلال .جان توڑ تحقیق مشکلات اور ان پر دلیرانہ مشقت سے غلبہ کی کیسی شاندار نظیر پیش کرتی ہے۔ انسان میں خود اعانتی کی جو قوت ہے یہ مشن اس کا ایک مجسم مظاہرہ ہے اس مشن کی تکمیل میں حسب ذیل افراد نے حصہ لیا :-

فوجی انجنیر ساوری .ڈارٹمٹ کا آہنگر نیوکومن (GLAZIER) کالے انجن کا ملازم پاٹر .سیول انجنیر اسٹیمن اور سب سے زیادہ (MATHEMATIONAL INSTRUMENT) بنانے والا جفاکش مستقل مزاج اور ان تھک جیمس واٹ بلا کا جفاکش آدمی تھا اس کی زندگی کے حالات نیز تجربہ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ زبردست قدرتی طاقت اور صلاحیت رکھنے والا شخص بڑے کام نہیں کرسکتا بلکہ وہ شخص کرسکتا ہے جو اپنی قوتوں کا بلا کی جفاکشی اور باقاعدہ ہنرمندی سے بہترین استعمال کرتا ہے۔ یہ ہنرمندی محض محنت .نن وہی اور تجربہ سے حاصل ہوتی ہے اس کے زمانہ کے بہت سے اشخاص اس سے زیادہ معلومات رکھتے تھے لیکن اپنے معلومات کو عملی جامہ پہنا کر مفید بنانے میں واٹ نے جس جفاکشی سے کام لیا ایسا کسی نے نہیں کیا سب سے زیادہ حقایق کی تلاش میں واٹ نہایت مستقل مزاج رہتا تھا (واٹ نے استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا) اس نے خود کو اس عملی شوق کا عادی بنایا جس پر دماغ کے جملہ اعلےٰ اور عملی صفات کا زیادہ انحصار ہوتا ہے مسٹر ایجورتھ کی رائے تھی کہ انسانوں میں دماغی قابلیت کے اعتبار سے جو اختلاف ہوا کرتا ہے اس کا انحصار افراد کی قوتوں کے زبردست تفاوت کی نسبت زیادہ تر شوق ودلچسپی کی ابتدائی تعلیم پر ہوتا ہے

ین ٔ پی ٔ بچپن ہی سے واٹ کو سائنس سے سابقہ پڑا کیونکہ وہ سائنٹیفک کھلونوں سے کھیلا کرتا تھا۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ سائنس گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ باپ کی بخاری کی دوکان میں جو (QUADRANTS) پڑے رہتے تھے وہ اس کی (OPTICS) اور علم ہیئت کی تعلیم کا باعث ہوئے اور خرابی صحت نے اس کو (PLYSISLOGY) کے اسرار کی چھان بین کی ترغیب دی اور جس وقت وہ تن تنہا شہر میں تفریح کیا کرتا تھا اس وقت اس کی توجہ علم نباتات اور تاریخ کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئی جن ایام میں وہ (MATHEMATICAL INSTRUMENT) بنانے کا کام کیا کرتا تھا اس کو ایک موسیقی آلہ بنانے کا آرڈر ملا اگرچیکہ اس کو موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے علم (HARMOMICS) کا مطالعہ کر کے کامیابی کے ساتھ آلہ تیار کیا۔ اسی طرح جب جامعہ گلاسگو کے نیوکومن کے تیار کردہ بخاری انجن کا چھوٹا نمونہ مرمت کی غرض سے واٹ کے ہاتھوں میں دیا گیا اس نے حرارت بخار اور (CONDENSOFIAN) کے متعلق اس وقت تک جو کچھ انکشافات ہو چکے تھے ان کا مطالعہ شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ میکانکس اور مشنوں کی ساخت کے علم کے مطالعہ میں بھی مصروف رہا۔ واٹ کی ان مصروفیتوں کے نتائج آخر کار (CONDENSING) بخاری انجن کی شکل میں نمودار ہوئے۔

ین ٔ پی ٔ دس سال تک واٹ نئی ایجادوں کی دھن میں لگا رہا۔ اس عرصہ میں اس کو مسرت کی کوئی توقع نہ تھی نیز اس کی حوصلہ افزائی کرنے والے احباب بہت کم ہے اس پر بھی وہ اپنا کام جاری رکھا اور (QUADRANTS) کی تیاری و فروخت۔ مختلف موسیقی آلات کی تیاری و درستی۔ تعمیری کام اور سڑکوں کی پیمایش۔ نہروں کی تعمیر کی نگرانی یا دیگر مفید کام کے ذریعہ وہ اپنے خاندان کی پرورش کرتا رہا آخر کار واٹ کو برمنگھم کے میاتھیو بولٹن جیسا شخص جو ایک باہنر۔ ہوشیار محنتی اور دوربین آدمی تھا اور جس نے (CONDEN-CING ENGINE) کو مروج کروانے کا بیڑا اٹھایا تھا ہاتھ بٹانے کے لئے مل گیا ان دونوں کو جو کامیابی نصیب ہوئی وہ اس وقت ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ین ٔ پی ٔ کئی ماہر موجدوں نے وقتاً فوقتاً بخاری انجن میں اپنی کوشش سے جدید قوت کا اضافہ کیا اور بہت سے اصلاحات کر کے اس کو قریب قریب تمام اغراض صنعت مثلاً سواری۔ کل۔ جہازرانی۔ باربرداری غلہ کی پسائی۔ طباعت کتب۔ سکہ سازی اور لوہے کو پیٹنے صاف اور درست کرنے کے قابل بنا دیا۔ مختصر یہ کہ اس کو ہر میکانکی کام کے جس کے لئے قوت درکار تھی قابل بنا دیا۔ انجن میں جو مفید اصلاحات

ہوئے ان میں کی ایک اصلاح (TREVITHICK) کی مجوزہ تھی جس کو آخرکار جارج اسٹیفن اور اس کے بیٹے نے ریلوے انجن کی شکل میں تکمیل کو پہنچایا ریلوے انجن کی ایجاد سے بہت سے اہم اور ضروری سماجی انقلابات رونما ہوئے اور انسانی تہذیب و ترقی کے لئے بلحاظ نتائج واٹ کی ایجاد کردہ (CONDENSING ENGINE) سے زیادہ اہم اور مفید ثابت ہوئے ۔

بن پی واٹ کی ایجاد کا پہلا عظیم الشان نتیجہ جس سے صناعوں کے قبضہ میں غیر محدود طاقت آگئی صنعت کپاس کی ایجاد تھی صنعت کی اس زبردست شاخ کی بنا کا تعلق سر رچرڈ آرکسا ریٹ سے ہے جس کی عملی قوت اور قابلیت اس کی میکانیکل قوت ایجاد سے زیادہ قابل تعریف تھی ۔ آرک ریٹ کی ذاتی قوت ایجاد پر بھی واٹ اور اسٹیفن کی طرح اعتراض کیا گیا ہے واٹ کو بخاری انجن اور اسٹیفن کو ریلوے انجن سے جو تعلق تھا آرک ریٹ کو پارچہ بافی کی مشن سے وہی تعلق تھا ۔ اگرچہ برمنگھم کے لیوس پال نے آرک ریٹ سے ۳۰ سال قبل بیلنوں کی پارچہ بافی کے طریقہ کو (PATENT) کرایا تھا لیکن اس کی تیار کردہ مشن اس قدر ناکمل ہے کہ ان سے اطمینان بخش طریقہ پر کام نہیں لیا جاسکتا تھا اور ایجاد عملی حیثیت سے ناکام ثابت ہوئی تھی مشن کے متعلق جو منتشر معلومات تھے واٹ نے انہیں فراہم کیا اور اپنی کوشش سے ان میں اضافہ کرکے مشن کو ایک جدید اور اصل کل کی شکل میں تیار کردیا ۔

بن پی موجدوں کے ذرایع پر صنعتی احتیاجات کا جب کبھی زبردست اثر پڑتا ہے تو اس وقت عموماً اکثر اشخاص کے دماغوں میں ایک ہی خیال سمایا رہتا ہے چنانچہ بخاری انجن سیفٹی لمپ تار برقی اور دیگر ایجادات کی حالت بجنسہ ایسی ہی ہے بہت سے ناقابل دماغ کسی ایجاد کی فکر میں مصروف رہتے ہیں لیکن آخرکار ایک قابل دماغ اور عملی قابلیت والا شخص میدان میں آکھڑا ہوتا اور ایجاد کو اپنے ہاتھ میں لیکر اصول کو اس پر منطبق کرتا ہے اور اس کی کوشش سے ایجاد مکمل ہوجاتی ہے جوں ہی ایجاد پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے تمام معمولی موجدوں کے حلقہ میں اس کا بڑا چرچا شروع ہوجاتا ہے وہ اس ایجاد کی دوڑ (شرط) میں اپنے آپ کو پیچھے پاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ واٹ اسٹیفنسن اور آرک ریٹ جیسے اشخاص کو کامیاب موجد ہونے سے جو شہرت اور حقوق حاصل ہوتے ہیں ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے

بن پی اکثر بڑے اور مشہور انگریز میکانکوں کی طرح رچرڈ آرک ریٹ بھی معمولی گھرانے کا آدمی تھا ۱۷۳۲ء میں بمقام پرسٹن پیدا ہوا اس کے والدین نہایت مفلس تھے اور ماں باپ کے تیرہ بچوں میں آرک ریٹ سب سے چھوٹا تھا ۔ اس نے کبھی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی بمشکل نوشت و خواند کرسکتا تھا بچپن میں وہ ایک اصلاح ساز کے ہاں کارآموز کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اصلاح سازی کا کام سیکھنے کے بعد اس نے بمقام بولٹن اپنی ذات پر

اصلاح سازی کا کام شروع کیا یہاں اس نے ایک چھوٹا حجرہ کرایہ پر لے رکھا تھا جس پر یہ الفاظ لکھے گئے تھے۔
"اصلاح ساز کے ہاں تشریف لائے۔ صرف ایک پنس میں اصلاح بنائی جاتی ہے" اس کا اثر یہ ہوا کہ دیگر اصلاح سازوں کے پاس بہت کم گاہک آنے لگے جس کی وجہ انہوں نے بھی آرک ریٹ کی طرح ایک پنس میں اصلاح بنانا شروع کیا اس پر آرک ریٹ جس نے اپنا کاروبار چلانے کا مصمم ارادہ کرچکا تھا یہ اعلان کر دیا کہ
"نصف پنس میں اصلاح بنائی جاتی ہے۔"

چند سال کے بعد اس نے اصلاح سازی کا کام ترک کر کے بال فروش بن گیا اس زمانہ میں (WIGS) پوشی کا رواج تھا اور (WIG) سازی اصلاح سازی کی ایک خاص شاخ سمجھی جاتی تھی آرک ریٹ (WIGS) کے لئے بال خریدنا شروع کیا لامبے بال حاصل کرنے کے خیال سے وہ لنکاشائر کے بال فروشی کے تمام میلوں میں جایا کرتا تھا جن میں عورتیں لامبے بال خریدنے کی غرض سے آیا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آرک ریٹ اس مقصد میں کامیاب رہا۔ وہ کبھی کبھی ایک قسم کے کیمیاوی خضاب کا بیوپار بھی کیا کرتا تھا لیکن اس کے اعلیٰ کردار کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے خورد نوش کے مصارف سے زاید آمدنی پیدا نہیں کی۔

بن پی (WIG) پوشی کے رواج میں تبدیلی ہونے سے (WIG) سازوں پر مصیبت آئی اور آرک ریٹ کو میکانکی قابلیت رکھنے کی وجہ آخر کار مشن ساز یا موجد بننا پڑا پارچہ بافی کی ایک مشن کی ایجاد کی بہت سی کوششیں کیگئیں اور آرک ریٹ نے دوسروں کے ساتھ اپنی چھوٹی کشتی کو بھی ایجاد کے سمندر میں ڈالنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس کے مماثل وگیا (SELF TAUGHT) اشخاص کی طرح آرک ریٹ اپنا فرصت کا وقت دائمی حرکت والی ایک مشن کی ایجاد میں صرف کرتا تھا اور اس مشن کی مدد سے پارچہ بافی کی مشن (SPINNING MECHINE) کا کام لینا آسان تھا۔ اس نے اپنے گذشتہ تجربات پر اس قدر جانفشانی سے عمل کیا کہ اس کو کاروبار کی پروا نہ رہی اس کا قلیل سرمایہ جاتا رہا اور وہ انتہائی مفلسی کا شکار ہوگیا۔ اس کی بیوی (کیونکہ اس وقت اس کی شادی ہو چکی تھی) بہت بے صبر واقع ہوئی تھی کیونکہ آرک ریٹ کی کوششوں کو وہ محض تضیع اوقات اور روپیہ کی بربادی سمجھتی تھی۔ اس نے خشم آلود ہو کر اپنے شوہر کے تیار کردہ نمونے اس توقع سے ضایع کردے کہ اس طرح تو بھی خاندان کے مصائب اور مفلسی کا ازالہ ہو جائیگا۔ آرک ریٹ ایک پرجوش اور ضدی آدمی تھا۔ بیوی کے اس طرز عمل نے اس کے نسے اشتعال طبع کا کام دیا اور اس لئے فوراً بیوی سے علیحدگی اختیار کی۔

بن پی دوران سفر میں آرک ریٹ کی (KAY) نامی ایک شخص سے ملاقات ہوی یہ شخص وارنگٹن کا

ایک گھڑی ساز تھا اس نے آرک ریٹ کو اس کی دامی حرکت والی مشن کے بعض اجزا کی ساخت میں مدد دی۔ یاد رکھا جاتا ہے کہ (KAY) نے آرک ریٹ کو بیلنوں کی پارچہ بافی کا اصول بتلایا۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس اصول کا خیال پہلے پہل آرک ریٹ کے دل میں اس وقت پیدا ہوا جس وقت اس کو ایک سرخ آہنی ٹکڑے کو آہنی بیلنوں میں سے گزر کر لمبا ہوتا ہوا دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس واقعہ کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں آرک ریٹ کے دماغ میں یہ خیال مستحکم ہوگیا چنانچہ اس نے جس تدبیر سے اس کی تکمیل ہوسکتی تھی اس کی کھوج شروع کردی اور (KAY) کو اس مسئلہ میں کوئی دخل نہ تھا۔ آرک ریٹ نے اپنا بال فراہمی کا کاروبار ترک کر کے اپنی مشن کی تکمیل کے لئے خود کو وقف کر دیا۔ اور اس کے ہدایات کے بموجب جب (KAY) نے اس مشن کا ایک نمونہ تیار کیا تو آرک ریٹ نے اس کو پرسٹن کی فری گرامر اسکول کے کمرہ میں رکھا۔ شہر کا قایم مقام ہونے کی وجہ اس نے اس بحث طلب انتخاب میں رائے دی جس میں جنرل برگوئن کو ناکامی ہوئی تھی۔ آرک ریٹ اسقدر تنگدست تھا اور اس کے کپڑے اسقدر پھٹے پرانے تھے کہ کئی اشخاص نے چندہ کر کے اسقدر روپیہ جمع کیا کہ وہ آرک ریٹ کے لئے (Poll Room) میں جانے کی حیثیت کے موافق لباس فراہم کرنے میں کافی ہوا۔ ایک ایسے شہر میں جہاں بہت سے کاریگر دستی محنت کے ذریعہ معاش پیدا کرتے تھے آرک ریٹ کی مشن کی نمایش خطرناک چیز ثابت ہوئی۔ مدرسہ کے باہر وقتاً فوقتاً بدشگون شکایات سنی جاتی تھیں (KAY) کو اس کی (FLY SHUDLLE) کی ایجاد کی وجہ مجمع نے گھیر لیا جس کی وجہ وہ لنکا شائر چلے جانے پر مجبور ہوگیا نیز غریب ہارگریوس جس کے (SPINNING JENNY) کو بلاکبرن کے ایک مجمع نے اس واقعہ کے چند روز قبل پارہ پارہ کر دیا ان دونوں کا جو کچھ حشر ہوا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے آرک ریٹ نے یہ ہوشیاری کی [illegible] کو ایک غیر خطرناک یعنی محفوظ مقام پر منتقل کر دینے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ اپنی مشن کو لیکر ناٹنگھم چلا گیا جہاں اس نے مقامی ساہوکاران سے مالی امداد کی درخواست کی اور مسٹر ریٹ نے اس کو اس شرط کے ساتھ پیشگی روپیہ دینے رضامندی ظاہر کی کہ ایجاد کے منافع میں اس کو حصہ دیا جائے جس مدت میں مشن کی تکمیل کی توقع تھی اس مدت میں تکمیل نہ ہونے سے ساہوکاروں نے آرک ریٹ کو مشورہ دیا کہ وہ مسٹر اسٹرٹ اینڈ نیڈ سے درخواست کرے مسٹر اسٹرٹ پاتابہ بافی کی مشن کا موجد تھا اور اس کو اس مشن کا حق پیٹنٹ بھی حاصل تھا۔ اسٹرٹ نے آرک ریٹ کی مجوزہ ایجاد کی بلحاظ اس کی خوبیوں کے بڑی قدر کی اور آرک ریٹ کے ساتھ جس کے لئے قسمت آزمائی کی راہ اب بالکل صاف ہوگئی تھی شریک ہوگیا ناٹنگھم کے گھڑی ساز جے آرک ریٹ کے نام سے حق پیٹنٹ حاصل کیا گیا اور یہ ایک قابل یادگار واقعہ ہے کہ یہ پیٹنٹ سنہ ۱۷۶۹ء میں حاصل کیا گیا یعنے اسی سال جبکہ

واٹ نے اپنی بخاری انجن کا حق پیٹنٹ حاصل کیا تھا۔ ناٹنگھم میں پہلے ایک کپاس کی گرنی قائم کی گئی جو گھوڑوں کے ذریعہ چلتی تھی اس کے چند روز بعد ہی ڈربی شائر میں بمقام کرامفورڈ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر دوسری گرنی تیار کی گئی جو پانی سے گھومنے والے پہیے سے چلتی تھی اور اسی سبب سے پارچہ بافی کی مشن کو (WATER FRUNE) کہا جانے لگا۔

ین پی آرک ریٹ کی کوششوں کا یہ پیش خیمہ تھا مشن کے دیگر ضروری اجزا کی تکمیل ہنوز باقی تھی اس میں ارک ریٹ ہمیشہ ردوبدل اور اصلاحات کرتا رہتا تھا حتیٰ کہ وہ قابل استعمال اور بےحد مفید ہوگئی لیکن کامیابی محض طویل اور متحمل کوشش سے حاصل ہوی کیونکہ چند سال تک اس کام میں آرک ریٹ کو پست ہمتی ہوتی تھی نیز اس کو کوئی فایدہ بھی نہ تھا کثیر سرمایہ اس کے نذر ہوجاتا تھا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا جب ترقی کے آثار نظر آنے لگے تو جس طرح (CORNISH) کے کان کن بولٹن اور واٹ پر ان کے بخاری انجن کا منافع لوٹ لینے کی غرض سے ٹوٹ پڑے تھے لنکا شائر کے صناع بھی جدید مشن کو توڑ دینے کے خیال سے آرک ریٹ پر حملہ آور ہوے آرک ریٹ کو کاریگروں کا دشمن ٹھیرایا گیا اور کارسے میں اس نے جو گرنی تیار کی تھی اس کو ایک مجمع نے زبردست پولیس اور فوج کی موجودگی میں برباد کردیا۔ اگرچیکہ آرک ریٹ کے تیار کردہ اشیا بازار میں سب سے بہتر تھے اور لوگوں کو اس کا اعتراف بھی تھا لیکن لنکا شائر والوں نے انہیں خریدنے سے انکار کیا۔ نیز انہوں نے آرک ریٹ کو اپنی مشنوں کے استعمال کا حق پیٹنٹ دینے سے انکار کیا اور عدالت میں سخت ضرر پہنچانے کی غرض سے متفق ہوگئے آرک ریٹ کا حق پیٹنٹ ضایع ہونے سے راست باز اشخاص کو سخت ناگوار ہوا مقدمہ ختم ہونے کے بعد جس وقت آرک ریٹ کا اُس ہوٹل پر سے جہاں اس کے مخالفین ٹھہرے ہوے تھے گذر ہوا تو ایک نے چلا کر کہا کہ "ہم نے پرانے اصلاح ساز کو شکست دیدی"۔ یہ سنکر آرک ریٹ نے جواب دیا کہ "کوئی پروا نہیں میرے پاس ابھی ایک استرا باقی ہے جو تم سب کی اصلاح کرے گا" اس لئے اسکاٹ لینڈ میں لنکا شائر۔ ڈربی شائر اور نیو لنیارک مقامات پر جدید گرنیاں قائم کئے مسٹر اسٹرٹ کی شرکت ختم ہونے پر کرامفورڈ کی گرنیاں بھی اس کے قبضہ میں آگئیں اور اس کی گرنیوں کے تیار شدہ اشیا کی خوبی کا یہ حال تھا کہ نہایت قلیل عرصہ میں اس کی کاروبار پر پورا قابو حاصل ہوگیا اس نے قیمتیں مقرر کئے اور دیگر کپاس کاتنے والوں کی نگرانی بھی کی۔

ین پی آرک ریٹ زبردست کردار۔ استوار دلاوری اور زود فہمی والا آدمی تھا اور اس میں بلا کی کاروباری صلاحیت موجود تھی۔ ایک مرتبہ اس کا وقت سخت اور مسلسل محنت میں صرف ہوا کیونکہ اس کو اپنے بے شمار

کارخانوں کا انتظام کرنا پڑا بعض اوقات وہ صبح کے چار بجے سے شام کے نو بجے تک کام کرتا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں اس نے انگریزی قواعد پڑھنا شروع کیا اور کتابت اور علم ہجا میں ترقی کرنے لگا ہر مزاحمت پر غالب آنے کے بعد اس کو اپنی کوشش کا ثمرہ ملا جس سے اس کو اطمینان حاصل ہوا۔ اس کی پہلی مشن کی ساخت کے ۱۰ سال بعد ڈربی شائر میں اس کو اسقدر اعزاز حاصل ہوگیا کہ وہ شہر کا (HIGH SHERIFF) بنا دیا گیا اور چند روز بعد جارج سوم نے اس کو (KNIGHT) کا خطاب عطا کیا ۱۷۹۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ خواہ مفید ہو یا مضر آرک ریٹ انگلستان کے موجودہ فیاکٹری سسٹم کا بانی تھا۔ فیاکٹری سسٹم بلا شبہ افراد اور قوم ہر دو کے حق میں توقیر دولت کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔

بن' پی' برطانوی صنعت کی دیگر بڑی شاخوں میں جفاکش اور محنتی اشخاص کی ایسی ہی مثالیں ملتی ہیں جو اُن کے ہمسایوں کے لئے باعث منفعت اور قوم کے حق میں طاقت اور دولت کا ذریعہ تھے۔ ذیل کے افراد کا شمار اسی قسم کے اشخاص میں کیا جا سکتا ہے :-

بلپر کے اسٹرٹس۔ گلاسگو کے ٹینٹنس۔ لیڈس کے مارشلس اور گاٹس پیلیس ایلطش ورتھس۔ برلیس فیلڈنس۔ ایشٹنس۔ ہیوڈس اور لنکاشائر کے اینس ورتھس۔

انہی کی اولاد میں سے بعض اشخاص انگلستان کی سیاسی تاریخ میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ جنوبی لنکاشائر کے پیلیس بھی ایسے ہی مشہور و معروف تھے۔

بن' پی' خاندان پیل کا بانی جو گذشتہ صدی کے وسط میں گذرا ہے ایک معمولی کسان تھا اس کا ہول ہاؤز نامی ایک کھیت بلاک برن کے قریب واقع تھا جہاں سے بعد میں وہ مچھلہاروں کے کوچہ کے ایک مکان میں منتقل ہوگیا رابرٹ پیل کے ذمہ کئی لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش تھی لیکن بلاک برن کی اراضی ذرخیز نہ ہونے سے اس کے لئے زراعت میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ بلاک برن ایک زمانہ تک کسی خانگی دستکاری کا مرکز تھا جس کی صنعت بلاک برن گریس کے نام سے موسوم تھی اور جس میں شہر اور قرب و جوار کے بنے ہوئے سن کے بانے اور سوتی تانے استعمال کئے جاتے تھے۔ کارخانوں کی ابتدا سے قبل کنبے والے محنتی کسانوں میں یہ رواج تھا کہ کھیتی باڑی سے جو کچھ وقت بچتا اس کو وہ پارچہ بافی کے کام میں صرف کیا کرتے تھے چنانچہ رابرٹ پیل نے چھینٹ سازی کی گھریلو تجارت شروع کی۔ دیانت داری سے عمدہ مال تیار کرتا تھا علاوہ اس کے کفایت شعار اور جفاکش تھا اس لئے اس کی تجارت کو فروغ ہوا۔ وہ بڑے بڑے کام اپنے ذمہ لینے لگا اور ان افراد میں سے تھا جنہوں نے پہلے پہل نئی ایجاد شدہ اون

صاف کرنے کی بیلن استعمال کی۔

ین، پی، رابرٹ پیل کی توجہ خاص طور پر چھینٹ کی چھپائی کے جانب راغب ہوئی جس کی حیثیت اس وقت ایک غیر معروف فن کی تھی۔ مشن کی چھپوائی کو رواج دینے کی غرض سے ان سے کچھ عرصہ تک تجربات کئے۔ یہ تجربات پوشیدہ طور پر خود اس کے مکان میں ہوا کرتے تھے اور اس کے خاندان کی ایک عورت پارچہ کو استری کیا کرتی تھی۔ پیل جیسے خاندانوں میں اس وقت کھانے کے لئے جست کے ظروف استعمال کئے جاتے تھے ایک رکابی پر ایک نقش بنانے سے اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس سے ایک الٹا نقش لیا جاسکتا ہے اور اس کو رنگ لگا کر چھینٹ چھاپ سکتے ہیں۔ کھیت کے کنارے ایک جھونپڑی میں ایک عورت رہتی تھی جس کے پاس استری کی ایک مشن تھی۔ اس کی جھونپڑی میں جا کر پیل نے رکابی کے نقش کردہ حصہ پر رنگ جمایا اور اس پر کچھ چھینٹ رکھکر مشن میں رکھ دیا جس سے چھینٹ پر خاص نقش اتر آیا۔ کہا جاتا ہے کہ چھینٹ کی بیلن کے ذریعہ چھپوائی کا جو طریقہ رائج ہوا اس کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ رابرٹ پیل نے اپنے تجربہ کو مکمل کیا اور اس نے پہلے (PARSLEY) کے ایک پتہ پر پہلا نمونہ تیار کیا اور یہی وجہ ہے کہ آج تک وہ بلاکبرن کے قرب وجوار میں "پارسلی پیل" کے نام سے مشہور ہے۔ کل کے ذریعہ چھینٹ کی چھپائی کا کام پیل کے ایک فرزند کے ہاتھوں جو مسرز پیل اینڈ کو نامی کارخانہ کا صدر تھا پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ اس کامیابی سے اس کے حوصلے بڑھ گئے اور رابرٹ پیل نے کاشتکاری ترک کر کے بلاکبرن سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر قصبہ بروک لیٹو میں سکونت اختیار کی اور خود کو طباعت کے کام کے لئے وقف کر دیا۔ یہاں اس نے اُس کے بیٹوں کی مدد سے جو اس کی طرح جفاکش تھے کئی سال تک کامیابی کے ساتھ یہ کاروبار چلایا اور جس طرح بچے پڑھتے پڑھتے عنفوان شباب کو پہونچتے ہیں اس کا کاروبار مختلف کارخانوں کی شکل میں ترقی کر گیا۔ ان میں سے ہر کارخانہ صنعتی چہل پہل کا مرکز اور عوام الناس کی کثیر جماعتوں کے لئے روزی کمانے کا ذریعہ بن گیا۔

ین، پی، سو رابرٹ پیل کے کردار کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ہستی یقیناً ایک غیر معمولی ہستی تھی اور وہ ہوشیار۔ تیز فہم اور دوربین بھی تھا۔ اس کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور جو لوگ اس سے واقف تھے وہ بھی گذر چکے۔ اس کا بیٹا سر رابرٹ اپنے باپ کے متعلق اس طرح لکھتا ہے کہ "میرا باپ حقیقت میں ہمارے خاندان کا اصل بانی ہوگا اور قومی نقطہ نظر سے اس نے تجارتی دولت کی اہمیت کی بیحد قدر کی اور کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ تجارت میں انفرادی نفع کو قومی مفاد کے مقابلہ میں بہت کم اہمیت حاصل ہے۔"

ین، پی، سر رابرٹ پیل کو جو پہلا بیارونٹ اور اس نام کا دوسرا صناع تھا اس کے باپ کی صنعت اور

کاروبار ترکہ میں ملا ابتدا میں اس کی حالت ایک معمولی کاریگر سے کچھ بری ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کا باپ گو آیندہ مرفعہ حالی کی اساس قایم کر رہا تھا تاہم اس کو بھی ناکافی سرمایہ کی وجہ جو مشکلات رونما ہو گئے تھے ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جس وقت رابرٹ کی عمر صرف بیس سال کی تھی اس نے سوتی پارچہ کی چھپائی کا کاروبار آغاز کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا جس کو وہ اس وقت تک اپنے باپ سے سیکھ چکا تھا۔ اس کا چچا جیمس ہاورتھ اور ولیم ایٹس ساکن بلاکبرن اس کے کاروبار میں شریک ہوئے اور سب نے جو سرمایہ جمع کیا اس کی مقدار صرف پانچ سو پونڈ تھی اس سرمایہ کا بڑا حصہ ولیم ایٹس کا فراہم کردہ تھا۔ ولیم ایٹس کا باپ بلاکبرن کا ایک (HOUSE HOLDER) تھا جہاں اس کو کافی شہرت حاصل تھی اور لوگ بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے اپنے کاروبار کے ذریعہ روپیہ پس انداز کر کے اس نے سوتی پارچہ کی چھپوائی کی سودمند تجارت کو ترقی دینے کے خیال سے جو اس وقت حالت طفولیت میں تھی اپنے بیٹے کو کافی رقم دینے کا ارادہ کیا۔ رابرٹ پیل اگرچہ کم عمر تھا تجارت کا عملی تجربہ حاصل کر لیا اس کے متعلق صحیح کہا گیا ہے کہ "اگرچہ وہ کم عمر تھا لیکن ایک تجربہ کار دماغ رکھتا تھا" شہر بیوری کے قریب جو اس وقت غیر مشہور تھا اور جہاں کا کاروبار ایک زمانہ سے (THE GROUND) کے نام سے مشہور تھا یہاں کی ایک تباہ شدہ غلہ کی گرنی کو معہ اس کی ملحقہ اراضی کے رابرٹ نے تھوڑی رقم کے معاوضہ میں خریدی اور چند چوبی سائبان نصب کر کے ۱۷۷۰ء میں نہایت ادنی پیمانہ پر سوتی پارچہ کی چھپوائی کا کاروبار شروع کیا چند سال کے بعد اس میں سوت بافی کا کام بھی ہونے لگا۔ شرکا جس کفایت شعاری سے زندگی بسر کیا کرتے تھے اس کا اندازہ ان کی ابتدائی زندگی کے ذیل کے واقعہ سے چل سکتا ہے۔ ولیم ایٹس معہ اپنے اہل وعیال کے نہایت سادہ طریقہ پر زندگی بسر کیا کرتا تھا اور پیل پر جو تن تنہا تھا احسان جتانے کے لئے اس نے اس کو اپنے پاس قیام کرنے کی اجازت دی پیل اپنے قیام وطعام کے معاوضہ میں ہفتہ وار جو رقم دیا کرتا تھا وہ صرف ۸ شلنگ تھی لیکن ایٹس نے پیل کو مجبور کیا کہ ہفتہ وار رقم میں ایک شلنگ کا اضافہ کر دیا جائے اس پر پیل کو پہلے پہل پس وپیش ہوا اور شرکا میں ناموافقت ہو گئی لیکن آخر میں اس بات پر صلح ہو گئی کہ پیل ہر ہفتہ ۶ پنس پیشگی ادا کیا کرے۔ ولیم ایٹس کی پہلی اولاد الن نامی ایک لڑکی تھی وہ بہت جلد نوجوان پیل کی چاہیتی بنگئی تمام دن سخت محنت کر کے "دی گرونڈ" سے واپس ہونے کے بعد چھوٹی لڑکی کو اپنے گھٹنے پر بٹھا کر کہا کرتا تھا "خوبصورت چھوٹی نلی کیا تو میری بیوی بنے گی" اس سوال پر نلی جس طرح عموماً بچے کیا کرتے ہیں خوشی سے جواب دیا کرتی تھی کہ "ہاں میں تمہاری بیوی بنونگی" جس پر پیل کہا کہ "نلی میں تمہارے سوا اور کسی سے شادی نہ کروں گا" اور حقیقت میں رابرٹ نے نلی سن بلوغ کو پہنچنے تک انتظار کیا جب خوبصورت لڑکی سن بلوغ کو پہونچی تو

رابرٹ کا اس سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ ہوگیا اور دس سال بعد جو کاروباری گہری دلچسپی اور دن بدن بڑھتی ہوئی مرفہ حالی میں بسر ہوے رابرٹ پیل نے الن ایٹس سے شادی کی جس کا سن اس وقت سترہ سال کا تھا۔ اس طرح خوبصورت نلی جس کو اس کی ماں کا کرایہ دار اور باپ کا شریک کار اپنے گھٹنوں پر کھلایا کرتا تھا مسز پیل اور آیندہ چلکر انگلستان کے وزیر اعظم کی والدہ لیڈی پیل بنی۔ لیڈی پیل ایک معزز اور حسین عورت تھی اس کی دماغی قوت غیر معمولی تھی اور ہر شدید ضرورت کے موقع پر وہ اپنے شوہر کی شریک و مشیر رہا کرتی تھی۔ شادی کے بعد کئی سال تک اس نے اپنے شوہر کے منشی کی حیثیت سے کام کیا اور اس کے کاروباری خط و کتابت کا بہت سارا کام خود کیا کرتی تھی کیونکہ مسٹر پیل کی طبیعت لاپرواہ واقع ہوئی تھی اور خط بھی صاف نہ تھا۔ شوہر کو بیرونٹ کا خطاب ملکر صرف تین سال کا عرصہ ہوا تھا کہ ۱۸۰۳ء میں لیڈی پیل نے جہان فانی سے کوچ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لندن کی وضعدارانہ زندگی جو اس کی خانگی یا گھر کی زندگی سے بالکل جداگانہ تھی اس کی صحت کے لئے مضر ثابت ہوی۔ ضعیف ایٹس کہا کرتا تھا کہ "اگر رابرٹ ہماری نلی سے شادی نہ کرتا تو وہ اب تک زندہ رہتی"

ین پی، ایٹس پیل کمپنی کا زمانہ کامل خوشحالی میں گذرا سر رابرٹ پیل کارخانہ کی روح رواں بنا ہوا تھا۔ اس کی جان توڑ محنت و جفاکشی کے ساتھ اس میں وہ غیر معمولی عملی قابلیت اور اعلیٰ درجے کے تجارتی معلومات موجود تھے جن کی اکثر سوتی پارچہ بافوں میں بڑی کمی تھی اس کی دماغی اور جسمانی قوت بہت زبردست تھی اور وہ بلا وقفہ کام کیا کرتا تھا مختصر یہ کہ رابرٹ پیل کو سوتی پارچہ کی چھپوائی سے وہی نسبت تھی جو آرک ریٹ کو سوت بافی سے تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے کارخانہ کی تیار شدہ اشیا کی عمدگی کی وجہ بازار میں ان کی طلب بڑھ گئی اور لنکا شائر میں کارخانہ کی خاصی شہرت ہوگئی بیوپاری کو نفع پہنچانے کے علاوہ دونوں نے اپنی شرکت میں قرب و جوار میں وسیع پیمانہ پر کاروبار شروع کیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ جہاں انہوں نے اپنے دستکاریوں کی خوبی کو انتہائے کمال تک پہنچانے کی کوشش کی اس کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے آرام اور مرفہ حالی کے لئے ہر ممکنہ کوشش میں کوئی کسر باقی نہ رکھی دیگر ایام میں بھی وہ اپنے مزدوروں کے لئے اجرت کا کام مہیا کرنیکی سعی کیا کرتے تھے۔ (باقی)

مصحفی کا تذکرۂ ہندی

(از عمر یافعی ــ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

حاتم

(الف) حاتم شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم ولد شیخ فتح الدین کہ بقولش تاریخ تولدش حرف "ظہور" باشد، از خاک پاک شاہ جہاں آباد است۔ ہشتاد و سہ سال عمر دارد۔ در ایام جوانی سپاہی پیشہ بودہ و ہم شعر ریختہ بروئے کار آوردہ در اوقات چندے رمز تخلص میکرد۔ ازبسکہ ایں خرابہ از قدر داناں معمور بود۔ امیرزادہ ہائے والا تبار و نوئینان ذوی الاقتدار اوراپیش از پیش بہ تواضع و تعظیم پیش آمدہ بر مسند برابر خود جامید ادند و متاسب حال خود ہا ہر یکے ازو وا فرمیگرفتند۔ مرد بزرگ و جہاں دیدہ و فرسودہ روزگار ہست۔ عمر ہا بعیش و طرب بودہ و سالہا بہ ناز و نعمت پرورش یافتہ حالا چوں کس نماند بہ سبب مصلحت وقت و ہوائے زمانہ را مختلف دیدہ۔ متوکلی و خانہ نشینی اختیار کردہ۔ از ہندی گویان قدیم ایں دیار یادگار است و نام نامیش از بس شہرت بسیار مذکور زبان صغار و کبار۔ طرز اولیش در شعر بطور مضمون و ناجی و آبرو وغیرہ شعرائے ایہام بند است۔ و طرز آخریش باندازۂ تازہ گویان حال۔ بعض اشخاص نزدیک و دور شاہ مذکور را بہ سبب طوالت عمر پیش خود از رفتگاں شمردہ۔ حاتم ثانی قرار مید ہند لہذا در ین آخر عمر دیوانے کہ در زبان ریختہ گویان حال ترتیب دادہ نامش دیوان زادہ گذاشتہ تا رفع اشتباہ آنہا گردد و اختلاف زبان ریختہ سابق و حال و دعوئی مبہم آں قوم را مقرون بصدق نگرداند۔ در فارسی ہم دیوان مختصری بقدر چہار جز بطور متاخرین بیاض فرمودہ۔ در یک ہزار و یکصد و نود و ہفت در ماہ مبارک رمضان رحلت کردہ۔ فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ۔

حاتم آں پیشوائے اہل سخن　　کہ قدم در مقام فقر فشرد
صرف عمرش قضا بہ کزلک حک　　چونکہ از صفحۂ زمانہ سترد
سال تاریخش از خرد جستم　　ناگہ ایں مصرعہ بگوشم خورد
کہ بگو مصحفی چو پرسندت　　آہ صد حیف شاہ حاتم مرد

این چند شعر از انتخاب زادہ آں بزرگوار است"۔

(ب) شیخ ظہور الدین حاتم کہ شاہ حاتم گفتہ می شد۔ مولدش شاہجہاں آباد است تاریخ تولدش بقولش حرف "ظہور" می برآید۔ ہمیشہ عمدہ معاش بودہ واوقات را بخوبی گذرانیدہ مرد سپاہی پیشہ از ہندوستان زایان قدیم بودہ روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرام گاہ دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بناے شعر ہندی را بایہام گوئی نہادہ۔ داد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ میدادیم غرضکہ از شعراے متقدمین است در ایامیکہ فقیر در شاہجہاں آباد۔ طرح مشاعرہ انداختہ اکثر بعد مغرب در مشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ زمانۂ سابق خود را می ستودہ الحال کہ در دورۂ ما زبان ریختہ بسیار پاکیزگی و عمدگی رسیدہ مشار الیہ ہم مرتبہ سخن تازہ گویان فہمیدہ دیوان قدیم خود را از طاق دل افگندہ۔ دیوان جدید بزبان ریختہ گویان حال ترتیب دادہ و دیوان زادہ نامش گذاشتہ تا بسبب طوالت عمر بعض مردم دور دست را کہ اشتباہ حاتم دوم می افتاد برطرف کردہ و بحور اشعار را ہم جدا جدا از سرخی بر سر ہر غزل نوشتہ و ایں ایجاد اوست و از ینکہ در درازی عمر و قدامت شعر از ہمہ پیشتر است نغمہ سنجان حال وضیع و شریف اورا اوستاد مسلم الثبوت می دانند بلکہ او خود را اسامی کسانیکہ از اول تا آخر استفادۂ شعر از و کردہ اند بر دو سہ ورق بطریق فہرست بر پشت سرلوح دیوان خود نوشتہ چسپانیدہ تا معلوم کسان گردد کہ حاتم ایں قدر شاگرد داشت و در انجملہ اسم مرزا رفیع سودا ہم کہ بہ اتفاق ہمہ یکے از سر آمد شعراے ہندی گویان این دیار گذشتہ مسطور است والحق کہ دروغ نیست قیاس اُستادیش ازیں جا باید کرد۔

دیگر بنا بر آں میر محمد تقی میر کہ شاعر یست جاد و کار اکثر اورا در مشاعرہ ہا بطریق ظرافت داہ الشعرا میگفت چوں دو جزو مسودہ شعر فارسی ہم بطور رصائب داشت لہذا پیش ازیں در تذکرۂ فارسی احوال او معہ تاریخ رحلتش صورت تحریر یافتہ عمر قریب بصد رسیدہ بود دو سہ سال است کہ در شاہ جہاں آباد ودیعت حیات سپردہ خدایش بیامرزد و از وست۔

مضمون خط کو دیکھ ترے ہم بہت ڈرے — جتنے مسودے تھے رہے طاق پر دھرے

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر — سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں — دور ہو پہلو سے صحبت کے مرے قابل نہیں

خوشحال اُن کا جن کو ہوی رخصتِ چمن — ہم جھانک جھانک رخنۂ دیوار رہ گئے

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
بیکسی اور داغ اے حاتم کیا قیامت کرے جو دولت ہو

مجھے تو دیکھ کر کیا تک رہا ہے ترے ہاتھوں کلیجہ پک رہا ہے
خدا کے واسطے اُس سے نہ بولو نشے کی لہر میں کچھ بک رہا ہے

درد

(الف) خواجہ میر درد خلف شاہ ناصر کہ سلسلہ ایشاں نقشبندیہ است و آں را مقابل نقشبندیہ مجددیہ نقشبندیہ محمدیہ ایجاد کردہ نام گذاشتند در ایام جوانی سپاہی پیشہ بود۔ ازاں باز کہ پا بر بوریائے درویشی نہادہ ہمیشہ در کسب سلوک و فقر و فنا و توحید و تصوف کوشیدہ و چشم از غیر حق پوشیدہ در زبان ریختہ بعد ایہام گویان خیلے داد فصاحت دادہ چنانچہ دیوان مختصرے ازو یادگار است و مقبول نظر فصحائے روزگار۔ چوں بہ سبب فضل و کمالے کہ داشت در راہ پُرخار فارسی ہم بزعم دیگر ریختہ گویان قدم نہادہ از تصنیف اوست۔ علم الکتاب و واردات و نالۂ درد، در جواب نالۂ عندلیب شاہ ناصر، و دیوان فارسی مختصر معہ رباعیات تا دریں بزم دل افروز جانشین پوست تخت زندگانی بود اکثر شاگرداں و مریداں و معتقدان از ذات با برکاتش استفادہا می گرفتند و ادراک صحبت کیمیا خاصیت او را بسیار غنیمت می شمردند۔ فقیر ہم گاہ گاہے بغیر ضانہ صحبتش را دریافتہ است الحق کہ دریں پیری شخصے بود باغ و بہار و وجودے بود از بزرگان زمانہ یادگار۔ چند سال است و جائے خود را بہ برادر خود محمد میر اثر تخلص گذاشتہ رفتہ از دوست"

(ب) خواجہ میر درد تخلص خلف الصدق شاہ گلشن مصنف کتاب نالۂ عندلیب در عہد فردوس آرام گاہ سپاہی پیشہ بود آخر آخر ترک روزگار کردہ بر سجادہ درویشی نشستہ در علم و فضل یگانۂ روزگار است گاہے در تمامی عمر از شاہجہاں آباد با وجود چندیں تفرقہ کہ عالمی را از دیار ہیونشاں آوارۂ اطراف و جوانب ساختہ پائے بیروں نگذاشتہ چوں در علم موسیقی ہم مہارت تمام داشت اکثرے از اوستادان ایں فن بوسیلت بعیت حاضر مجلس او گشتند۔ اگرچہ سلسلۂ آں بزرگ نقشبندیہ ہست اما واردات درد کہ نسخہ ایست مختصر از تصنیف او برائے ہدایت مریدان خویش حرمت غنا را بطورے کہ ہست گذاشتہ و خود کہ گاہ گاہے مرتکب ایں امر شد گناہ آں

برذمہ خود گرفتہ طلب آمرزش از ایزد بے ہمال خواستہ تامرغ روحش زمزمہ سنج باغ ہستی بود در ہر ماہ بتاریخ دوم بر مزار پدر خود مجلس غنا ترتیب میداد آنروز ہمہ خورد و بزرگ شہر حاضر می شدند مغنیان چابک دست وبین نوازان بے کاسہ ست داد قانون نوازی ونغمہ سازی می دادند بعد سہ پاس روز رفتہ مجالس برخواست می شد۔ غرض کہ جامع جمع فنون غریبہ بود در فقر و توکل واستغنا نظیر نداشت۔ شمۂ بیان بے پروائیش ایں کہ روزے حضرت ظل سبحانی برائے زیارت ایشاں آمدہ بودند بعد نشستن در مجلس عذر درد بہ میان آوردہ اندکے پارا دراز ساختند مشار الیہ از مشاہدۂ ایں حالت متعرض شدہ وایں قاعدہ را خلاف معمول دانستہ خود ہم بطرف بادشاہ پارا دراز ساخت علم الکتاب از تصنیف اوست بر صفحہ روزگار یادگار است وشعر ہندیش از بس شہرت بسیار مشہور ہر دیار اگرچہ شعر فارسی ہم دارد فقیر تا کہ در شاہ جہاں آباد بود بعد سالے گاہے پیش آں بزرگ بے غرضانہ میرفت یک سالست کہ درد مہجوریش شفا یافتہ وبشافی علی الاطلاق واصل گشتہ از کلام معجز نظام اوست۔

کہیں ہوا ہی سوال وجواب آنکھوں میں — یہ بے سبب نہیں ہم سے حجاب آنکھوں میں
سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں — زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

کچھ کام نہیں وہ بت خود کام کہیں ہو — پر اس دل بے تاب کو آرام کہیں ہو

روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یہاں مجھے — اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
اے گل تو رخت باندھ اٹھاوں میں آشیاں — گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے

تجھی کو جو یہاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
تو ہی نہ اگر ملا کرے گا — عاشق پھر جی کے کیا کرے گا

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں — جان سے اپنی جو کوئی کہ گذر جاتے ہیں
موت کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے — مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کے دل عالم سے | درد ہم اپنی عوض چھوڑ اثر جاتے ہیں

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں | ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں
یہ رات شمع سے کہتا تھا درد پروانہ | کہ حال دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں

جی میں ہے سیر عدم کیجئے گا | یک بیک خلق سے رم کیجئے گا
تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا | میں چاہوں غیر کو سو یہ مجھ سے نہ ہو سکا
گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر | میں نے تو درگذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا | بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

نہ ملیں گے اگر کہے گا تو | تیری خاطر ہمیں مقدم ہے
درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم | وہی رونا ہے اور وہی غم ہے
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا | تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
نظر میرے دل پر پڑی درد کس کی | جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

درد درویش ہوں مری تعظیم | لوگ کرتے ہیں کہہ کے یا اللہ

سوز

(الف)۔ میر سوز شاعر ریختہ گو است این رباعی بطریق ندرت از وست"

(ب)۔ محمد میر سوز تخلص کہ بہ طرز خود اُستاد است و وضع خواندن شعرش دیگر یا کم یاد گویند اول میر تخلص میکرد چوں درآں ایام میر محمد تقی ہم شہرت بمیر داشت لہذا ازاں درگذشتہ بجائے میر سوز قرار داده کمالات ایں بزرگ ماورائے کمال درویشی و شاعری بسیار اند چنانچہ در تیر اندازی و سواری اسپ و نوشتن خط نستعلیق و شفیعا و نازک بندی و نزاکت فہمی شعر و آداب صحبت ملوک و سلاطین و ظرافت طبع

وفر خندہ روئی و تحصیل معاش و گفتن کلمتہ الخیر در حق دیگرے و با ایں ہمہ استغنائے مزاج کہ خاصہ شعراست نظیر خود ندارد و گاہ گاہ ہے کہ با فقیر ملاقات میشود بسیار بہر بانگی می فرماید و غائب و حاضر از مزخرفات ایں ہیچمدان خط وافی بر داشتہ بے تکلف در ستایش دوستانہ می افزاید عمرش از ہفتاد تجاوز خواہد بود حق تعالیٰ با ایں شفقت بزرگانہ اش دیرگاہ سلامت دارد از وست سه

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے — اور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے
کشور دل میں نہیں کوئی کہ آباد رہے — یوں اُجاڑا ہے اسے تم نے بھلا یا در ہے

رزق کا ضامن خدا شاہد کلام اللہ ہے — تسپر اپنی صورتوں سے روز حاجتمند ہیں
مقبروں میں دیکھتے ہیں اپنی ان آنکھوں سے روز — یہ برادر یہ پدر یہ خویش یہ فرزند ہیں
تو بھی رعنائی سے ٹھوکر مار کر چلتے ہیں یار ۲ — سوچتا اتنا نہیں ہم خاک کے پیوند ہیں

زندگانی میں کسے آرام حاصل ہووے گا — ہائے آسودہ جہاں میں کونسا دل ہووے گا
تو ہم سے جو ہم شراب ہو گا — عالم کا جگر کباب ہو گا
اہل ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا — آہ یارب راز دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا
صرفت العمر فی لہو و لعب — فآہا ثم آہا ثم آہا
مجھے گر حق تعالیٰ عشق میں کچھ دست رس دیتا — تو دل ان بیوفاؤں کو کوئی میں اپنے بس دیتا
ستم ہے سوز گر وہ قتل کرتا اپنے ہاتھوں سے — تو جی دیتے ہوئے بھی صورت اسکی دیکھ ہنس دیتا

غم ہے یا انتظار ہے کیا ہے — دل جو اب بیقرار ہے کیا ہے
وائے غفلت نہ سمجھے دنیا کو — یہ خزاں یا بہار ہے کیا ہے
کچھ تو پہلو میں ہے خلش دیکھو — دل ہے یا نوک خار ہے کیا ہے
کھینچ کر تیر مار بیٹھے بس — سوز ہے یا شکار ہے کیا ہے
جس کا تو آشنا ہوا ہو گا — اُس نے کیا کیا ستم سہا ہو گا

تھر تھراتا ہے اب تلک خورشید　　روبرو تیرے آ گیا ہو گا

بستیاں بستی ہیں اور اجڑے نگر آباد ہیں　　وے کہاں؟ جن کے جدا ہونے سے ہم ناشاد ہیں

پرکار کی روش چلے ہم جتنے چل سکے　　اس گردش فلک سے نہ باہر نکل سکے
رونا بھی تھم گیا ترے غصہ کے خوف سے　　تھی چشم ڈبڈبائی پہ آنسو نہ ڈھل سکے
منہ دیکھ آئینہ کا۔ تری تاب لا سکے　　خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے؟
لخت دل مت نکل ابھی باہر　　پیرہن اشک سے مرا نم ہے
کیسی کیسی یہ باتیں کرتا ہے　　سوز ہے یا کہ جان عالم ہے
چین نے دن کو ان آنکھوں کو نہ شب آرام ہے　　شام سے تا صبح رونا صبح سے تا شام ہے

کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا　　مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا

دامن تلک تو تیرے کہاں دسترس مجھے　　تیری گلی کی خاک بھی ہوں تو ہی بس مجھے

سن سوز نہیں یہ آہ و زاری کب تک (رباعی) بس ہاتھ نہ مل یہ بیقراری کب تک
آپی عاشق ہے تو اور آپ ہی معشوق　　پردے سے نکل یہ شرمساری کب تک

سودا

(الف) سودا کہ مرزا رفیع نام دارد۔ در ابتدائے شوق شعر ہندی شاگرد سلیمان علی خاں وداد بود و نیز بہ شاہ حاتم رجوع داشت۔ شاہ مذبور بہ ہمیں جہت در فہرست خود کہ اسامی شاگرداں کہ فہرست آں بر پشت سرلوح دیوان خود نوشتہ۔ اسمش نیز داخل ساختہ۔ اگرچہ مردکم علم بود اما ذکاوت و روانی طبعش از کلامش پیداست۔ در زبان ریختہ علم یکتائی برافراشتہ و ہمیشہ با امرا صحبت

داشتہ قصاید غرا در جواب بعضے قصاید عرفی تصنیف نمودہ و ماسوائے ایں در گفتن ہجوہا قدرت شاعری خود را نمودہ غرض ہمہ اتفاق بہ سبب شہرت بسیار و خوبی کلام او استاد مسلم الثبوتش میدانند والحق کہ چنیں بودہ ناشش در ہندوستان ور وزبان بازاریاں و غزلیات دیوانش بہ اطراف وجوانب و ہر عاقل و امی را بر زباں ۔ باینہمہ شہرت کہ در ریختہ نصیبش بود آخر آخر خیال شعر فارسی ہم بسر ۔ ۔ ۔ بسر آورد ۔ اگرچہ ایں حرکت مناسب شانش نبود خیر غزلہائے فارسی خود نیز کہ در لکھنو گفتہ داخل دیوان ریختہ بقید ردیف ساختہ و ایں ایجاد اوست فقیر چند شعر برائے یادگار بطریق ندرت ازو می نویسد"

(ب)۔ شیر بیشۂ سخندانی مرد میدان پہلوانی مرزا رفیع المتخلص بہ سودا پسر مرزا محمد شفیع کابلی کہ در عصر خویش سرآمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ بعضے اورا دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش میکنند بعضے بسبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعض اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند غرض ہرچہ بود در روانی طبع نظیر خود نداشت غزلہائے آبدار و قصیدہ ہائے سحر کار و ہجوہا و مثنویہائے متعددہ وغیرہم نگاشتہ خاصۂ خیالش بر صفحہ روزگار یادگار است دیوانش بفرنگ و صفاہان رسیدہ دیگر ایں شہرت در خواب ندیدہ ۔ اگر در مثال ہندی اشعار غزل صائب وقتش گویم بجاست واگر در علوئے معانی ابیات قصیدۂ خاقانی ریختہ اش خوانم رواست نقش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست حالا ہر کہ گوید تتبعش خواہد بود فقیر در عہد نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دیدن ایں بزرگ بخدمتش رسیدہ بود بہ پرورش سگان ریشم پشم شوق تمام داشت و بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ برسوز نہادن آہنہا نیز قادر غرض کہ شخصے جامع الکمالات بود ہر جا کہ میرفت عزت و حرمت تمام می یافت نواب مرحوم مغفور نیز وجود اورا در سرکار خود بسیار غنیمت میدانستند وفاتش در لکھنو و مرقدش در امام باڑۂ آقا باقر روزے در ماہ محرم فقیر انجا رفتہ بود اتفاق زیارتش افتاد و نظر بر کتابۂ فرشش کرد براں تاریخ وفاتش گفتہ میر فخرالدین ماہر کہ ہمدم وہمنشین او بود کندہ دید تاریخ ایں است

خلد کو جب حضرت سودا گئے	فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کر پاسِ عناد	شاعران ہند کا سرور گیا

چوں تعمیہ ایں تاریخ خلاف قانون مورخاں بود در خیال فقیر گذشت کہ چنیں شخص را چوں من تاریخ گو می بایست آخر ہماں روز از فیض تائید ربانی تاریخ وفات آں مرحوم و مغفور بے کم و کاست از خانۂ خیال سحر کار مولف بیروں تراویده [۱] ...... غایت انبساط و سرور کہ از موزونی ایں مصرع فصیحہ مادۂ تاریخ کہ کاملان ایں فن را بہ دشواری دست دہد خود در طبیعت خود را آفریں گفتہ۔ آرے تاریخ چنیں شخص چنیں می باید؎

مرزا رفیع آں کہ ز اشعار ہند لیش — ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستاں علو
ناگہ چو در نوشت بساط حیات را — گردید مدفنش ز قضا خاک لکھنؤ
تاریخ رحلتش بدر آوردہ مصحفی — سودا کجا و آں سخن دلفریب او

من کلامہ غزل سر دیوان۔

مقدور نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا — جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا
پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے — کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ — دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں؟

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
ظالم ہماری نعش کو تشہیر ہے ضرور — آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے
عجب بیداد مجھ پہ یہ مرا صیاد کرتا ہے — دکھاتا ہے اُسے مجھ کو جسے آزاد کرتا ہے

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا
آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا — کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا
جو گذری مجھ پہ اُسے مت کہو ہوا سو ہوا — بلاکشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا

---

[۱] کوئی لفظ تھا جس کو کیڑا چاٹ گیا ہے ۱۲

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر / میرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا
جو عمل چاہئے کیجے مرے دکھ دینے کا / وہ نہ کیجے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا

شاعران ہند کا تو گرچہ پیغمبر نہیں / پر سخن کہنے میں اے سوداؔ تجھے اعجاز ہے
کیا جانیے کس کس سے نگہ اسکی لڑی ہے / جس کو چہیں جا دیکھو تو اک...... پڑی ہے
گو پیر ہوئی شاعری سوداؔ کی جوانو! / تم سے نہ کھچے گی یہ کماں سخت کڑی ہے
ہے قسم تجکو فلک دے تو جہاں تک چاہے / جلوہ حسن اسے حسرت دیدار مجھے
جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے / یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے
نہ پھول اے آرسی گر یار سے تجھ کو محبت ہے / بھروسا کچھ نہیں اس کا یہ منہ دیکھے کی الفت ہے
جب اپنے بند قبا تم نے جان کھول دیئے / صبا نے باغ میں جا گل کے کان کھول دیئے
گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی / اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کیا ضد ہے خدا جانیئے مجھ ساتھ وگرنہ / کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

بھر نظر تجھ کو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے / حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے
نہیں معلوم کیا اس سینہ میں جوں شمع جلتا ہے / دھواں نوک زباں سے بات کرتے ہی نکلتا ہے
مجھے تشنیع کیوں کرتا ہے ناصح یہ جو آنکھیں ہیں / بس ان خانہ خرابوں سے کسی کا کچھ بھی چلتا ہے
خبر لے جلد سوداؔ کی وگرنہ میں یہ دیکھوں ہوں / سرہانے اس کے بیٹھا ہاتھ سے تو ہاتھ ملتا ہے

فغاں

اشرف علی خاں فغاں برادر رضاعی احمد شاہ بادشاہ در ابتدائے عمر و موزونی طبع بہ تتبع مرزا رفیع در شاہجہاں آباد نام بریختہ گوئی برآوردہ و آخرہا بہ عظیم آباد بخوش معاشی می گذارند۔ تا آنکہ ہمانجا قضا کرد۔ گاہ گاہے شعر فارسی ہم می گفت۔

(ب) اشرف علی خاں فغاں عرف کوکہ خاں یعنی کوکہ احمد شاہ بادشاہ از دودۂ سابقین است

شعرا بصفائے تمام می گوید و نسبت شاگردی بہ ندیم می رساند چنانچہ خود گفتہ ؎

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں — دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہووے گا

در ایامے کہ بسبب تفرقہ شاہ از شاہجہان آباد برآمدہ بہ طرف پورب گذر انگندہ و معرفت میر محمد نعیم خاں کہ ہم مکتب ایشاں بود بہ ملازمت نواب شجاع الدولہ بہادر رسید یکے از مقربان گردیدہ در ہماں نزدیکی روزے نواب وزیر دستش را در عالم اختلاط بعلس سوختند آب در دیدہ گردانید و ہیچ نگفت و آخر بہمیں حرکت آزردہ شدہ بہ طرف عظیم آباد رفت و در سرکار راجہ شتاب رائے بہ ندامت پیشگی آمدہ اقتدار کلی بہم رسانیدہ بود چند سال است کہ ہمانجا زندگانی را جواب دادہ از انتخاب دیوان اوست۔

مت قصد کر صبا تو دل داغدار کا — ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا

کرتا ہے وصل میں در و دیوار پر نظر — تجکو مزا پڑا ہے فغاں انتظار کا

عالم کو جلاتی ہے تری گرمی بازار — مرتے ہم اگر سایۂ دیوار نہ ہوتا

رفتہ رفتہ بت خوش قدم آفت ہوگا — قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا

کیا سبب ہے کہ نہ آیا مرے نامہ کا جواب — خیر ہو یار کی قاصد تو سلامت ہوگا

ایسی نگاہ کی کہ مرا جی نکل گیا — قضیہ مٹا، عذاب سے چھوٹے، خلل گیا

آنا ہمارے گھر میں تجھے عار ہوگیا — ایسا فغاں کے نام سے بیزار ہوگیا

کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سنے نہیں — خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

اس کے وصال و ہجر میں یونہی گذر گئی — دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے — گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا

تجکو روزی ہو مری جان دعائیں لینا — مجکو ہر شب تری زلفوں کی بلائیں لینا

لکھا ہے نامہ بر در و دیوار یار پہ — گذرا جو کچھ الم دل امیدوار پہ

کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاں؟ — یہاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار پہ

توشۂ راہ سبھی ہمسفراں رکھتے ہیں — تیرے دامن میں فغاں لخت جگر ہے کہ نہیں

عاجز ہوں ترے ہاتھ سے کیا کام کروں میں — گر چاک گریباں تجھے بدنام کروں میں
تاحشر نہ کم ہووے گی ظالم طپش دل — کافر ہوں اگر گور میں آرام کروں میں
جاتا ہے فغاں قافلۂ ہم نفساں کل — کچھ راہ کے چلنے کا سرانجام کروں میں

ہوکر ترے قفس سے میں آزاد کیا کروں — بے بال و پر ہوں لے مرے صیاد کیا کروں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہ رکھ — ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے تو ڈر کہیں
باور نہیں اگر تجھے آتا تو دیکھ لے — آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہیں

نہ دل چمن میں لگے ہے نہ کوہ و صحرا میں — کوئی مکان بھی میرے لئے ہے دنیا میں

کیا تجھ سے خوش رہے ہے دلِ ناشادِ رفتگاں — اتنا بھی تو نہیں کہ کرے یادِ رفتگاں

تقویت ہے داغ سے میرے دل بیمار کو — اے فلاطوں کیا مرض کہتے ہیں اس آزار کو

مجھ مبتلا کی چشم کہاں تک پُر آب ہو — اے دل خدا کرے ترا خانہ خراب ہو
جم جم پلائے دوست تجھے اور جام مے — تو مست رہ فغاں ترا دشمن خراب ہو

کہتے ہیں فصل گل تو چمن سے گذر گئی — اے عندلیب! تو نہ قفس بیچ مر گئی
شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا — تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی؟
تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں (ق) — انصاف تو نہ چھوڑ مروت اگر گئی
آخر فغاں وہی ہے اسے کیوں بھلا دیا ۲ — وہ کیا ہوا تپاک وہ الفت کدھر گئی
مجھ سے جو پوچھئے تو بہرحال شکر ہے ۳ — یوں بھی گذر گئی مری ووں بھی گذر گئی

ڈرتا ہوں محبت میں مرا نام نہ ہووے　　　دنیا میں الٰہی کوئی بدنام نہ ہووے
شمشیر کوئی تیز سی لینا مرے قاتل　　　ایسی نہ لگانا کہ مرا کام نہ ہووے
آتا ہے مری خاک پہ ہمراہ رقیباں　　　یعنی اسے تربت میں بھی آرام نہ ہووے

صنم نامہرباں ہے اس قدر اے میرے رب کیا ہے　　　مری تقصیر کچھ ثابت نہیں وجہ غضب کیا ہے؟
صبا ہر ایک گل سے پوچھیو گلشن میں تو جاکر　　　گریباں چاک رہتا ہے فغاں اس کا سبب کیا ہے

قاصد! تو نا امید پھرا کوئے یار سے　　　خفت ہوئی مجھے دل امیدوار سے
میں دیکھتا ہوں کیا کہ سر راہ ایک شخص (ق)　　　کہنے لگا فغاں! نہیں شاکی تو یار سے
میں نے دیا جواب کہ سنتا ہے اے عزیز (۲)　　　ہے دور مرتبہ مرا صبر و قرار سے

یہ فن کسے نہیں آیا کہ دل میں راہ کرے　　　فغاں ہیں اس کے تصدق ہوں جو نباہ کرے

وہ چاہے یا نہ چاہے فغاں آپ چاہیئے　　　اپنی طرف سے اے مرے صاحب نباہیئے

بے طرح جوش گل نے لگائی چمن میں آگ　　　ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے
تیرے ہی دل سے پوچھیئے اس غم کو اے فغاں　　　الفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

اثر کرتی نہیں اس بت کے دل میں آہ کیا کیجے　　　عجب حالت ہے میری اے مرے اللہ کیا کیجے

یار اگر جفا کرے چاہیئے دل وفا کرے　　　یہ نہ کرے تو کیا کرے وہ نہ کرے تو کیا کرے

میں اپنے درد دل کہنے کے صدقے　　　ترے سن سن کے چپ رہنے کے صدقے

ترے فراق میں کیونکر یہ دردناک جیئے
مرے تو مر نہیں سکتا جیئے تو خاک جیئے

قایم

(الف) محمد قایم۔ قائم۔ متوطن موضع چاند پور۔ شاعر ریختہ گو است و شاگرد مرزا محمد رفیع۔ شہرت تمام دارد۔ عمرش از شصت متجاوز خواہد بود۔ کم کم خیال شعر فارسی کرد و میکند چوں ایں تذکرہ را ماہیت بیاض ہم ہست لہذا انچہ از کلامش انتخاب افتادہ۔ حوالہ کاغذ می نماید و آں این ست۔

(ب) قیام الدین علی عرف محمد قایم صاحب۔ قایم تخلص۔ اگرچہ وطنش قصبہ چاند پور است اما توسل نسبت نوکری بادشاہی اکثر در شاہ جہاں آباد می بود۔ در آں روزہا در توپ خانہ ہم اسامی داشت و بہ مقتضائے موزونی طبع و استعداد درست انچہ موزوں می کرد از نظر میرزا رفیع سودا میگذرانید و بہ خواجہ میر درد نیز اعتقاد و داشتہ بودہ است فقیر او را در ایام ومونے بہ لباس درویشی در سرکار نواب محمد یار خاں کہ دراں روزہا تازہ وارد بود دیدہ در پختگی کلام و چستی مصراع غزل در و بہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بہ دوش استادہ را میرفت[1] بلکہ در بعضی مقام رجحان می جست۔ دراں ایام باعث قصیدہ خواندن و نوکر شدن مولف در سرکار نواب موصوف ایں بزرگ شدہ بود۔ در عرصہ قلیل بہ سبب سلیم مزاجی و سبب نام شاعری رابطۂ شدید بہم رسانیدہ۔ کاغذہائے مسودہ اشعار نواب را کہ برائے اصلاح پیشش می آمدند از کم دماغی بہ دست مشورۂ فقیر می داد چنانچہ سہ ماہ بہ ہمیں طور بہ یک جا گذرانیدہ و شام و چاشت بیک سفرہ کردہ و اللہ کہ یاد آں صحبت گذشتہ داغ ناکامی بر دل آرزومند میگذارد و الحاصل بعد برہم خوردن آبادی کثیر و صورت گرفتن کار فیض اللہ خاں رام پور والہ بہ سرکار نواب احمد یار خاں پسر نواب موصوف دخیل شدہ چیزے موافق زمانہ تقرر داشت اما اوقاتش دراں بہ فراغت بسر نمی شد لہذا برائے رہانیدن دیہات قدیم ملک و یومیہ وغیرہ قصبۂ مذکور در لکھنؤ مکرر گذر افگندہ و از راجہ تکت رائے بہادر رقعہ جات و پروانہ جات بنام عامل آنجا درست کنانیدہ بردہ بود کہ بعد رسیدن وطن و فائز شدن مطلب اجلش در رام پور رسید۔ و خبر وفاتش از شہر بہ شہر انتشار یافت۔ خدایش بیامرزد[2] از وست

پڑھ کے قاصد خط مرا اُس بدزباں نے کیا کہا
کیا کہا پھر کہہ بت نامہرباں نے کیا کہا

---

[1] غالباً "دوش بدوش استاد راہ میرفت" ہوگا ۱۲ [2] اس کے بعد یا دصفحہ جگہ چھوڑ دی گئی ہے اور اس جگہ کی بیچ میں سرخی سے "از دست" لکھا ہوا ۱۲

نہ وعدہ اُس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں
پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

جو کوہکن تجھے قوّت ہی آزمانا تھا
عوض پہاڑ کے شیریں سے دل اُٹھانا تھا
معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا وہ کیا
پیامبر کے نہیں ساتھ آپ جانا تھا!

عیش و طرب کہاں ہے غم دل کدھر گیا
صدقے میں اس گذشت کے کیا کیا گذر گیا

ہو اگر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو بندے کے خریدار بہت
قایم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مرچکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

چاہیں ہیں یہ ہم بھی کہ رہے پاک محبت
پر جس میں یہ دوری ہو وہ کیا خاک محبت

یہاں سے اٹھ غیر کے گھر شب تو گیا کہتے ہیں
بارے اے نیک مروت اسے کیا کہتے ہیں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں
یہاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
میں کہا: "عہد کیا کیا تھا راست"
ہنس کے کہنے لگا کہ "یاد نہیں!"

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں
کبھی ہم اعتبار کرتے ہیں
سی تو لینے دو جیب ناصح کو
اب کے ہم تار تار کرتے ہیں
چلئے قائم کہ رفتگاں اپنا
دیر سے انتظار کرتے ہیں

کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور
باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں
قایم یہ جی میں ہے کہ تقید سے شیخ کی
اب کی جو میں نماز کروں بے وضو کروں

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی ــــ سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں
جور سپہر و دوریٔ یاراں و روئے غیر ــــ جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

ہنوز شوق دل بے قرار باقی ہے ــــ بجھے ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے
گیا تھا آج میں قائم کے دیکھنے کے لئے ــــ کوئی دم اور نفس کی شمار باقی ہے

یارب کوئی اُس چشم کا بیمار نہ ہووے ــــ دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے

کیا کیا عدم میں ہم پر ظلم و ستم نہ ہوں گے ــــ چرچے یہی رہیں گے اور ہائے ہم نہ ہوں گے

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے ــــ کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

شاید وہ بھول کر کبھی یہاں بھی قدم رکھے ــــ یکساں کرو زمین ہمارے مزار کی

وہ بھی کیا دن تھے کہ جی کو لاگ اُس کے ساتھ تھی ــــ میں تھا اور کوچہ تھا اُس کا اور اندھیری رات تھی

دل ڈھونڈتا سینہ میں مرے بو العجبی ہے ــــ اک ڈھیر ہے یہاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

شکوہ نے غیر سے نے یار کی بیزاری سے ــــ جو ہوا ہم پہ سو اس دل کی گرفتاری سے

(باقی)

قلم کی سرگزشت

از جناب محمد حمید اللہ صاحب بی-اے

خامہ فرسائی کرنے والوں کی روز افزوں کثرت کے دیکھتے خود آلہٗ خامہ فرسائی پر اب تک کچھ نہ لکھا جانا تعجب خیز ہے۔ مجھ جیسے ناکارے نے چند گھنٹوں کی تلاش کے بعد جو پیش کیا ہے وہ مفدا نہ کرے کہ آخری ثابت ہو۔

"قلم" ایک عربی لفظ ہے جس کے معنے قطع کرنے کے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عربوں میں سب سے پہلے جو لکھنے کا آلہ رائج ہوا وہ غالباً واسطی یا بروکے قلم کا کوئی ہم جنس تھا۔ یہ لفظ ترکی، فارسی اور اردو میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ ترکی میں اس کا کوئی مرادف مجھے نہیں ملا۔ البتہ فارسی میں "خامہ" (تلفظ خامے) برتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کس لفظ سے نکلا ہے۔ اردو میں قلم، ہولڈر وغیرہ تمام دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں۔ البتہ سنسکرت لفظ "لیکھنی" بھی اردو میں برتا جا سکتا ہے جو "لکھنے" سے مشتق ہے۔ ٹلک (ماخذ) جو مرہٹی لفظ مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

یورپی زبانوں میں سے انگریزی لفظ "پین" (PEN) ہے۔ یہ لاطینی لفظ "پنّا" (PENNA) سے ماخوذ ہے۔ فرانسیسی میں "پلیوم" (PLUME)، المانی (جرمن) میں "فیدر" (FEDER) کہتے ہیں اور ان تمام الفاظ کے معنے پرندے کے پر کے ہیں۔ مگر انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار (PEN) کی رائے میں "قدیم زمانے میں کتوبہ حروف پیدا کرنے کے لئے جو آلات مستعمل تھے ان میں پروں کی سخت کھوکھلی چھڑی نہ تھی۔ سب سے قدیم آلۂ کتابت غالباً نوکدار سُوا ہے جو دھات، ہڈی یا ہاتھی دانت کا ہوتا تھا۔ اور کسی درخت کی لکڑی سے بنائی ہوئی تختیوں پر جن پر موم منڈھا ہوا ہوتا تھا، حروف کندہ کئے جاتے" اس قسم کے قلم کو اسٹائل کہتے تھے (دیکھو آکسفورڈ ڈکشنری) تاہم مقالہ نگار کو بھی تسلیم ہے کہ بعض پودوں کے ڈنٹھل نیز بمبو یا بانس کی چھڑیاں لکھنے کے کام آتی تھیں۔ اور وہی "موجودہ قلموں کے حقیقی قدیم نمائندے" ہیں۔ ایسے قلموں کو چھیل کر نوکدار بناتے ہیں اور نوک یا زبان قلم کے درمیان میں ایک شگاف دیتے ہیں۔ نوک بنانے کو خط لگانا کہتے ہیں۔ انگریزی لفظ ہولڈر کا ماخذ ہولڈ ہے جس کے معنے گرفت اور پکڑنے کے ہیں ——— مزید الفاظ مثلاً تلنگی، کنڑی، گجراتی، بنگالی، یونانی، اطالوی وغیرہ کی تحقیقات اور فراہمی پر میرے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانے والے صاحب میرے ممنون ہوں کہ میں نے بہت سی گنجائش ان کے لئے باقی رکھ چھوڑی ہے خواہ اس کا باعث دردسری سے بچنا ہی کیوں نہ ہو۔

یہ معلوم نہیں کہ قدیم ترین تحریرات مثلاً ہیرو غلیفی وغیرہ کیونکر لکھی جاتی تھیں ۔ موم منڈھی ہوئی تختیوں پر روما میں قبل مسیح سُوئے سے لکھا جاتا تھا۔ پروں کے قلم بھی مروج ہوئے مگر ان کا زمانہ غالباً بہت بعد کا ہے کیونکہ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ "پروں کے قلم کا خصوصی تذکرہ سینٹ اسیڈور آف ساویہ (ST. ISIDORE OF SAVIHE) کی تحریروں میں ملتا ہے ۔ یہ ساتویں صدی کی ابتداء سے متعلق ہے ۔ مگر یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس سے بہت پہلے بھی پر لکھنے میں مستعمل نہیں ہوتے تھے ۔"

عموماً قاز کے بازو کے پر قلم کے کام میں آتے ہیں اور انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے بموجب ۱۸۰۹ء میں جوسف براما (J.BRAMAH) نے پر کو تین تین چار چار ٹکڑے کرنے کا ایک آلہ بنا کر اپنے نام سے حق ایجاد کا تحفظ کرایا ۔ وہ ہر ٹکڑے کو دو سے پانچ تک شگاف دیا کرتا تھا ۔ مگر یہ شگاف قلم یا پر کی صرف نوک پر ہوتے تھے ۔ اور بقدر ضرورت طویل بنائے جاتے تھے ۔

اس کے بعد ہی نبّی دار قلم وجود میں آ گئے ۔ ان میں نبّی (نب) قلم میں لگائی جاتی اور ناکارہ ہونے پر بدلی جا سکتی تھی ۔ ۱۸۰۹ء میں چارلس واٹ نے پروں اور قلموں کے متعلق ایک اور ایجاد کا تحفظ کرایا ۔ یہ سنہری قلموں کا پیش خیمہ تھا ۔ مگر اس سے زیادہ اہم ترقی ۱۸۲۲ء میں ہوئی جب ہاکنس (J.I.HAWKINS) اور مارڈین (S.MARDEN) نے کانٹوں اور کچھوے کی پشت کا سخت غلافی مادہ قلم کی نبّیوں میں استعمال کرنے کا حق محفوظ کرایا ان نبّیوں کی نوک ہیرے یا لعل کے ریزوں یا کسی اور ایسی ہی سخت چیز سے دیرپا بنائی جاتی تھی ۔ یا کچھوے کی کھال سے بنائی ہوئی نبّی کی نوک پر سونے کی ایک ہلکی پرت چڑھا دی جاتی تھی ۔

دھاتی قلم کو قدیم زمانے سے استعمال میں آتے تھے جس کا ایک اچھا نمونہ پامپی آئی کے کھنڈروں سے دستیاب ہوا تھا اور اب ناپلی (NAPLES) کے عجائب خانے میں نمایاں کیا گیا ہے ۔ مگر سچ پوچھیے تو انیسویں صدی کے وسط تک ان کا عام رواج نہ تھا اور ہوتا بھی کیونکر ؟ لکھنے پڑھنے کا بھی تو عام رواج نہ تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ برمنگھم کے ایک کل کار (میکانسٹ) اور چھلہ ساز (SPLIT RING MANUFACTUR) نے جس کا نام سیاموئیل ہیریسن تھا ۱۷۸۰ء میں ایک فولادی قلم ڈاکٹر جوشیا پریسٹ لے کے لئے تیار کیا ۔ ۱۸۰۳ء میں لندن میں وائز نامی ایک شخص فولادی قلم بنا کر فروخت کرتا تھا ۔ اس کی شکل معمولی پر کے قلموں کی سی تھی اور اس میں شگاف بھی تھا ۔ اس کی قیمت پانچ شلنگ کے قریب تھی ۔ لیکن چونکہ وہ سخت اور ناملائم ہونے کے علاوہ غیر تشفی بخش تھا اس لئے اس کی زیادہ مانگ نہ تھی ۱۸۲۸ء میں برمنگھم میں ہیری کے قلم بکتے نظر آئے ۔ اس پر جوشیا میسن نے جو سیاموئیل ہیریسن کا شریک کار تھا ۔

پیری سے اشتراک عمل کر کے اس میں بہت سی اصلاح وارزانی پیدا کی اور پہلے نلی دار اور پھر شگاف دار قلم بنائے پیری نے جو دھانی قلموں کے عام استعمال میں آنے کا بڑا باعث ہے، ۱۸۳۰ء میں ایک اور ایجاد محفوظ کرائی جس میں پتی ایک درمیانی سوراخ اور طرفی شگافوں کے ذریعے بہت نرم کر دی گئی تھی۔ ۱۸۳۱ء میں جوسف گلاٹ نے یہ اصلاح کی کہ پتی کی نوک لانبی کر دی۔

برمنگھم فولادی قلم سازی کا پہلا گھر ہے اور اب بھی اس کا اہم مرکز ہے۔

موجدوں نے فولاد کے علاوہ دوسری دھاتوں کے استعمال کی بھی تجویز کی۔ ان میں سے سونا، چاندی جست، جرمن سلور، ایلومینیم، البومینی کا لنسا زیادہ عام ہیں۔ ڈاکٹر ڈولاٹسن کے بامن سنہری قلم کا ہونا بیان کیا جاتا ہے اس میں ہلکے سنہری غلاف کے سرے پر ریڈیم دھات لگائی گئی تھی۔ بہ ظاہر یہ ڈاکٹر کی ۱۸۰۰ء کی ایجاد کے اصول پر تیار کیا گیا تھا اور اس قسم کا ایک قلم ۱۸۱۰ء میں لارڈ بائرن مشہور شاعر نے استعمال کیا تھا۔ سونا چونکہ ایک نہ گھسنے والی دھات ہے اس لئے اس سے بنی ہوئی پتیاں بہت پائدار ہوتی ہیں۔ مگر یہ دھات اتنی نرم ہوتی ہے کہ اس سے نوک نہیں بنائی جا سکتی۔ اسی وجہ سے اس میں ایک سخت تر دھات لگانی پڑتی ہے۔

بار بار نئی سیاہی لئے بغیر قلم کو زیادہ سے زیادہ دیر تک مصروف رکھ سکنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں اگر سیاہ و رنگین پنسلوں کو خارج بھی کر دیں تو خزانہ دار اور دیرکش قلموں کی دو عام قسمیں ہو سکتی ہیں: ایک میں پتی ہی ایسی بنائی جاتی ہے جو زیادہ سیاہی رکھ سکے۔ دوسری قسم بہت زیادہ اہم ہے۔ اس میں قلم کا تنہ سیاہی کا خزانہ بنا دیا جاتا ہے۔ سیاہی تنے میں سے خود بخود پتی میں آتی رہتی ہے۔ ایسے قلم ہر جگہ لیجائے جا سکتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا سے ایسے قلموں کو سیاہی دار نلی اور فونٹین پین کہتے آئے ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو اس کے ایک صدی بعد کے موجدوں نے ان کو چلانا شروع کیا۔ جوسف براما نے متعدد نمونوں کی ایجاد محفوظ کرائی۔ ان نمونوں میں سے ایک یہ تھا کہ سیاہی دان چاندی یا کسی اور دھات کے اتنے پتلے ورقوں یا ٹکڑوں سے بنایا جاتا تھا کہ اسے دبا سکتے تھے، اور اس طرح سیاہی پتی میں پہنچائی جاتی تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ سیاہی دان میں ایک چھوٹا سا عمود یا استوانہ رکھا جاتا تھا جو پمپ کے اصول پر کام دیتا تھا۔ جدید قلموں میں سیاہی خود بخود پتی تک پہنچ جاتی تھی اور سیاہی دان میں ہوا جانے کا راستہ رکھنے کے باعث کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تھی اور سیاہی کے خرچ ہونے سے جو خلا پیدا ہوتا تھا اس میں ہوا داخل ہو جاتی تھی۔

بعض خزانہ دار قلم سیاہی کش ہوتے ہیں۔ اور پمپ کو حرکت دینے سے خود بخود سیاہی قلم کے تنے

میں بھر جاتی ہے ۔ یہ نسبتاً حال کی ایجاد تو نہیں البتہ اصلاح ہے ۔

بعض قلموں میں تو پتی سرے سے نکال دی گئی ہے اور سیاہی ایک باریک نلی میں سے اترتی ہے جس کے اندر ایک مخروطی سوئی ہوتی ہے ۔ قلم کو کاغذ سے لگانے پر یہ سوئی اندر دیکر سیاہی کا راستہ چھوڑ دیتی ہے اور کاغذ پر سے قلم اٹھا لینے پر سوئی پھر ابھر کر باریک نلی کا راستہ بند کر دیتی ہے اور سیاہی کو ٹپکنے یا قطرنے سے روک دیتی ہے ۔ ایسے قلم اسٹیلو گراف کہلاتے ہیں ۔

فونٹین پین ربر اور گندھک کے مرکب کو سخت کر کر بناتے ہیں ۔ جیسا کہ بک آف نالیج صـ ۲۵ میں لکھا ہے حال ہی میں امریکہ میں شب چراغ قلم نکلے ہیں جن میں پتی کے پاس ایک چھوٹا سا برقی قمقمہ (بلب) ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے برقی خزانہ یا بیاٹری ہوتی ہے ۔ اس میں روشنی صرف اس حصے پر پڑتی ہے جہاں لکھنا مقصود ہوتا ہے ۔ (ماڈرن ریویو کلکتہ) ۔

قلم کی بعض اور قسموں میں سے بلقم سنگ زیرہ (SLATE) کا قلم اور سرمے کا قلم یا پنسل اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان کی بہت سی ذیلی قسمیں ہیں ۔ خشک اور سیال رنگ کی مدد سے لکھنے والے قلموں کا ایک حد تک ذکر ہو چکا ہے ۔ لیکن کھرچے ہوئے حروف کی ایک اب بھی باقی ماندہ شکل سلیٹ کی صورت میں پائی جاتی ہے ۔ اس میں بلقم (سنگ زیرہ) کا نرم پتھر پر اور حال میں مزید پائداری کے لئے کاغذی مٹھوں پر اس کا مسالہ لگا کر ——— بہ آسانی مٹ سکنے والے حروف کھرچے جاتے ہیں ۔ یہاں قدیم پتوں کی تحریروں کی طرف ایک اشارہ بے محل نہ ہوگا ۔ جو تاڑ وغیرہ کے پتوں پر لکھی جاتی تھیں ۔

مضمون بڑھانے کی خاطر ہم حروف نوشت آلے یعنی ٹائپ رائٹر اور مطبع یا پریس کا اس سلسلے میں ذکر نہ کر سکتے ہیں ۔ حالیہ زمانے میں گلکاری کی ترقی سے حروف خود بخود ڈھل کر جمتے جاتے ہیں اور متعدد کام بہ آسانی یکجا طے ہو جاتے ہیں ۔

اب آواز نوشت آلے یا قلم بھی عام ہو چکے ہیں ۔ اس کے ذریعے سے آواز کا اتار چڑھاؤ وغیرہ اپنے آپ کو ایک خط منحنی میں (. . . . . . .) تحریر کرا دیتا ہے ۔ سرد ممالک میں بادل پر لکھنا اب مروج ہو چکا ہے ۔ اس کا اشارہ بھی ضروری تھا ۔

اس ضمن کے اختتام پر بالوں کے قلم یعنی برش کا تذکرہ شاید غیر متعلق نہ ہوگا ۔ یہ رنگ آمیزی خصوصاً نقشہ کشی کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور گلہری وغیرہ کے بالوں سے بنایا جاتا ہے ۔

اپنے خیالات کو خواہ الفاظ اور عبارت میں یا نقش و نگار میں دوسروں کے لئے اور نیز خود اپنی آئندہ ضرورتوں کے لئے محفوظ کر لینا قلم کا فریضہ ہے۔ لکھنے کے ساتھ ہی ہم کو تحریر اور ساتھ ہی ساتھ پڑھنے کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے غیر معہود (UNCONVENTIONAL) اشارات سے ہمیں زیادہ بحث نہیں۔ ان کو صرف خاص شخص ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس قسم کے مخفی خطوں کا ذکر زیادہ صحیح طور پر خط یا تحریر کی تاریخ میں آنا چاہیئے۔

قلم کے ساتھ قلم سازی، قلم فروشی، خوش خطی، تصنیف و تالیف یعنی نفس خامہ فرسائی، ٹائپ اور طباعت مع فروع سب قلم کے ذیلی متعلقہ پیشوں میں داخل ہو سکتے ہیں مگر ان کا تذکرہ بھرتی کے مضمون کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے؟

افسوس ہے کہ اس ضمن میں بالکل برجستہ نگاری پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ کسی وسیع تلاش اور جستجو کو کسی آئندہ موقعے یا مضمون نگار کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ قلم تین چار جگہ وارد ہوا ہے۔ سب سے اہم وہ آیتیں ہیں جن سے تیمناً تبرکاً مسلمان بچوں کو پڑھنا شروع کرایا جاتا ہے اور جو سب سے پہلی وحی میں سرور کائنات صلعم پر نازل ہوئیں۔ وہ یہ ہیں:-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

اس جامع اور حقیقت آمیز تذکرے کا ترجمہ یہ ہے کہ "پڑھ اپنے خالق پروردگار کے نام سے جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اپنے بزرگ پروردگار کے نام سے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا"

ایک مشہور تفسیر میں اس کے متعلق یہ تعلیق کی گئی ہے کہ "خدا نے اپنے بندوں کو نامعلوم باتیں معلوم کرائیں اور انہیں جہل کی تاریکی سے علم کی روشنی میں پہنچایا اور فن کتابت کی فضیلت سے آگاہ کیا کیونکہ اس میں جو عظیم منافع ہیں وہ غیر محدود ہیں۔ تمام علوم کی تدوین، حکومتوں کا گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا، ان کے مقالات کا اور منزل من اللہ کتابوں کا انضباط اسی کے ذریعے ممکن ہو سکا۔ اگر یہ فن نہ ہوتا تو دینی و دنیاوی امور میں استقامت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ خدا کی عظیم ترین حکمت اور لطیف ترین تدبیر تھی کہ قلم اور خط انسان کو دئے گئے"

حضرت ابن الزبیرؓ قلم کے معنے "علم المخفیٰ" کے لیتے ہیں۔

ایک اور جگہ یہ آیت ہے: ن (تلفظ نون) وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝ یعنی قسم ہے نون اور قلم اور

اس چیز کی جسے لوگ لکھتے ہیں۔ لفظ "نون" کے مختلف معنے مراد لئے جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے میں "نون" سے مراد دوات ہے جیسا کہ حرفِ نون کی شکل دلالت کرتی ہے۔ بعض لوگ اس کے معنے کرۂ ارض کے لیتے ہیں۔ غرض حقیقت جو بھی ہو خدا جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے ان میں شامل ہونے کی عزت قلم کو بھی حاصل ہے اور اس کا باعث اس کی وہ عظیم اہمیت ہے جو اسے انسانی تمدن میں حاصل رہی ہے۔

تیسری جگہ ایک ضمنی تذکرہ ہے کہ حضرت مریم عذراؑ کی تولیت حاصل کرنے کے متعلق بیت المقدس کے راہبوں میں جب اختلاف پیدا ہوا تو انہوں نے قلم سے قرعہ ڈالا تھا "اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ" یعنی جب وہ اپنے قلم یہ معلوم کرنے کے لئے ڈالنے لگے کہ کون مریمؑ کی کفالت کرے" یہودی روایات کے بموجب سب عابدوں کے قلم پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگے لیکن حضرت زکریاؑ کا قلم بہاؤ کی مخالف سمت میں اوپر جانے لگا اس طرح انہیں کو کفیل قرار دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب اس سے کم از کم اتنی بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی والدہ کے زمانے سے پہلے بھی قلم رائج ہو چکا تھا اور اس سے توریت لکھی جاتی تھی۔

ایک اور جگہ سورۂ لقمان میں یہ آیت شریفہ ہے کہ "وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ" یعنی اگر زمین پر کے تمام درخت قلم ہو جائیں اور سمندر سیاہی کا کام دے اور اس کے بعد چھ سات سمندر ہوں تو بھی خدا کی نشانیاں ختم نہ ہوں۔ بے شبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

احادیث بھی اس کے متعلق متعدد ہیں چنانچہ یہ مشہور حدیث ہے کہ "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ اُكْتُبْ فَجَرٰی بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَی الْاَبَدِ" یعنی خدا نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا پھر اسے حکم دیا کہ لکھ۔ چنانچہ ابد الدہر تک جو کچھ ہونے والا تھا اسے قلم نے لکھ دیا۔

"جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ" بھی ایک حدیث ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ قلم جو کچھ ہونے والا ہے اُسے لکھ کر سوکھ گیا یعنی تقدیر ہو چکی اب اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

ترمذی میں ایک حدیث زید بن ثابتؓ سے جو وحی نویسی کا معزز کام انجام دیتے تھے یوں مروی ہے کہ "ضَعِ الْقَلَمَ عَلٰی اُذُنِكَ فَاِنَّهٗ اَذْكَرُ لِلْمُمْلِیْ" یعنی قلم اپنی کان پر رکھو۔ یہ لکھنے والے کو خوب یاد دلاتا ہے۔ ایک حدیث ایک ترکی خطاطی کے شہ کارے پر یہ نظر آئی "سُبْحَانَ مَنْ اَتْقَنَ الْحِكْمَةَ بِنِظَامِ الْعَالَمِ بِالنُّوْنِ وَالْقَلَمِ" یعنی خدا نے نون اور قلم کے ذریعے اپنی حکمت سے نظام عالم مکمل و مستحکم کیا۔

عربی اردو ترکی فارسی اشعار غالباً بہت سے ملینگے۔ اس وقت صرف دو تین منقولوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے ۔

و رواقم رقش کمثل ارا قم

قطف الخطا نیاله اقصی المدی

سود الفوائم مالم یجد سیرها

الا اذا لعیت بها بیض المدی

یعنے قلم کی تحریر بعض وقت سانپ کے زہر کا اثر رکھتی ہے اور اس کا اثر ہمیشہ ابدالدہر تک باقی رہتا ہے۔ جب تک وہ چلتا نہیں اس کے پاؤں (روشنائی سے) سیاہ رہتے ہیں اور جب صاف نہ چلے تو چاقو سے چھیلا جاتا ہے۔

قلم گفتہ کہ من شاہ جہانم قلم کش را بدولت می رسانم

اگر بدبخت باشد من چہ دانم ولی یک بار بدولت میرسانم

ارباب قلم تربیت آموز امم در

آداب امم ما حصل فیض قلم در

قدر قلمی آکلا کہ اجلال عظیمی

نزدیک الٰہیہ بیلہ جای قسم در

ہپ فیض قلم در او فضیلت کہ ہمیشہ

ہم دولتہ ہم ملتہ مسئول اہمدر

جحرای قلم دن دوکون نار معارف

باغ وطن ددولتہ باران کرمدر

اہل قلمک بیلملیدر قدرینی زیرا

اندیشہ لری عائمہ ابواب نعمدر

یعنے اہل قلم قوم کے معلم ہوتے ہیں اور کسی قوم کے ادبیات قلم ہی کے مرہون منت ہیں۔ قلم کی اتنی بڑی عزت ہے کہ خدا نے اس کی قسم کھائی ہے۔ سب جگہ قلم کا فیض ہے اور اس کی اتنی عزت ہے کہ سلطنت اور قوم دونوں اس کو اہمیت دیتے ہیں۔ قلم کی ندی (تحریر) سے ملک اور سلطنت کا باغ سیراب ہوتا ہے اہل قلم کی قدر و منزلت معلوم کرنی ضروری ہے کیونکہ اس کے افکار و خیالات سے دنیا بہرہ اندوز ہوتی ہے۔

ایثار محبت

(از جناب شبیر حسین صاحب فیض متعلم جامعہ عثمانیہ)

(۱)

جان ایک غریب کسان کا لڑکا تھا۔ اس کی عمر بارہ سال کی تھی۔ اس کا جسم سڈول اور قوی تھا آنکھیں بڑی اور کالی تھیں۔ وہ ایک ذہین اور ہوشیار طالب علم تھا۔ اور بورڈنگ ہاؤس میں سکونت پذیر تھا۔ چونکہ اسکول بند ہونے والا تھا۔ اس لئے اس نے بورڈنگ کو خیرباد کہا اور اپنے مکان کو جو قریب کے قصبہ میں واقع تھا روانہ ہوا اور رات ایک سرائے میں بسر کی۔

علی الصباح جان اٹھا۔ اور منہ دھونے کی غرض سے باہر کے حوض پر آیا۔ اس اثنا میں ایک بگھی جو کسی امیر کی معلوم ہوتی تھی۔ سرائے میں آکر رکی جس میں سے میری اماونٹس اور اس کی دہ سالہ بیٹی لارنا اتریں۔ یہ لوگ ابھی اچھی طرح دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ ایک سوار نے ڈُڈون کی خبر دی جو چند آدمیوں پر ظلم کر رہے تھے۔ اس خبر سے سب کے دل لرز گئے اور ایک ہل چل مچ گئی۔ کیونکہ ڈُڈون ایک قزاقوں کا گروہ تھا۔ اس قصبہ کے قرب وجوار کی پہاڑیاں اور گھاٹیاں ان کا ماویٰ و ملجا تھیں۔ ان کا دست تطاول چپہ چپہ پر چھایا ہوا تھا ہر فرد ان کے نام سے کانپ اٹھتا۔ اور بیچارے مسافروں کی جان تو ہتھیلی پر تھی۔

میری کی بگھی منزل مقصود کے لئے تیار ہو چکی تھی وہ دوسرے راستہ سے جو زیادہ پر خوف نہ تھا جانیوالے تھے جان صابن ملکر منہ اور سر دھونے ہی والا تھا کہ لارنا کا ادھر سے گذر ہوا۔ کیونکہ بگھی وہیں قریب کھڑی تھی۔ لارنا کھڑی ہو گئی اور ہمدردی کے طور پر اس نے جان کے سر پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ جان اس سے مطلق بے خبر تھا۔ اس نے منہ پونچھا۔ پھر اس کی نظر معصوم لارنا پر پڑی جو مسکرا رہی تھی جان نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور بہت خوش ہوا۔ وقت تنگ تھا اس لئے آپس میں زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ جان چاہتا تھا کہ لارنا کو کوئی نشانی دے۔ بیچارے غریب کے پاس کیا دھرا تھا جو دیتا۔ آخر اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا جس پر جان کندہ تھا۔ اس نے چاقو دیتے ہوئے کہا "لارنا مجھے بھول نہ جانا یہ چاقو میری نشانی ہے ممکن ہے کہ کسی آفت کے وقت کام آئے" لارنا کی نشیلی آنکھیں مرہون منت ہونے کا اظہار کر رہی تھیں اور اس کا چہرہ دلی احساسات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ جو قدرتاً اس اتفاقیہ ملاقات سے پیدا ہوئے تھے۔ اس نے بھی اپنی تمام طفلانہ ادائے نسائیت کے ساتھ ایک رومال پیش کیا اور جان نے اس کا پیش کش قبول کیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ لیکن ان کے پاک دل ایک دوسرے کو گہری نظر محبت سے دیکھ رہے تھے

گاڑی روانہ ہوئی اور گھوڑے نہایت تیزی سے بھاگ رہے تھے کہ مبادی راستہ میں کہیں شام نہ ہو جائے۔ جان اسے برابر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ بگھی ناہموار راستے کو طے کرتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے معصوم دل میں ایک خفیف سا درد پیدا ہوا۔ آنکھوں میں دو بڑے بڑے گرم آنسو بھر آئے۔ یہ اولین زینہ محبت تھا۔

خورشید اپنی ضیا بار شعاعوں کو سمیٹے آغوش مغرب میں پنہاں ہو چکا تھا۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ بگھی کے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی ٹاپوں کی آواز اطراف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر ایک گونج پیدا کر رہی تھی۔ قزاقوں کے سردار سرآئیز ڈون نے آواز سنی اور بگھی کو دیکھتے ہی عقاب کی طرح اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو لئے ہوئے تازہ شکار پر گرا اور عین دریا کے بیچ گھیر لیا۔ میری اور لارنا مارے ڈر کے ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ ڈاکوؤں نے میری کو گھسیٹ کر گود میں اٹھا لیا۔ لیکن لارنا برابر جان کے چاقو کی مدد سے بچاؤ کرتی رہی۔ آخر کار وہ بھی سردار کے پاس لائی گئی۔ اس نے لارنا کو اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا۔ اور میری کے گلے سے موتیوں کا ہار چھین لیا۔ جگر سوختہ ماں بیٹی لپٹ کر رونے لگے لیکن سرآئیز ڈون نے اسے اکیلا ڈھکیل دیا۔ اور وہ سب روانہ ہوئے۔

میری دریا کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ اپنی حالت پر آنسو بہا رہی تھی۔ ایک بڑی سے لہر آئی اور بیہوش میری کو آغوش میں لیکر لارنا سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

بہادر جان بگھی کے پیچھے پیچھے پہاڑ کی چوٹی تک نکل آیا تھا اس نے سب کچھ دیکھا۔ وہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا اس نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر نیچے پھینکا جہاں سے قزاقوں کی جماعت گذر رہی تھی جس کا اثر کچھ ہوا تو نہیں۔ اور وہ بیچارہ کر کیا سکتا تھا۔ مگر قزاق پریشان تو ضرور ہوئے۔ اس نے قسم کھائی "میں بڑا ہو کر ایک ڈون کو بھی زندہ نہ رہنے دونگا۔ اور کچا چبا جاؤنگا"۔ یہ کہکر وہ اپنے مکان واپس ہوا۔ لیکن اس حالت میں کہ اس کے پر جوش دل میں خون انتقام موجیں مار رہا تھا۔

(۲)

اس واقعہ کو گذرے کئی سال ہوگئے۔ دنیا میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ جان جوان ہوا۔ بلکہ قوی خوش رو نوجوان لیکن اس کا دل لارنا کی محبت سے کبھی خالی نہ رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے یاد کر کے رویا کرتا۔ اس کا عہد طفلی آنکھوں میں برابر گھومتا۔ اس کی آنکھیں مخمور اس کے گیسو عنبریں دام الفت کی طرح جان کو کھینچ رہے تھے۔ اس کا پیکر نازنین جان کے دل میں حرف کالحجر کی طرح نقش تھا۔ اس کی زبان اس کی محبت کے گیت الاپتی۔ اور وہ بہت دیر تک اس کی خیالی تصویر سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اس کی نظر میں وہ لعبت حسن تھی۔ سراپا ناز۔ اور اب وہ حسن کی دیوی

کی طرح اس کی پرستش کرتا۔ وہ دوشیزہ تھی جس کے ہر انداز میں وہ شباب کی رعنائیاں مضمر تھیں جو بہت جلد رونما ہو کر
دنیا میں بے مثل نظیر حسن پیش کرنے والی ہیں۔ اسکا خیالی تصور اسے ورطہ حیرت میں ڈالدیتا کہ "اُف اسکی کافر جوانی کس
بلا کی ہوگی۔ اور وہ سہم جاتا۔ اگر لارنا ان خوبیوں سے مبرا ہوتی تو جان اپنی چچیری بہن الزبتھ سے کبھی کے شادی کر لیا ہوتا۔
مگر لارنا اس کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اسکا سچا پرستار تھا۔ اس کا دیوانہ اور اس کی شمع حسن کا پروانہ اس کے تصور
سے اس پر ایک کیفیت مستولی ہوتی۔ اور وہ جھومنے لگتا۔ گو لارنا کی جدائی کو چھ سات سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ تاہم وہ اس
کی راہ محبت میں ایک اٹل پہاڑ تھا اور لارنا کی موہنی مورت اس پر کھُدی ہوئی تھی۔

وہ روزانہ حسب معمول ندی میں سے لکڑی کا شہتیر اٹھا رہا تھا جس کو وہ اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ یہ ندی
قزاقوں کے مکان کے قریب سے گذرتی تھی۔ جان نے تھوڑی دور تک اسے لانے کی کوشش کی لیکن وہ پھسلا۔ سنبھلا
مگر پانی کا سیل، سیل بے پناہ کی طرح امنڈ رہا تھا جس نے اسے بہا دیا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی پتھر کے قریب رک جائے وہ رک گیا
مگر اس کے سامنے ایک بلند آبشار تھا جو ۲۰۰ فٹ کی بلندی سے نیچے گر رہا تھا۔ اس کے آنکھوں کے سامنے اندھیرا
چھا گیا۔ اسے موت کا یقین ہوگیا۔ ایک ریلے نے اسے آبشار کے خونخوار منھ میں ڈالدیا جس نے اسے مچھلی کی طرح
نیچے پھینکا۔ اور وہ بھنور میں چکر کھانے لگا۔ اس کی قسمت نے یاوری کی ـــ اور بھنور نے اسے اٹھا کر کنارہ پر اچھالدیا۔
وہ بیہوش تھا ـــ ادہ موا۔ اور اس کے سر سے خون جاری تھا۔

ایک گھنٹہ کے بعد اس نے اپنی آنکھ کھولی۔ اسے جنت کا خیال ہوا۔ پھر اس نے ایک دوشیزہ کو دیکھا جسکے
زانو پر اس کا سر تھا اور وہ اس کا زخم صاف کر رہی تھی اسے خیال ہوتا تھا کہ اس شخص کو اس نے کبھی دیکھا ہے۔
جان نے اسے حور تصور کیا وہ ششدر تھا۔ نوجوان لڑکی نے ایک دلربا تبسم کے ساتھ اس کا نام پوچھا جس پر
جان نے اپنی نحیف آواز سے اپنا نام بتلایا۔ لڑکی نے عہد طفلی پر ایک اجمالی نظر ڈالی۔ اس پلکیباد۔ اور اس کا چہرہ کھل
گیا۔ جان نے حیرت سے اس کا بھی نام پوچھا جس کے جواب پر اسے یقین نہ آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔
لارنا نے مصر ہو کر وہی چاقو اٹھا لائی جس پر لفظ جان کندہ تھا اور اسے دکھایا۔

جس طرح ایک دیا ویران گھر میں مدت سے ویرانہ کے بعد رکھنے سے چمک پیدا کر کے اس ویرانہ کو آباد کر دیتا ہے
جس طرح بلبل گلاب کو دوبارہ دیکھ کر چکور چاند کی دید سے خوش ہو کر رقص میں آتے ہیں۔ جسطرح شبنم پژمردہ پھول
کی آغوش میں گدگدی پیدا کرتی ہے۔ ایک مرجھایا ہوا درخت نسیم کے جھونکے سے تازہ ہو جاتا ہے۔ ایک خزاں
رسیدہ چمن ابر باراں کے فیض سے سرسبز ہوتا ہے۔ اور اس میں پھر ایک نئی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح

جان اور لارنا نے ایک دوسرے میں روح پھونک دی دونوں فرط محبت سے بغلگیر ہوئے ۔ ان کے دل بے لوث وپاک دل سے ملے اوران کی آبادی قلب پھر لمعہ پاش ہوئی گزشتہ عہد طفلی کی کیفیت عود کررہی تھی پچھلی تجلیاں دوبارہ ان کے گوشہائے قلب میں شرارے کی طرح ضوفشاں ہوئی۔ وہ اس اتفاقیہ ملاقات سے شاداں تھے ۔ اسدرجہ کہ وہ ایک جان دوقالب نظر آتے تھے ۔

اس غیر توقع ملاقات کو زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا اوران کا پیمانہ مسرت پورا لبریز نہ ہونے پایا تھا کہ ایک قزاق دکھائی دیا۔ لارنا کا جان کے بچاؤ کے لئے ایک راستہ بتایا۔ حرماں نصیب جان نے کہا "میری پیاری لارنا اگر کسی وقت مدد کی ضرورت ہو تو پہاڑی کے اوپر جھنڈا لہرا کر مجھے آگاہ کردینا ۔ میں تیرے لئے اپنا خون بہانے اور کٹ مرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہونگا۔ چاہے آفات کا پہاڑ کیوں نہ حائل ہوجائے آگ کا دریا سامنے ہو لیکن تیرا جان اپنی جان نثار کرنے کے لئے ہرگز ہرگز دریغ نہ کرے گا ۔ اچھا خداحافظ اور اس نے اپنا راستہ اختیار کیا ۔ لارنا کو جب تک جان نظر پڑا اس نے راہ میں آنکھیں بچھائیں اور وہ پرنم ہوگئیں ۔

(۳)

سر اینسر ڈون بوڑھا ہوچکا تھا ۔ وہ لارنا کو اپنے ہی پاس رکھتا اور نہایت شفقت سے پیش آتا ۔ ایڈمن ڈون (جو کہ اس کا مشیر خاص تھا) چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کرمن ڈون کی شادی لارنا کے ساتھ کردے ۔ اسنے بوڑھے کو کرمن ڈون کا پیام دیا ۔ اس نے لارنا کو طلب کیا اور پوچھا ۔ لارنا نے صاف انکار کردیا کیونکہ کرمن ڈون ایک نااہل جابر شرابی جوان تھا ۔ سر اینسر ڈون نے کہا "میں لارنا کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ وہ اپنا شوہر آپ منتخب کرلے ۔ اس پر جبر نہیں ہے"۔ لارنا اپنے شفیق سے لپٹ گئی ۔ اور کرمن ڈون اور ایڈمن ڈون اس ٹکے سے جواب پر اپنا سا منھ لے کر رہ گئے ۔ اور کرمن ڈون موقع کا متلاشی ہوا کہ کسی طرح سے لارنا اس کی بیوی بن جائے ۔

سر اینسر ڈون چراغ سحری تھا ۔ اس نے قبل از مرگ ایک وصیت نامہ لکھا کہ "لارنا اپنے ماں کا ونٹس میری کی جائداد اور ملکیت کی پوری پوری طور پر حقدار ہے ۔ اور سب اسی کو ملنی چاہیئے"۔ اور یہ وصیت نامہ ایک صبا رفتار قزاق کے ہاتھ جمس دوم کے پاس لندن بھیجدیا گیا تاکہ مبادا وصیت نامہ غصب کرلیا جائے ۔ اور لارنا کا کہیں حق مارا نہ جائے ۔

اس کے بعد اس نے اس کی ماں کی مالا جو اسے زبردستی چھین لیا تھا اسے واپس دیا اور اشک بار ہوکر لارنا سے معافی چاہی ۔ لارنا نے اسے معاف کردیا ۔ کیونکہ وہ اس کے ساتھ بالکل بیٹی کی طرح سلوک کرتا تھا

اور وہ پھر بیہوش ہوگیا۔

کرمن ڈون نے جب بوڑھے سردار کی حالت سنی تو خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا اور تمام قزاقوں کو اپنی طرف ملالیا۔ نکاح بالجبر کی تیاری کرنے لگا۔ اور نشہ شراب میں چور ہوگیا۔

لارنا صورت حال کو تاڑ گئی۔ اب وہ بالکل بے بس تھی کیونکہ سوائے جان کے کوئی اس کا مددگار نہ تھا اور وہ اسطرح میدان محبت میں اس کا امتحان لے چنانچہ اس نے ایک عورت سے جو اس کو چاہتی تھی التجا کی کہ سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر کپڑا ہلائے اور جب جان آجائے تو اسے مطلع کرے۔ اس عورت نے ایسا ہی کیا۔

جان اپنے مکان کے باہر اپنی بھیڑیں چرا رہا تھا اور ایک اداسی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ ناگاہ اس کی نظر پہاڑی پر پڑی اور وہ دوڑتا ہوا آبشار پر سے کودا اور ایک جوش کے ساتھ اوپر چڑھ گیا۔ اس عورت نے اسے جبریہ شادی اور لارنا کی بے بسی سے آگاہ کردیا۔ وہ دبے پاؤں مکان کی دیوار کے پاس جا بیٹھا۔ قزاق شراب میں مست تھے۔ لارنا نے اپنے کمرہ کی کھڑکی میں سے جہاں وہ مقید تھی جان کو دیکھا اور آہستہ آواز دی۔ جان کھڑکی کے پاس آیا اس نے اپنا سر لارنا کے پیارے پیارے ہاتھوں پر رکھ دیا اور چومنے لگا۔ بعدازاں اس نے موٹی موٹی سلاخوں کو توڑنے کی کوشش کی، اور انہیں ختم کرنے میں کامیاب ہوا۔ کہ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی جان چھپ کر بھاگا اور ایک مدہوش قزاق کی بندوق اٹھالائی۔ کرمن ڈون شراب میں ڈوبا ہوا آیا اور لارنا کو زبردستی گھسیٹ کرلے گیا۔ مانک نکاح پڑھانے پر کسی طرح راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ لیکن کرمن نے اسے موت کی دھمکی دی۔ اور وہ جان کے خوف سے راضی ہوگیا۔

جان دوسری طرف سے آیا اور ایک بیہوش قزاق کو اٹھا کر نیچے پھینکا جہاں نکاح ہونے والا تھا۔ موم بتیاں گل ہوگئیں اور آپس میں اندھوں کی طرح لڑائی چلنے لگی۔ کیونکہ وہ بے حد شراب پئے ہوئے تھے۔ بہادر جان نے ایک جست لگائی۔ اس نے لارنا کو اندھیرے میں اٹھایا۔ چار پانچ کو ٹھوکروں اور گھونسوں سے ٹھیک کرکے لارنا کو لیکر بھاگ گیا قزاقوں میں اسی طرح جوتا چل رہا تھا۔ اس لئے کامیاب جان اپنی دلبر اپنی ملکہ کو گود میں اٹھائے اپنے قصبہ پہونچ گیا۔

(۷)

دوسرے دن صبح کو جان اور لارنا محو خرام تھے۔ اور ایک دوسرے پر محبت کی نظریں ڈال رہے تھے۔ اتنے میں ایک شاہی بگھی آکر رکی۔ جس میں ایک کاونٹس جمیس دوم کی طرف سے پیغام لیکر آئی تھی کہ وصیت نامہ سے

ایک بڑی غلطی کا ازالہ ہوا۔ اور لارنا کو لندن لے جانے والی تھی۔ لارنا نے جان سے اجازت چاہی اور جان نے بخوشی رخصت کیا۔

بھلا جان کو اب کہاں تاب تھی کہ بغیر لارنا کے رہ سکتا۔ لہذا وہ بھی چند روز کے بعد لندن روانہ ہوا۔

جیمس کے عہد کا مشہور واقعہ یعنی بپتسمہ کی رسم عمل میں آنے والی تھی۔ اور لارنا بھی اس میں مدعو کی گئی تھی اسی روز تمام ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔

چند سازشی اس امر پر تلے ہوئے تھے کہ بچہ کو مار ڈالا جائے اور اس طرح سلطنت کو جیمس دوم کے بعد اس کا کوئی رشتہ دار سلطنت کا حقدار نہ ہو۔ سازشیوں کے قریب جان بھی بیٹھا تھا۔ اس نے سب سن لیا اور ایک شخص تپنچہ مارنے ہی والا تھا کہ جان کی نظر پڑ گئی اور اس نے جست کر کے تپنچہ چھین لیا اور دو تین کو اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس واقعہ سے تمام دربار میں کھلبلی مچ گئی۔ اور راز افشا ہو گیا۔ جیمس جان سے بہت خوش ہوا۔ اور لارنا نے اس کا تعارف کیا۔ جان نے محبت کے مارے بچہ کو انا کی گود سے لے لیا۔ یہ حرکت بہت بری تھی۔ اس لئے جیمس کو ناگوار گذرا۔ اور جان دوسرے روز ندامت سے بچنے کے لئے اپنے قصبہ چلا آیا۔

اسے جب کبھی یہ خیال آتا کہ لارنا اسقدر امیر لڑکی ہے اور وہ ایک غریب تو اس کے دل میں ایک درد سے پیدا ہوتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ لارنا کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

وہ گھر پہونچا۔ اس کی بہن الزبیتھ نے پیالہ میں دودھ دیا لیکن اس نے حقارت سے واپس کر دیا۔ لارنا کی محبت اور یہ نفرت الزبیتھ کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ اور وہ لارنا کا قصہ پاک کرنے کی تدبیر سوچنے لگی

لارنا باوفا لارنا نے اپنے مال، اپنے جاہ و حشم کو ٹھکرا دیا۔ اور وہ اپنے جان کے پہلو میں محبت کی زندگی بسر کرنے لندن سے گاڑی میں واپس آئی۔ جان غم کی تصویر بنا ہوا ایک لکڑی کے تختہ پر کھڑا تھا۔ لارنا اس کے قریب آئی لیکن جان اسی طرح بت بنا رہا۔ اس کے خیالات منتشر تھے۔ کیونکہ اسے کبھی چین نصیب نہ ہوا۔

لارنا نے کہنا شروع کیا "جان۔ میرے پیارے جان میں نے صرف تیری محبت کی خاطر جائداد کو چھوڑا تیری جوگن بنکر آئی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ تجھ سے شادی کر کے دن کاٹوں"۔

جان اس ایثار عظیم کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بشاش ہو کر لارنا سے چمٹ گیا۔ اور اسنے اس کے متعدد بوسے لئے۔ اس کے بعد دونوں نے طے کیا کہ جلدی شادی قرار پائے۔

شادی کا اہتمام نہایت سادا تھا اور تصنع نام کو نہ تھا لیکن یہ خوبصورت ہستی زینت محفل بنی ہوئی تھیں۔

الزبتھ نے قزاقوں سے مدد لینے کا تہیہ کر لیا اور وہ فوراً گھوڑے پر بیٹھ کر پہاڑی پر گئی اور کرمن کو اطلاع دی۔ کرمن فوراً گرجا پہنچا جہاں نکاح پڑھایا جا رہا تھا۔ اس نے چھپ کر ایک فیر کیا جو لارنا کے پہلو میں لگا اور وہ تڑپنے لگی۔ کرمن گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔

حسرتیں کبھی تنہا نہیں آتیں بلکہ آفتوں کو بھی ساتھ لاتی ہیں۔ آہ رے فلک لارنا نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو اس کا دشمن بن گیا۔ آہ اے دنیا معصوم لارنا کو تو نے کبھی اچھی طرح خوش نہ ہونے دیا بلکہ ہنساتے ہنساتے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آہ رے چرخ کج رفتار بے گناہ لارنا کے پیچھے تو اسقدر ہاتھ دھو کر کیوں پڑا تھا۔ اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی۔ صرف یہ کہ وہ جان پر جان دیتی تھی۔ اس — اس کا نام لے لے کر زندہ تھی۔ صرف یہی کہ اس نے اپنے جان کے لئے راہ محبت میں اپنے کو فنا کر ڈالنے کی غرض سے اپنی ہستی کو، ہستی اپنے مال وجواہرات کو اس کے سامنے خاک سمجھتی تھی۔ جان اس کا پیارا جان اس کی نظر میں بیش بہا ہیرا تھا اس کی نظر میں ایک دیوتا تھا جس کی وہ پجاری تھی۔ محبت اگر گناہ ہے تو اے محبت تو ایک سم ہے۔ جاں ستاں۔ ایک افعی ہے زہر آلود۔ اور تو ٹھکرا دینے کے قابل ہے۔

لارنا بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہے۔ جان بازو بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ دل امنڈ رہا ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے سرخ ہیں۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"پیاری — لارنا — لارنا۔ آنکھیں کھولو اور اپنے جان کو دیکھو۔ تم مجھ سے خفا ہو گئیں۔ لارنا۔"

جب صبا چلتی ہے تو اپنے نرم نرم جھونکوں سے پھول کھلا جاتی ہے۔ بالکل اسطرح لارنا کے کانوں نے اپنے محبوب کی آواز سنی اور اس کا غنچہ دہن کھلنے لگا۔ زبان نے حکم محبوب پر لبیک کہا اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنی شروع ہوئی۔ وہ بڑبڑانے لگی "ہاں — میں جان — پیارے جان — کو خوشی سے — قبول — کرتی ہوں — جان —" یہ نکاح کے ایجاب وقبول کے آخری الفاظ تھے۔ اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں سب کی توقع اس کی زیست سے قریب قریب منقطع ہو چکی تھی اور جان کی بھی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا تھا۔ وہ فرط تپش سے آگ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے بچپن کی قسم یاد آگئی۔ اور وہ دیوانوں کی طرح چند رفقا کو لیکر قزاقوں پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا۔

الزبتھ اپنے فعل سے حد درجہ نادم ہو کر خود بھی معہ اور کسانوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ جان کی مدد کے لئے روانہ ہوئی۔

جان نے تہیہ کرلیا تھا کہ قزاقوں کو حرف غلط کی طرح صفحہ روزگار سے مٹا دیگا۔ اس نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ "مریگا یا ماریگا" لہذا اس نے سیدھے بند چاٹک پر حملہ کیا اور توڑ نے کی کوشش کی۔ الزبتھ پہونچ چکی تھی۔ لہذا حملے بڑے زور و شور سے ہوتے رہے۔ جان اوپر تک پہنچ گیا۔ اور اس نے کرمن کو دبوچ کر دے مارا۔ وہ بھی سنبھل کر رہگیا۔ اور دونوں میں خوب کشتی ہونے لگی۔ جان پھر اسے پٹخا۔ اور موقع پاتے ہی کرمن نے اپنا چاقو نکال لیا۔ چاقو جان کے سینے کے قریب تک آگیا۔ اس نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔ مگر کرمن بھی کافی قوی تھا۔ اس لئے جان نے چاقو والے ہاتھ کا اوپری بازو مڑوڑ دیا۔ اور اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔ جان نے چاقو دلدل میں پھینک دیا۔ اور اس کے بعد کرمن کو دلدل کے نذر کیا۔ جان نے اسطرح بدلہ لیا۔ اور وہ اپنے گھر واپس آیا۔

دنیا ایک منٹ میں کہیں سے کہیں بدل جاتی ہے۔ لارنا کا کاری زخم بھر آیا۔ گویا وہ پھر زندہ ہوگئی تھی۔ تاکہ جان کی ہو کر رہے۔ جان کی خدمت کے لئے وہ جنت سے واپس کردی گئی۔ الزبتھ نے جان کو لارنا کی صحت یابی کا مژدہ سنایا۔ بھلا اسے کب یقین آتا تھا۔ اس کے نزدیک تو وہ مرچکی۔ الزبتھ نے اشارہ سے لارنا کو بتلایا جو اپنے صحت یاب نگاہوں سے اس کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ جان کو خوشی سے قریب تھا کہ اسے شادی مرگ ہوجائے۔ وہ اس سے جالپٹ گیا (ماخوذ از ڈرامہ لارنا ڈون)

محرم سے بدتر عید

نہ فراغت ملی ہمیں غم سے　　عید بدتر ہوئی محرم سے
عید میں بھی جدا رہے گر تم　　کون سے دن ملو گے پھر ہم سے

کس کے لئے مناؤں عید

دیکھ کر مجھ کو کون خوش ہوگا　　کس سے میں آج ملنے جاؤں عید
میرا خوش ہونے والا پاس نہیں　　پھر میں کس کے لئے مناؤں عید

(راز قاسمی حیدرآبادی)

مشاہدات

(ازجناب ابوالفضل صاحب سرآز چاندپوری)

(۱)

تمہیدِ نشاطِ نوجوانی دیکھی
تکمیلِ سرورِ کامرانی دیکھی
ممنونِ کرم ہوں باغبانِ فطرت!
جی بھر کے بہارِ زندگانی دیکھی

(۲)

تنزیلِ جمالِ صبحِ عشرت دیکھی
تنویرِ سوادِ شامِ راحت دیکھی
اک روز میں دو کرشمہائے دلکش!
اے شاہدِ گل تری کرامت دیکھی

(۳)

ہر نقش میں رنگِ شانِ قدرت دیکھا
ہر رنگ میں جلوۂ حقیقت دیکھا
واللہ! مرقعِ جہان میں میں نے
نقاشِ ازل کا حسنِ صنعت دیکھا

(۴)

گلہائے نظر نواز خنداں دیکھے
فطرت کے ہزار راز عریاں دیکھے
فردوس جہاں میں ہر روش پر میں نے
محمود نما ایاز حیراں دیکھے

تنقیدیں

القضا فی الاسلام تالیف مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، درمیانی لمبی تقطیع ضخامت (۹۲) صفحات قیمت ۱۲/ پتہ دارالمصنفین اعظم گڈھ

ایک عرصہ سے دارالمصنفین اپنی اعلیٰ علمی خدمات کے علاوہ اردو میں خالص اسلامی لٹریچر اور افادہ خاص و عام کے لائق مذہبی و دینی کتب فراہم کرنے کی جو گراں قدر کوشش کر رہا ہے وہ کسی طرح محتاج تعارف نہیں موجودہ زمانہ کے عام تعلیم یافتوں کی عربی زبان سے ناآشنائی کے مدنظر اس کی کسی طرح توقع نہیں کیجا سکتی کہ مذہبی اور دینی علوم جن کی اس وقت تک بہترین سرمایہ دار عربی ہی ہے راست عربی سے حاصل کیئے جائیں گے زمانہ حال نے یہ ضرورت شدید طور پر پیدا کردی ہے کہ جہاں تک زیادہ ممکن ہو اس بلند پایہ دینی لٹریچر کو اردو میں منتقل کر لیا جائے تاکہ عام تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان اسلام اور اس کے احکام کو اپنی ہی مادری زبان میں مطالعہ کریں۔ القضا فی الاسلام، اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے اس میں عدالت اور اس کے تمام متعلقات قاضی، مدعی، مدعا علیہ، گواہ، شہادت اور فصل مقدمات وغیرہ کے مالہ وما علیہ پر اسلامی احکام وقوانین کی قرآن وحدیث اور تاریخ اسلام کی روشنی میں بحث کی گئی ہے مسلمانوں نے اپنی ملک گیری وملک داری کے زمانہ دراز میں معدلت گستری اور دادرسی کی جو صورتیں مہیا کی تھیں وہ بڑی حد تک موجودہ امن کے زمانہ کے پرامن انتظام عدالت جیسی تھیں، فاضل مرتب نے جگہ جگہ مختصر طور پر اسلامی عدل گستری کا موجودہ نصفت شعاری سے مقابلہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ایک عام شخص اسلام میں عدالت کے طور طریقوں کی نسبت بہت خاصی معلومات حاصل کر سکتا ہے اور یہی افادیت ہے جس کے باعث اس قسم کے رسایل اردو میں بہت زیادہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جانے چاہئیں۔

عالم حیات از جناب نبی الحسن صاحب شمیم، اوسط تقطیع ضخامت (۲۷) صفحے قیمت ؟ مطبع عہد آفریں الکسیر راوڈ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

جناب شمیم ایک جوشیلے اور نوعمر شاعر ہیں اگرچہ وہ شاعری سے زیادہ اکتساب علم وفضل میں منہمک ہیں لیکن شعرگوئی سے طبیعت کا قدرتی لگاؤ ہے کہ بے توجہی کے باوجود وہ ایسے پاکیزہ شعر کہتے ہیں جو بڑی فکر و توجہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں یہ محض طبیعت کی اپج اور مزاج کی مناسبت ہے کہ شمیم صاحب کی شاعری بہت سی اچھی

صفات سے متصف ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ انکی جولانی طبع قدیم و جدید ہر دو رنگ میں یکساں ہے وہ غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں میں کامیابی کے بہت قریب ہیں۔ عالم حیات دونوں قسم کے کلام کا مجموعہ ہے۔ مصنف کی عرض حال کے علاوہ مولوی وہاج الدین صاحب کنتوری لکچرار اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج نے مقدمہ لکھ کر شمیم صاحب کی شاعری کا تعارف کرایا ہے۔ شمیم صاحب کی غزلیں مضمون کے علاوہ لطافت زبان کے لحاظ سے بھی پاکیزہ ہیں اور اس خصوص میں ان کا مذاق سخن ستودہ اور پسندیدہ ہے امید ہے کہ یہ مشق بڑھتے بڑھتے شمیم صاحب کو بہت جلد وسیع شہرت کا مالک بنا دے گی۔

چاند ماہوار مصور رسالہ۔ مدیر منشی کنہیا لال صاحب ام اے ال ال بی۔ ایڈوکیٹ۔ نصف کراؤن تقطیع ضخامت عموماً سو صفحات نہایت دیدہ زیب شکل و صورت سالانہ چندہ آٹھ روپیہ ششماہی پانچ روپیہ۔ پتہ چندر لوک اڈمنسٹن روڈ الہ آباد۔

الہ آباد سے ایک ہندی رسالہ چاند کئی سال سے جاری ہے اور خاص و عام میں بڑی وسیع مقبولیت رکھتا ہے اس کی اشاعت کئی ہزار ہے اور شمالی ہند کے کم و بیش تمام ہندی تعلیم یافتہ اصحاب اس سے واقف ہیں اسی ادارے سے ایک اردو رسالہ اسی نام سے جنوری ۱۹۳۰ء سے جاری ہوا ہے۔ اردو چاند اپنے ہندی ہم نام کی طرح ادبی ذوق کی تکمیل کے ساتھ اصلاح معاشرت اور بالخصوص خواتین میں تعلیم کی اشاعت اور عورتوں کی سماجی پوزیشن کو بلند کرنے کا زبردست حامی ہے اس کے دو نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں دونوں متعدد تصویروں سے آراستہ اور طباعت کا بہترین نمونہ ہیں۔ مضامین گوناگوں نوعیتوں کے ہیں۔ دونوں نمبروں میں ایک ایک محققانہ تاریخی مقالہ ہے جو مصور بھی ہے۔ پہلے نمبر میں ٹیپو سلطان پر جو مقالہ ہے اس میں منصفانہ تنقید اور تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت پر منشی کنہیا لال صاحب کو ہم مبارکباد دیتے ہیں۔

منشی صاحب اور ان کے رفقار کار جس خلوص دل سے اردو کی خدمت پر آمادہ ہیں وہ دلی خیر مقدم کا مستحق ہے۔ اردو کے ساتھ ان کا یہ التفات اس کی ترقی کی فال نیک ہے۔ خدا کرے کہ چاند کی ٹھنڈی روشنی اردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانے میں مدد و معاون ثابت ہو۔

متعلم سہ ماہی مصور رسالہ، مدیر حفیظ اللہ میر صاحب مدرس مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ چندہ سالانہ سے طلبا سے عا۔ دیدہ زیب طباعت کتابت تقطیع اوسط۔ پتہ دفتر متعلم پتھر گٹی حیدرآباد

یہ مولوی حفیظ اللہ میر صاحب کی کوشش سے حیدر آباد میں ایک مفید رسالہ جاری ہوا ہے اس کا مقصد کمسن طلبہ میں غیر درسی مطالعہ اور مفید و دلکش مضامین کے پڑھنے کا شوق پیدا کرنا ہے مضمون اکثر طالب العلموں کے ہیں ۔ چھوٹے سلیس اور ستھرے طرز بیان میں لکھے گئے ہیں تصاویر بھی رسالہ کے مقصد کے مناسب طلبہ کی دلچسپی کی ہیں ۔ مدارس تحتانیہ و وسطانیہ کے طلبا اس رسالہ سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ سررشتہ تعلیمات جہاں اور رسالے اور اخبارات طلبائے مدارس کے لیئے خریدتا ہے ، ہر مدرسہ کے دار المطالعہ کے لیئے اس کا ایک ایک نسخہ بھی بہم پہونچائیگا ۔ میر صاحب نے ایک اچھے کام کی ابتدا کی ہے خدا کرے کہ متعلم حیدر آباد کے کم عمر بچوں کی ذہنی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو ۔

جونیر سلف ٹیچنگ ٹرانسلیشن مولفہ مولوی سید مظفر الدین صاحب ندوی ام اے پروفیسر عربی و فارسی اسلامیہ کالج کلکتہ چھوٹی تقطیع مجلد ضخامت (۸۸) صفحات ملنے کا پتہ سید طاہر اللہ صاحب ندوی بی اے چوہٹا باکی پور قیمت ۱۰

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو وسطانی مدارس کے ایسے طلبا کو اردو سے انگریزی ترجمہ سکھانے کے لیئے لکھا گیا ہے جنکی مادری زبان اردو ہے ۔ لایق مولف نے انگریزی زبان کی گرامر کے مبادیات کی اردو میں تشریح کر کے جملوں کی ترکیب اور مسلسل عبارتوں کو اردو سے انگریزی میں منتقل کرنے کا عملی ڈھنگ پیش کیا ہے ۔ اصول کی تشریح و تفہیم کے بعد سو مشقیں دی گئی ہیں جنکے مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی کتاب کے آخر میں لگا دی گئی ہے ۔ مدارس وسطانیہ کے طلبہ کے لیئے ایک مفید کتاب ہے اور بڑی توجہ سے مرتب کی گئی ہے ۔

دروس الادب جزو اول مولفہ مولوی سید مظفر الدین صاحب ندوی ام اے پروفیسر عربی و فارسی اسلامیہ کالج کلکتہ چھوٹی تقطیع صفحات (۸۸) نسخ ٹائپ مجلد قیمت ۲ ملنے کا پتہ مولوی خوندکار فیض الدین احمد صاحب ام اے یونیورسل لائبریری (۸۴) ویلزلی اسٹریٹ کلکتہ قیمت ۱۰

یہ عربی زبان کی ابتدائی کتاب ہے جو بنگال کے عربی مدارس کی تیسری اور انگریزی مدارس کی ساتویں جماعت کے لیئے جن میں عربی کی تعلیم شروع ہوتی ہے لکھی گئی ہے ۔ بنگال میں چونکہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اس لیئے مولف نے اس کتاب میں عربی زبان کی تعلیم بھی انگریزی کے توسط سے پیش کی ہے

عربی کے حروف تہجی کی فہرست دینے کے بعد عربی کے اسماء و افعال وغیرہ کے ساتھ ان کے انگریزی مرادف بھی لکھے گئے ہیں اور جہاں کہیں توضیح کے لیئے عبارت لکھنی پڑی ہے وہ سب انگریزی ہی میں ہے۔ کتاب کے آخری باب میں نظم کے چند سلیس ٹکڑے بھی دئے ہیں۔ اس اصول اور طریقہ پر اس سلسلہ کو آگے بڑھایا جائے اور میٹرک تک عربی نصاب تحریر کیا جائے تو یقیناً اہل بنگال میں عربی کا اچھا ذوق پیدا ہوگا۔

رسید کتب

حسب ذیل کتابوں پر آئندہ شماروں میں تنقید کی جائے گی۔

۱۔ دنیا کے بہترین افسانے مترجمہ از مولوی منصور احمد صاحب شریک مدیر ہمایوں (لاہور)
۲۔ منکران خدا سے خطاب۔ از مولوی سید علی اختر صاحب اختر
۳۔ ارنسٹ۔ مترجمہ مولوی سید تمکین کاظمی صاحب و مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بی اے
۴۔ ہماری شاعری۔ از مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ام اے پروفیسر جامعہ لکھنو
۵۔ تاریخ السلف۔ از جناب معنی اجمیری
۶۔ تاریخ سلاطین فاطمیہ۔ از جناب ایس ذاکر حسین صاحب جعفر

اردو ریسرچ میں ایک اہم اضافہ
گلشن گفتار

یہ شعرائے اردو کا ایک قدیم ترین تذکرہ ہے جو آج تک بالکل نایاب تھا اور جس کی دریافت سے اردو کے اساتذہ قدیم کے حالات صحت کے ساتھ معلوم کرنے میں بیش قیمت مدد ملے گی۔ مولوی سید محمد صاحب ام اے مولف ارباب نثر اردو نے دوسرے تذکروں کے ساتھ تقابل و تطابق کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ ہر شاعر کے تذکرہ میں دوسرے تمام قدیم تذکرہ نویسوں کی معلومات بھی من و عن نقل کردی گئی ہیں جس سے ایک ہی جگہ قدیم اردو شاعروں کی نسبت تمام ممکنہ مواد مل جاتا ہے۔ قیمت ۱۲ تقطیع طباعت کتابت دیدہ زیب۔

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

کتب خانۂ ندوۃ العلماء لکھنؤ

اور

اس کی امداد

(از جناب حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی بی اے، ایم بی بی ایس نائب ناظم ندوۃ العلماء)

"ندوہ مسلمانوں کی واحد درسگاہ ہے، جو اپنے بل بوتے پر کام کر رہی ہے اور یہ شاید ملک کی ان چند درسگاہوں میں سے ہے جن کا مقصد "علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا" ہے۔" اس لئے ندوہ کی امداد حقیقی معنوں میں علم کی امداد، علما کی امداد اور مسلمانوں کی امداد ہے۔"

قومی اور مذہبی ضروریات میں قومی مدرسہ، اور قومی جامعہ کے برابر بلکہ شاید اس سے زاید قومی کتب خانہ کو اہمیت حاصل ہے اگر مسلمانوں کے مذہب، علوم وفنون و ادب کو محفوظ رکھنا ہے، تو ضرور ہے کہ ایک وسیع کتب خانہ بہم پہنچایا جائے جس میں ہر علم و فن کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف کا بہترین ذخیرہ موجود ہو۔ ندوۃ العلما نے اس ضرورت کو آغاز قیام ہی کے وقت محسوس کیا اور ساتھ ہی ساتھ عملی قدم اٹھانا شروع کیا، چنانچہ اس نے اپنے مقصد کا ایک جزو عظیم الشان کتب خانہ کا قیام قرار دیا، اور سب سے پہلے ۱۳۱۰ھ میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنا کتب خانہ ندوۃ العلماء کے لئے وقف فرمایا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء اور ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں یہ تحریک پیش کی گئی، اور جناب مولانا عبد الرافع خاں صاحب شاہجہاں پوری نے اپنا کتب خانہ جو تین ہزار قابل قدر ذخیرہ پر مشتمل تھا عنایت فرمایا، اس کے بعد اور بزرگوں نے وقتاً فوقتاً اکثر کتابیں مرحمت فرمائیں جس میں جناب نواب عالمگیر محمد خاں صاحب، شمس العلماء صفی الدولہ حسام الملک ابو نصر نواب سید محمد علی حسن خاں صاحب طاہر ناظم ندوۃ العلماء، جناب مولانا سید عبد الغنی صاحب بہاری ملازم ریاست حیدر آباد دکن جناب مولانا یحییٰ لکھنوی مرحوم، جناب نواب سکندر نواز جنگ صاحب بہادر (ڈپٹی)، جناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی مرحوم، جناب مولوی سید نبی اللہ مرحوم بیرسٹر لکھنؤ، جناب نواب وقار الملک بہادر مولوی مشتاق حسین مرحوم امروہہ، جناب مولوی سید حسن شاہ سرور مرحوم، جناب مولوی سید شرف الدین صاحب جج ہائیکورٹ جناب مولوی سید مصطفےٰ خاں صاحب (نبیرۂ امیر الملک والا جاہ مولانا نواب سید محمد صدیق حسن خاں بہادر مرحوم) جناب رضی الدولہ نظام الملک مولانا نواب سید نور الحسن خاں مرحوم، جناب منشی اظہر علی صاحب وکیل رئیس کاکوری خلف خان بہادر جناب منشی اظہر علی صاحب مرحوم، جناب مولوی احمد زماں خاں صاحب رئیس و آنریری

مجسٹریٹ شاہجہاں پور، جناب سید عبدالغفار صاحب کشمیری، جناب مولانا محمد علی صاحب مونگیری سابق ناظم ندوۃ العلماء، جناب مولوی صبغتہ اللہ صاحب بی۔ اے کراموہہ، جناب وزیر زادہ محمد عثمان بہاء الدین خاں صاحب ریاست جوناگڈھ (کاٹھیاواڑ) جناب صاحبزادہ ہیرا خاں صاحب بہادر انجینیر، جناب منیجر صاحب آفتاب صداقت لکھنؤ، جناب مولوی حسن اللہ خاں صاحب ثاقب (علیگڈھ)، جناب مولانا سید لطف اللہ صاحب خلف جناب مولانا محمد علی مرحوم مونگیری سابق ناظم ندوۃ العلماء وغیرہ وغیرہ کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ دائرۃ المعارف۔ دارالاشاعت شعبۂ تالیف و ترجمہ حیدرآباد دکن نے اپنے تمام مطبوعات عنایت کیں۔

جزاہم اللہ خیر الجزاء

بزرگان ملت کی ان علم دوست کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ندوۃ العلماء کا کتب خانہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے اور اس سے علمی استفادہ کے لئے علماء و مشائخ اور طلبہ صرف ہندوستان سے نہیں بلکہ ممالک غیر سے تشریف لاتے ہیں۔

اس کتب خانہ کی خصوصیات ذیل ہیں۔

(۱) اکثر علوم و فنون کے متعلق وہ مستند اور بلند پایہ تصانیف موجود ہیں جس پر اس فن کی بنیاد ہے اور جس سے اس فن کی تدریجی ترقی کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

(۲) مختلف علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں، بعض مصنفین کے قلم کے مسودے ہیں بعض کتابیں شاہی کتب خانوں میں رہ چکی ہیں، متعدد کتابیں مطلا اور مذہب ہیں، ایک برنجی اصطرلاب نہایت عمدہ صنعت کا موجود ہے جو شاہجہاں کی وفات سے سات برس بعد لاہور میں تیار کیا گیا

ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں صرف نادر قلمی کتابوں کی تعداد پانسو ہے، ان کے علاوہ مطبوعات کا شمار کم و بیش بیس ہزار ہے اس عظیم الشان اور گراں قدر ذخیرہ میں جن علوم کا سرمایہ خاص طور پر جمع کیا گیا ہے ان میں سے یہاں تفسیر، حدیث، تاریخ اور ادب کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے موجودہ عربی مدارس اور اسلامی ممالک کے بہت سے دینی مدارس میں اس سے بہتر کتب خانہ موجود نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے پیش نظر نصب العین کے لحاظ سے اس کا کتب خانہ اب بھی بہت ہی نامکمل ہے اور اس کے مخلص دردمندوں کے لئے ازحد افسوسناک ہے کہ وہ ابھی تک اسلامی ادبیات کے ان جواہر پاروں سے خالی ہے جن پر ملت اسلامی تا بہ قیامت ناز کرتی رہے گی اس کمی سے ایک طرف تو کتب خانہ کی جامعیت میں فرق آرہا ہے، دوسری طرف کتب خانہ ندوۃ العلماء کا وہ جلیل القدر مقصد پورا نہیں ہوتا جس کی مجسم شکل دارالعلوم ہے اور جس کا اصل یہ ہے کہ علماء کی ایسی جماعت پیدا کی جائے جو وسعت علم عمیق نظر اور صحت تنقید کے ساتھ قوت اجتہاد رکھنے میں اور اپنی دماغی کد و کاوش سے اسلامی علوم اور ادبیات

میں از سر نو زندگی پیدا کر سکیں، اس اہم کمی کا اندازہ جناب کو مطلوبہ کتابوں کی اس فہرست سے ہو سکتا ہے جو اس گذارش کے ساتھ منسلک ہے۔

اسلامی ہندوستان کی موجودہ عبرت انگیز پستی کے باوجود اب بھی ان کے مکانوں، مٹے ہوئے خاندانوں اور ان کے سڑک پر بیٹھنے والے کتب فروشوں کے ذخیرے میں وہ بیش بہا کتابیں موجود ہیں جن کی تلاش میں مغربی کتب خانوں کے کارپرداز یہاں آتے ہیں لیکن صد افسوس کہ ہمارے نامور اسلاف کے دماغی کاوشوں کے یہ مایۂ ناز نتائج ناقدر شناسی کے ہاتھوں ہمارے ملک سے نکل کر یورپ چلے جا رہے ہیں اور یہ انقلاب حکومت کے زمانہ سے لے کر سلسلہ وار جاری ہے اور باوجود اس کے کہ بہت سے کتب خانے غارت ہو گئے اور بہت سے قدیم خاندان کے ساتھ ان کے کتب خانے بھی مٹ گئے، بہت سی نادر کتابیں سڑ گئیں برسات میں گل گئیں، کیڑوں نے بیکار کر دیں لیکن غنیمت ہے کہ اب بھی بہت سی کتابیں باقی ہیں جن سے ہمارے اسلاف کی حیرت انگیز دماغی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ہمدردان علوم اسلامیہ اس کی طرف توجہ فرمائیں اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اول یہ کہ جن لوگوں کے پاس اس قسم کے ذخیرے ہوں اور وہ ان کی حفاظت کا کما حقہ سامان نہ کر سکتے ہوں وہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کو عنایت فرمائیں،

دوسری صورت یہ ہے کہ دوسرے کتب خانوں میں جو نادر قلمی کتابیں موجود ہیں اُن کی نقلیں حاصل کی جائیں لیکن ان نقلوں کے حاصل کرنے کے لئے کثیر رقم کی حاجت ہے سر دست بمد بجۂ فہرست کتابیں منتخب کی گئی ہیں ہمدردان قوم اور قدردانان علم سے درخواست ہے کہ وہ ان میں سے ایک کتاب کی نقل یا نقل کے پورے یا جزئی مصارف ندوۃ العلماء کو عنایت فرمائیں کہ دنیا میں اپنے اسلاف کے زریں کارناموں کا تحفظ اور آخرت میں اس واجب العمل اسلامی خدمت کا ثواب حاصل فرمائیں۔

یہ بیش بہا کتابیں اگر اسلامی خالص کتب خانہ میں آ گئیں، تو وہ دست برد زمانہ سے یقیناً محفوظ ہو جائیں گی اور چونکہ اس سے اہل علم وقتاً فوقتاً مستفید ہوتے رہیں گے اس لئے صدقۂ جاریہ کے اصول پر خدمت علم اور اشاعت مذہب کا ثواب برابر ملتا رہے گا۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔

فہرست کتب مطلوبہ

نمبر	نام کتاب	جلد	فی جلد جزو	اجرت فی جز قلمی	رقم
۱	مسند ابی عوانہ	۴ جلد	فی جلد ۲۰ جزو	اجرت فی جز قلمی	[illegible]
۲	مسند عبد بن حمید	ایک جلد	″ ۲۰ ″	″	[illegible]
۳	مصنف ابن ابی شیبہ	۴ جلد	″ ۳۵ ″	″	[illegible]
۴	صحیح ابن حبان	ایک جلد	″ ۱۵ ″	″	[illegible]
۵	کتاب الثقات لابن حبان۔	۴ جلد	″ ۲۰ ″	″	[illegible]
۶	تمہید ابن عبد البر	″	″ ۲۵ ″	″	[illegible]

نمبر	نام کتاب	جلد	فی جلد جزو	اجرت فی جز قلمی	رقم
۷	کتاب الضعفاء للعقیلی	ایک جلد	فی جلد ۳۰ جزو	اجرت فی جز قلمی	[illegible]
۸	مسند بزار	″	″ ۳۰ ″	″	[illegible]
۹	مسند ابی یعلی	″	″ ۳۵ ″	″	[illegible]
۱۰	مصنف عبد الرزاق	″	″ ۳۵ ″	″	[illegible]
۱۱	الاستذکار لابن عبد البر	″	″ ۲۵ ″	″	[illegible]
۱۲	مسند ابن ابی شیبہ	″	″ ۲۰ ″	″	[illegible]
۱۳	الاطراف للمزی	″	″ ۶۰ ″	″	[illegible]

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ مسوز حکما، اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اُس کا ایک ادنی کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ وبہٗ بواسیر۔ خارش۔ سانپ۔ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) عہ۔ نمبر (۲) ۸۔ نمبر (۳) ۴۔ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی۔ معاف ہوگا۔

پتہ خط و تار کا

"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیرممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ وبہٗ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لے کر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان طلب فرمادیں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ:۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر

جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمۂ مالگزاری حیدرآباد دکن۔

جو حضرات مکتبۂ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے ان کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا - یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی - خریدار صاحبین کو چاہئیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب احکام بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کردیا جائے گا - رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی آدمی مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں -

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امدادِ باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

کے

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکاء

سید محمد ایم اے

عمر یافعی

یہ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جز ہوگا۔

بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ/) فی پرچہ ۶ر

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کیلئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلۂ مکتبہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے۔

تصاویر جناب خان فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات
مولوی محمد حسین صاحب نائب ناظم تعلیمات

جلد (۴) بابتہ ماہ اردی بہشت ۱۳۳۹ف م مارچ ۱۹۲۹ء نمبر (۶)

فہرست

۲

شذرات

مسٹر ہنری فورڈ، جن کا نام انکی وضع کردہ موٹر کار کی رفتار کے ساتھ دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ گیا ہے، اب اپنی آخری عمر میں زادِ آخرت کی تیاری کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ مسٹر فورڈ دنیا کی چند متمول ترین ہستیوں میں سے ہیں۔ اپنی قوم کی فلاح کے لئے وہ اپنی دولت میں سے کچھ حصہ خرچ کرنے پر بھی آمادہ ہیں۔ اپنی زندگی کے مختلف مرحلوں سے گزرنے اور گوناگوں تجربوں کے حاصل کرنے کے بعد ان کا اعتقاد اس پر آ رہا ہے کہ قوم کی فلاح، قوم کے نونہالوں کی اصلاح اور صحیح رہبری پر منحصر ہے۔ اور یہ کام انھوں نے ایک حد تک اپنے ذمہ لیا ہے وہ قوم کے نوجوان افراد کو تجارتی تعلیم سے بہرہ اندوز کرنے کے سامان وافر فراہم کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ کئی مدرسے بنانے والے ہیں۔ انکی مصروفیتوں کا مرکز فی الحال اڈیسن انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی ہے۔ یہیں سے ان کے کام کا آغاز ہو رہا ہے۔ اپنی پوری تجویز کے عملی جامہ پہننے تک وہ دو کروڑ پونڈ یا اس سے زیادہ بھی صرف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مسٹر فورڈ کی زندگی کا یہ تغیر انکی قوم کے نونہالوں کے لئے نیک فال ہے۔

چند ہندوستانی طلبہ مغربی ممالک میں فلم سازی کی صنعت سیکھنے کی غرض سے جا رہے ہیں۔ مسٹر آتول چڑجی نے انگلستان کی اسوسی ایٹڈ سونڈ فلم انڈسٹری سے یہ طے کیا ہے کہ انہیں کچھ ہندوستانی طلباء کو اس صنعت کی تعلیم کے حصول میں ممکنہ سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اس کمپنی میں طلباء آداز کے فلم کی صنعت کے تمام شعبوں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کر سکیں گے۔ ہندوستان کے لئے اس کی سخت ضرورت تھی کہ وہ اس فن کو باضابطہ طور پر حاصل کریں۔ فلم کی اہمیت کے ہر روز نئے پہلو پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ نہ صرف تعلیم کا اچھا ذریعہ ہے، بلکہ اس کے واسطے سے ہندوستان کی معاشرت اور ہندی مناظر مغربی ممالک میں صحیح طور پر روشناس کئے جا سکیں گے۔ اس صنعت کو یہاں قائم ہوئے کچھ ہی سال ہوئے لیکن اب تک بعض اچھے تماشکار پیدا ہو گئے ہیں جن میں مس سیتا دیوی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستانی فلم کو تمدن کی پیش کشی کا ذریعہ اسی طرح بنائیں گے جیسطرح سالہا سال سے ڈراما بنا ہوا ہے۔

مصر، دنیا کے ان چند ممالک میں سے ہے جہاں کی زبان عربی ہے۔ عربی زبان کی غیر معمولی وسعت تو مسلم ہے۔ یہی ایک خصوصیت اس زبان کی ایسی ہے، جو اس کو موجودہ دور کی وسیع ترین علمی زبانوں کے دوش بدوش چلنے کے قابل بتا رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت کا مظاہرہ شاید مصر سے زیادہ

شاندار صورت میں کہیں نہیں۔ خود عربستان میں بھی نہیں۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربی زبان کی یہ کامیابی مصریوں کی قابلیت اور ذہانت کی کچھ کم ممنون نہیں۔ جہاں کوئی زبان کیسی ہی لچکدار اور وسعت پذیر کیوں نہ ہو، لیکن اس کی کارفرما ذہنیتیں، کند اور ناشائستہ ہوں۔ تو خدا ہی رحم کرے۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔ بہر حال عربی زبان میں طباعت کی وہ تمام سہولتیں موجود ہیں جن کے بغیر موجودہ زبانوں کی ترقی مشکل ہے۔ مصری صحافت اور طباعت، عالم میں کافی توجہ کی مستحق بن گئی ہے۔ خدا کرے کہ اہل اردو بھی مرکزوں اور دائروں کے چکر سے نکل کر موجودہ مہذب دنیا کے حکم اس جذبہ افادیت سے مغلوب ہوں!

مغربی اثرات نے، بہت سی چیزوں کی طرح، عربی کو بھی فی الحال عبوریت میں ڈال دیا ہے۔ میمر کی اصطلاحیں، ناٹکوں کی لفظیات از سر نو مدون ہو رہی ہیں۔ بڑے بڑے علما اور پروفیسر اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ ابھی ابھی ایک سرگرم بحث اس کی چھڑ گئی تھی کہ مصری سٹیج (اسٹیج) پر، بازاری عربی استعمال کی جائے یا فصیح زبان۔ خدا کا شکر ہے کہ فیصلہ آخر کے موافق ہوا۔

عبوریت کا ذکر کرتے ہوئے، ہمارا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو گیا کہ اس درخشاں زمانے میں جبکہ انگریزی زبان ہندوستان کے لئے الہام بنی ہوئی ہے گذشتہ سو سال کے اندر کیوں کوئی پائدار ادبی کارنامہ، معین مطمح نظر لئے ہوئے پیدا نہیں ہوا؟۔ معین مطمح نظر سے ہماری مراد سوائے "مقامی رنگ" کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ ہماری قدیم شاعری کا ڈھرا ٹوٹ گیا۔ لیکن جدید شاعری میں صرف ایک آدھے نام کے سوا، کوئی ممتاز نظر نہیں آتا۔ شاعری کی طرح افسانہ نویسی میں بھی ہمارا کوئی معین مطمح نظر نہیں معلوم ہوتا۔ کبھی تو ہم مرثیہ قوم کو، قومی اور فطری شاعری سمجھنے لگتے ہیں۔ کہیں ہمارے رسالوں میں خوش آہنگ الفاظ کے مجموعے، طبعزاد شاعری کے مہتم بالشان نمونوں کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اور کبھی ہمارے شاعر آئینے کے پیچھے طوطی کی طرح وہی بولتے ہیں، جو ان پر مسلط ہے۔ یہ گونا گونی یقیناً بے وجہ نہیں۔ ادبیات کی عقبی زمین ہمیشہ قوم اور معاشرت رہی۔ جب ہماری قوم اور معاشرت خطرہ میں ہے تو ادبیات کے استحکام کا کیا ٹھکانا۔ بنیاد درست نہیں، مکان کی تعمیر کیونکر ہو سکے؟

عجیب افراتفری ہے عجیب طرح کے حجابات ہمارے ذہنوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ ہم نہ اسلاف کو صاف طور پر دیکھ رہے ہیں اور نہ اخلاف ہی کے اعمال سے مطمئن ہیں جہاں اپنے اجداد کو "اگلے وقتوں کے لوگ" سمجھ رہے ہیں، وہیں ہم اپنی اولاد کے حد سے زیادہ جدت طراز ہونے پر کچھ زیادہ خوش نہیں معلوم ہوتے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چل رہا ہے۔ معلوم ہو رہا ہے کہ ہماری ہر نسل، دوسری نسل سے اجنبی ہوتی جا رہی ہے۔ اور

ان سے ایک دوسرے کو صحیح روشنی میں دیکھنے کی قوتیں بڑی حد تک سلب ہو رہی ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ یہی محکوم قوم زندگی ہے!

ذرا دور کیوں جائیے، ہم اپنے گھروں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جس فضا میں ہم رہنا گوارا کرتے ہیں، وہ ہماری عورتوں کے لئے تعمیر نہیں کی گئی ہے۔ ہم مردوں کی تعلیم کے لئے تو جان توڑ کر کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہم میں عورتوں کی تعلیم عام ہے یا وسیع ہے یا کم سے کم مفید ہے۔ لڑکیوں کو بھی آج جو کچھ پڑھنا پڑتا ہے وہ اس کو کل بھولنا پڑتا ہے۔ عملاً انھیں اس علم کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے انجام کار خواندہ اور ناخواندہ دونوں برابر ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ پہلے ہم اسلاف سے کورے اور اولاد سے ناخوش تھے ہی فضا کا یہ اختلاف گویا ہمیں گھر سے بھی بیگانہ بنا رہا ہے۔ اب نہیں معلوم کہ ہم کہاں کے ہو رہیں گے۔

اس کے موازنہ کے طور پر یہ حال ملاحظہ فرمائیے کہ بیوی اور شوہر کے مطامح کے اختلافات زائل کرنے کی غرض سے انگلستان میں ایک جماعت کا افتتاح کیا گیا ہے۔ جس میں ارکین پارلیمنٹ کی بی بیوں کو سیاسیات کا اجمالی نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ تعلیم کا آغاز فی الحال بونا رلا کالج میں ہوا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ بی بیاں شوہر کی حقیقی شریک بن سکیں۔

مہاراجہ سر صدر اعظم بہادر زجمیع البقاہم کی زندگی بھی ایک گونہ زندہ دلی کے ثبوت سے کچھ کم نہیں۔ سرکاری ایسے اہم فرائض کے ساتھ آپ کی ذات ستودہ صفات کو جو ادبی ذوق حاصل ہے وہ آپ کی لائف کا ایک درخشاں باب ہوگا چنانچہ عید الفطر کی تقریب سعید پر اپنے مسلمان احباب کی ضیافت طبع اس طرح فرمائی ہے۔

ختم شد ماہ صیام و عید شوال آمدہ — ایں نوید شادمانی شاد فی الحال آمدہ

مقدم عیدت مبارک بخت بادا شاد کام — تا جہاں باشد بہ نیکی در جہانت باد کام

فقیر شاد صوفی عفی عنہ

۱۳۴۸ھ

اسلام میں عقلیت کا عروج و زوال

(۱)

فلسفہ عقلیت و مادیت

جناب مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ) وکیل نے ڈاکٹر سر اقبال کی کتاب (THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA ——) کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جس کا ایک باب (ایرانی ثنویت) "مجلہ عثمانیہ" (جلد شمارہ) میں شایع ہوچکا ہے۔
(مجلہ مکتبہ)

ایرانی ذہن اپنے جدید سیاسی ماحول سے تطابق پیدا کرتے ہی اپنی خلقی آزادی کا اثبات کرتا ہے اور اپنی نظر کو خارج سے ہٹا کر باطن کی طرف پھیر دیتا ہے تاکہ وہ اُس مواد پر غور و فکر کرے جو اس نے اپنے سفر کے دوران میں خود اپنے اندر سے فراہم کیا ہے۔ یونانی فکر کے مطالعہ سے وہ روح جو مادیت میں تقریبًا گم ہوگئی تھی پھر اپنے آپ کو صداقت کا حکم تصور کرنے لگتی ہے باطنیت اپنا علم بلند کرکے ہر قسم کے خارجی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی قوم کی ذہنی تاریخ میں اس قسم کا دور گویا عقلیت۔ ارتیابیت۔ تصوف اور الحاد کا عہد ہوتا ہے یہ ایسی صورتیں ہیں جن میں ذہن انسانی باطنیت کی ترقی پذیر قوت سے متاثر ہوکر ہر قسم کے خارجی معیارِ صداقت کو مسترد کر دیتا ہے۔ پس ہم زیر بحث عہد میں بھی یہی حالت پاتے ہیں۔

خلافت اُمیہ کے زمانہ میں عمل اتحاد جاری تھا اور نئے حالات زندگی سے مطابقت پیدا کی جارہی تھی، لیکن خاندان عباسیہ کے عروج اور یونانی فلسفہ کے مطالعہ کے بعد سے ایران کی عقلی قوت نے جواب تک محصور تھی پھر آزاد ہوکر فکر و عمل کے تمام شعبوں میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کردیا۔ اس نئی عقلی قوت کی رہنمائی میں جو یونانی

فلسفہ کے مطالعہ سے حاصل ہوئی تھی؛ اسلامی توحید پر تنقیدی نظریں پڑنے لگیں۔ قبل اس کے کہ عقل خشک مناظروں کے ہنگاموں سے دور ہو کر اشیاء کا ایک مستحکم نظریہ تعمیر کرنے کے لیئے کسی گوشۂ عزلت کی تلاش کرتی علم الکلام مذہبی جوش سے متاثر ہو کر فلسفہ کی زبان بولنے لگا۔ آٹھویں صدی کے نصف اول میں واصل ابن اعطا جو مشہور متکلم حسن بصری کا ایرانی شاگرد تھا، اعتزال (عقلیت) کا سنگ بنیاد رکھتا ہے۔ یہ ایسی دلچسپ تحریک تھی جس میں ایران کے بعض نکتہ رس اور دقیق النظر ارباب فکر بھی مشغول ہو گئے لیکن بالآخر بغداد اور بصرہ کے فلسفیانہ مناظرات میں اس تحریک نے اپنی قوت کو زائل کر دیا۔ بصرہ کا مشہور شہر ایک تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے مختلف قوتوں جیسے یونانی فلسفہ، ارتیابیت، مسیحیت، بدھ مت، اور مانویت[1] کی بازی گاہ بن گیا جس سے ایک متجسس ذہن کو کافی روحانی غذا دستیاب ہو جاتی تھی۔ اسی سے اسلامی عقلیت کے ذہنی ماحول نے تشکیل پائی۔ مسلمانوں کی تاریخ کے جس حصہ کو اسپٹا شامی دور کہتا ہے وہ فلسفیانہ نکتہ سنجیوں سے معرا ہے۔ ایرانی دور کے آغاز[2] کے ساتھ یونانی فلسفہ کے مسلمان متعلمین نے صحیح مفہوم میں اپنے مذہب پر غور و فکر کرنا شروع کیا اور وہ مفکرین جو معتزلہ تھے بتدریج مابعد الطبیعیات کی طرف رجوع ہو گئے ہم کو یہاں اسی سے بحث کرنا ہے۔ معتزلہ کے علم الکلام کی تاریخ کا سراغ لگانا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ہمارے

---

[1] خلافت عباسیہ کے عہد میں اکثر لوگ مخفی طور پر مانوی خیالات رکھتے تھے۔ دیکھو "فہرست" لیپزگ ۱۸۷۱ء صفحہ ۳۳۸۔ دیکھو "المعتزلہ" مرتبہ ٹی ڈبلیو آرنلڈ لیپزگ ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۰۔ اسمیں مصنف نے ایک مناظرہ کا ذکر کیا ہے جو ابو الہذیل اور ثنویت کے پیرو صالح کے مابین ہوا تھا۔ دیکھو میکڈونلڈ کی "مسلمانوں کا علم الکلام" صفحہ ۱۳۳

[2] معتزلہ مختلف قومیت کے تھے ان میں سے اکثر یا تو پیدائشی طور پر ایرانی تھے یا توطن سے ایرانی بن گئے تھے۔ واصل ابن عطا بھی جو اس فرقہ کا بانی کہا جاتا ہے ایرانی تھا (براؤن۔ تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۲۸۱) فان کریمر ان کے ماخذ کا سراغ عہد امیہ کے کلامی مناظرات تک لگاتا ہے اعتزال مسئلہ اصل ایرانی تحریک تھی۔ لیکن بقول پروفیسر براؤن کے (تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۲۸۳) یہ بالکل صحیح ہے کہ شیعہ اور قدریہ عقاید اکثر دوش بدوش پائے جاتے تھے اور شیعوں کا جو نظریہ آج کل ایران میں مروج ہے وہ اکثر حیثیتوں سے معتزلی ہے۔ اس کے برخلاف حسن الاشعری جو اعتزال کا زبردست مخالف ہے شیعوں کے نزدیک بہت ہی خطرناک سمجھا جاتا تھا اسمیں اس قدر اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ اعتزال کے بعض زبردست نمایندے مذہبًا شیعہ تھے جیسے ابو الہذیل (المعتزلہ مرتبہ ٹی ڈبلیو آرنلڈ صفحہ ۲۸) اسکے برعکس الاشعری کے اکثر پیرو غیر ایرانی تھے (دیکھو ابن عساکر کے اقتباسات مرتبہ مہرین) اسلئے اشعری طریقۂ فکر کو خالص سامی تحریک سے منسوب کرنا جائز نہیں معلوم ہوتا

پیش نظر مقصد کے لیئے اس قدر کافی ہے کہ معتزلہ نے اسلام کے متعلق جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس کے مابعد الطبیعی پہلو کو اجمالی طور پر بیان کردیں لہٰذا تصور خدا اور نظریۂ مادہ ہی عقلیت کے وہ پہلو ہیں جن پر ہم یہاں بحث کرنا چاہتے ہیں۔

معتزلہ دقیق جدلیات کے ذریعہ سے خدا کی وحدت کے جس تصور تک پہونچے تھے وہ ایسا اساسی نقطہ ہے جہاں ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور معتزلہ میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے ان کے نقطۂ نظر سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خدا کی صفات ان ہی میں موجود ہیں بلکہ وہ خدا ہی کی ذات و ماہیت میں داخل ہیں اسی لیئے معتزلہ صفات الٰہی کے علیحدہ وجود سے انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ صفات مجرد ہستی ربانی کی بالکل عین ہیں۔ ابوالہذیل کہتا ہے کہ "خدا ہمہ داں، قادر مطلق اور ذی حیات ہے اور اس کے علم، قوت اور حیات ہی پر اس کی ذات مشتمل ہے"[1] خدا کی وحدت خالص کی توضیح کے لیئے یوسف[2] البصیر نے حسب ذیل پانچ اصول پیش کئے ہیں۔

۱۔ سالمہ اور عارضہ کا مفروضہ
۲۔ خالق کا مفروضہ
۳۔ خدا کے احوال کا مفروضہ
۴۔ اُن صفات کا انکار جو خدا کے لئے موزوں نہیں ہیں۔
۵۔ تعدد صفات کے باوجود خدا کی وحدت۔

وحدت کے اس تصور کو مزید تغیرات میں سے گزرنا پڑا یہاں تک کہ معمر اور ابو ہاشم کے ہاتوں میں [3]آکر اس کی صورت امکان مجرد کی سی ہوگئی جس کے متعلق کوئی بات متعین طور پر نہیں کہی جاسکتی وہ کہتا ہو کہ خدا کے علم کے متعلق کوئی بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ اس کو جس چیز کا علم ہوگا وہ خود اس کی ذات میں ہوگی اول الذکر سے موضوع و مفروض کی عینیت لازم آتی ہے جو مہمل ہے اور دوسرا خیال خدا کی ذات میں ثنویت کو مستلزم ہے جو ناممکن ہے تاہم نظام کے شاگرد احمد اور فضل[4] نے اس ثنویت کو تسلیم کرلیا اور اس بات کے قائل ہوگئے کہ ابتدائی خالق دو ہیں۔ خدا جو ہستی ازلی ہے اور کلام الٰہی یعنی روح اللہ جو ہستی ممکن ہے۔ معمر نے

---

[1] شہرستانی مرتبہ کیورٹین صفحہ ۳۴

[2] ڈاکٹر فرانکل (EIN MU'TAZILITISCHER KALAM) صفحہ ۱۳

[3] شہرستانی صفحہ ۴۸ دیکھو اسٹینر کی (DIEMUTAZILITENNIE 14, 1872) صفحہ ۵۹

[4] ابن حزم (مطبوعہ قاہرہ) جلد چہارم صفحہ ۱۹۰ دیکھو شہرستانی صفحہ ۴۲

دوسرا پہلو جو پیش کیا تھا اس میں صداقت کے عنصر کو الگ کرکے پوری طرح واضح کرنا ایران کے آنے والے صوفیانہ مفکرین کے لیئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض عقلیئین غیر شعوری طور پر وحدت الوجود کی سرحد تک پہنچ گئے تھے اور ایک لحاظ سے خدا کی انھوں نے جو تعریف کی ہے اور قانون مطلق کی خارجیت کو باطنیت میں تنقل کرنے کی جو مشترکہ کوشش کی ہے اس سے وحدت الوجود کے لیئے راستہ صاف ہو رہا تھا۔

لیکن عقلیت کے علمبرداروں نے خالص مابعد الطبعی تخیلات میں مادہ کی توجیہ سے اہم اضافہ کیا ہے اسی کو ان کے مخالفین اشاعرہ نے کچھ ردوبدل کرکے ماہیت خدا سے متعلق اپنے خیالات سے مطابق کرلیا۔ نظام میں خاص دلچسپی کی چیز یہ ہے کہ اس نے اس خیال کو مسترد کردیا کہ فطرت[1] کی ترتیب و تنظیم میں بے ضابطگی ہے فطرت کی اس دلچسپی کی رہنمائی میں جاحظ نے ارادہ کی تعریف خالص سلبی نقطۂ نظر سے کی۔ اگرچہ عقلیئین شخصی ارادہ کے تصور کو ترک کرنا نہیں چاہتے تھے تاہم وہ انفرادی مظاہر فطرت کے استقلال و آزادی کی حمایت کے لیئے مستحکم دلیل کے متلاشی تھے اور یہ دلیل ان کو خود مادہ میں مل گئی۔ نظام نے یہ تعلیم دی کہ مادہ لامحدود طور پر قابل تقسیم ہے اس نے جوہر و عرض[2] کے باہمی امتیاز کو بھی مٹادیا۔ وجود ایک ایسی صفت سمجھی جاتی تھی جسے خدا نے مادہ کے ان ذرات کو عطا کیا ہے جو پیشتر ہی سے موجود تھے بغیر اس صفت کے یہ ذرات ناقابل ادراک ہوتے ابن[3] حزم کہتا ہے کہ محمد ابن عثمان جو معتزلہ کے شیوخ میں سے تھا اس بات کا قائل تھا کہ معدوم (یعنے ایسا سالمہ جو وجود سے پہلے کی حالت میں ہو) ابھی ایک جسم ہے جو حالت عدم میں ہے لیکن صرف فرق یہ ہے کہ وہ قبل الوجود حالت میں نہ متحرک رہتا ہے نہ غیر متحرک اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ خلق کیا گیا ہے لہذا جوہر مجموعہ ہے رنگ، بو، ذائقہ جیسی صفات کا۔ اور یہ صفات بھی مادی صلاحیتوں کے سوا اور کچھ نہیں روح بھی مادہ کی ایک لطیف قسم ہے۔ اعمال علم محض ذہنی حرکات ہیں۔ تخلیق[4] محض ان صلاحیتوں کو معرض ظہور میں لانا ہے جو پیشتر ہی سے موجود ہیں۔ کسی شئے کی انفرادیت جسکی یہ تعریف کی گئی ہے کہ "وہ

---

[1] اسٹینز (DIE MU'TAZILITEN) لیپزگ ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۰

[2] " صفحہ ۵۹

[3] شہرستانی مرتبہ کیورٹین صفحہ ۳۸

[4] ابن حزم (مطبوعہ قاہرہ) جلد پنجم ص ۴۲ شہ اسٹینز (DIE MU'TAZILITEN) صفحہ ۸۰

چیز جس کے متعلق کسی بات کو محمول کیا جا سکے" خود اس شئے کے تصور کا لازمی عنصر نہیں ہے۔ مجموعۂ اشیاء جس کو ہم کائنات سے تعبیر کرتے ہیں خارجی حیثیت رکھتا ہے یا یہ ایک قابل ادراک حقیقت ہے جو نفس ادراک سے علیحدہ موجود ہے۔ ان مابعد الطبعی دقیقہ سنجیوں کا تعلق علم کلام سے تھا۔ عقلیین کے نزدیک خدا ایک وحدت مطلق ہے جس میں کسی طرح کی کثرت کو دخل نہیں اور وہ قابل ادراک تعدد یعنے کائنات کے بغیر بھی موجود رہ سکتا ہے۔

خدا کی فعلیت اس بات پر مشتمل ہے کہ وہ سالمہ کو قابل ادراک بنا دے۔ سالمہ کے خواص خود اس کی ذات سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جو پتھر اوپر کی طرف پھینکا جاتا ہے وہ اپنے باطنی[1] خواص کی وجہ سے نیچے گر جاتا ہے۔ العطار بصری کہتا ہے کہ خدا نے رنگ و بو طول و عرض اور ذائقہ کو خلق نہیں کیا بلکہ یہ خود اجسام[2] ہی کی فعلیتیں ہیں۔ خدا[3] کو کائنات میں اشیاء کی تعداد کا بھی علم نہیں ہے۔ بشیر ابن المعتمر نے تولد یا تعامل[4] اجسام کے نظریہ سے اقسام کے خواص کی توجیہ کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عقلیین فلسفیانہ حیثیت سے مادیین تھے اور علم الکلام کے نقطہ نظر سے الہیئین۔

ان کے نزدیک جوہر اور سالمہ ایک دوسرے کے مماثل تھے۔ وہ جوہر کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ یہ ایک سالمہ ہے جو مکان کو شاغل ہوتا ہے اور اس میں شاغل مکان ہونے کی صفت کے علاوہ جہت، قوت اور وجود کی صفات بھی ہیں بس یہی اس کی ماہیت ہے۔ اسکی صورت مربع ہے کیونکہ اگر اس کو مدور سمجھا جائے تو مختلف سالمات کی ترکیب ناممکن ہے تاہم سالمہ کی ماہیت کے متعلق سالمیت کے حامیوں میں بے حد اختلاف آرا ہے بعض کہتے ہیں کہ سب سالمات ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن ابوالقاسم بلخی ان کو مماثل و مخالف بھی سمجھتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ دو اشیاء ایک دوسرے کے مماثل ہیں تو اس سے لازمی طور پر ہمارا یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ ان کے تمام صفات میں بھی مماثلت ہے۔ ابوالقاسم سالمہ کی عدم فنائیت کے متعلق نظام سے مختلف الرائے ہے وہ کہتا ہے کہ اس کا آغاز ایک زمانہ میں ہوا ہے لیکن وہ کلیتاً فنا نہیں ہو جاتا۔ بقا سے کسی شئے کو وجود کی صفت کے سوا کوئی نئی صفت حاصل نہیں ہوتی اور تسلسل وجود

---

[1] شہرستانی صفحہ ۴۰ [2] ابن حزم مطبوعہ قاہرہ جلد چہارم صفحہ ۱۹۴ تا ۱۹۷

[3] ابن حزم جلد چہارم صفحہ ۱۹۴

[4] شہرستانی صفحہ ۴۴۔

کوئی مزید صفت ہی نہیں ہے۔ فعلیت آلہی نے سالمہ کو اور نیز اس کے تسلسل وجود کو خلق کیا ہے۔ تاہم ابوالقاسم تسلیم کرتا ہے کہ بعض سالمات مستمر وجود کے لئے خلق نہیں کیئے گئے ہوں گے۔ وہ سالمات کے درمیان کسی مکان کے وجود سے بھی انکار کرتا ہے اور اسی مسلک کے دیگر نمایندوں کے خلاف یہ تسلیم کرتا ہے کہ سالمہ عدم کی حالت میں جوہر کی حیثیت سے نہیں رہ سکتا۔ اس کے خلاف کہنا تناقص حدود ہے۔ یہ کہنا کہ جوہر حالت عدم میں بھی جوہر کی حیثیت سے رہ سکتا ہے گویا اس بات کے برابر ہوگا کہ وجود عدم کی حالت میں بھی وجود کی حیثیت سے قائم رہ سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابوالقاسم اشاعرہ کے نقطہ نظر تک پہنچ جاتا ہے جنھوں نے عقلیین کے نظریۂ مادہ پر ایک مہلک ضرب لگائی تھی۔

(۲)

ہم عصری تحریکات فکر

اعتزال کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ جیسا کہ قدرتی طور پر عقلی جدوجہد کے زمانہ میں ہوا کرتا ہے۔ ہم کو دوسرے میلانات فکر بھی نظر آتے ہیں جو اسلام کے فلسفیانہ اور مذہبی حلقوں میں رونما ہوئے۔ ہم ان پر ایک اجمالی نظر ڈالیں گے۔

۱۔ ارتیابیت۔ ارتیابیت کا میلان عقلیت کے خالص جدلیاتی طریقہ کا قدرتی نتیجہ تھا ابن اشرس اور الجاحظ جیسے لوگ بظاہر عقلیین کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ دراصل ارتیابیین یا مشککین تھے الجاحظ نے جو فطریت[1] کی طرف مائل تھا کسی پیشہ ور متکلم کا نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا بلکہ اس کا نقطۂ نظر بھی اس زمانہ کے عام روشن خیال لوگوں کا سا تھا اس نے اپنے پیشروؤں کی مابعد الطبعی باریک بینیوں کے خلاف ردعمل کیا اور اس میں علم الکلام کے دائرہ کو ایسے جہلا تک وسیع کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے جو معتقدات مذہب پر غور و فکر کرانے کے ناقابل ہیں۔

۲۔ تصوف۔ اس کا تعلق اعلیٰ مبدا علم سے تھا اس کو سب سے پہلے ذوالنون نے منضبط کیا۔ اس میں اشاعرہ کی خشک عقلیت کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی اور مدرسیت کی مخالفت پیدا ہوگئی۔ آئندہ باب میں ہم اس دلچسپ تحریک پر بحث کریں گے۔

---

[1] ملاحظہ ہو کا علم الکلام از میکڈونلڈ صفحہ ۱۶۱

۴۔ سند کا احیا یعنے اسماعیلیت جو بالتخصیص ایرانی تحریک تھی اور جس نے آزاد خیالی کو مٹانے کی بجائے اس سے مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ تحریک اس زمانہ کے کلامی مناقشات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی لیکن اس کو آزاد خیالی سے اساسی تعلق تھا۔ ان اسالیب کی مشابہت سے جن کو اسماعیلی مبلغین اور اُس مجلس کے اراکین نے اختیار کیا تھا جو اخوان الصفا کے نام سے مشہور تھی یہ پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں اداروں میں کوئی مخفی تعلق تھا۔ اس تحریک کے بانیوں کا خواہ کچھ ہی مقصد ہو تاہم عقلی مظاہر کی حیثیت سے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فلسفیانہ و مذہبی آراء و افکار کی کثرت سے جو کہ تفکری جدوجہد کا لازمی نتیجہ ہے ایسی قوتیں وجود میں آسکتی ہیں جو خود اس خطرناک کثرت کے خلاف کرتی ہوں۔ تاریخ فلسفہ یورپ کی اٹھارویں صدی میں نشٹے بھی ماہیت مادہ کی تحقیق کا آغاز ایک ارتیابی نقطہ نظر سے کرتا ہے اور اس کا فلسفہ وحدت الوجود پر منتہی ہوتا ہے۔ شلائرماخر برخلاف عقل کے ایمان کو متاثر کرتا ہے۔ جاکوبی عقل سے بالاتر مبداء علم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن کانٹ تمام مابعد الطبعی تحقیقات کو ترک کر کے علم کو حسّی ادراک تک محدود کر دیتا ہے اس کے برخلاف دی میسٹر اور شلیگل ایسے پاپا کی سند و اقتدار پر انحصار کرتے ہیں جو قطعاً معصوم سمجھا جاتا ہے۔ عقیدۂ امامت کے علمبردار بھی دی میسٹر کے ہم خیال ہیں لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ اسماعیلیوں نے ایک طرف تو اس عقیدہ کو اپنے مذہب کا سنگ بنیاد قرار دیا اور دوسری طرف آزادی فکر کو جائز رکھا۔

لہٰذا اسماعیلی تحریک اُس مسلسل و مستمر جنگ[1] کا ایک پہلو ہے جس کو ایسے ایرانیوں نے جن کو ذہنی آزادی حاصل تھی، اسلام کے مذہبی و سیاسی نصب العین کے خلاف برپا رکھا۔ فرقۂ اسماعیلیہ ابتداً شیعہ مذہب ہی کی ایک شاخ تھا لیکن عبداللہ ابن میمون کے زمانہ میں جو غالباً مصر کے فاطمی خلفا کا مورث اعلیٰ تھا اس نے عالمگیر نوعیت حاصل کر لی۔ عبداللہ ابن میمون نے اس زمانہ میں وفات پائی جبکہ آزاد خیالی کے زبردست دشمن الاشعری کی ولادت ہوئی۔ اس نے عجیب و غریب تدبیر سوچی اور مختلف رنگ کے

---

[1] ابن حزم اپنی کتاب الملل والنحل میں ایران کے ان ملحدانہ فرقہ بندیوں کو عربوں کے خلاف ایک مسلسل پیکار سمجھتا ہے اس پر اس طریقہ سے ایرانیوں نے عربوں کی قوت کے استحصال کی کوشش کی۔ دیکھو فان کریمر کی "GESCHICHTE DER HERRSEHENDEN IDEEN DES ISLAMS"

صفحہ ۱۰ جس میں قرطبہ کے اس عرب مورخ کے خیالات کو تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔

خیالات کی آمیزش سے ایک مغلق نظام فلسفہ تعمیر کیا جو اپنی پُراسرار نوعیت اور مبہم فیثا غورثی فلسفہ کی وجہ سے ایرانی ذہن کے لئے بے حد مرغوب تھا۔ اس نے مجلس اخوان الصفا کے اراکین کی طرح عقیدۂ امامت کے مقدس بھیس میں اُس زمانہ کے مروجہ تصورات کو مرتب و منضبط کرنے کی کوشش کی۔ یونانی فلسفہ مسیحیت، عقلیت، تصوف، مانویت، ایرانی الحاد اور سب سے بڑھ کر حلول کے تصور نے اسماعیلی نظام کی تشکیل میں حصہ لیا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس مذہب کے مختلف پہلوؤں کو "امام" جو ہمیشہ حلول کرنے والی ایک عالمگیر عقل ہے اپنے زمانہ کے عقلی نشو و نما کے لحاظ سے ایک متبدی پر بتدریج ظاہر کرتا ہے آزاد خیالی نے اس اندیشہ سے کہ کہیں وہ خود معدوم نہ ہو جائے۔ اسماعیلی تحریک میں ایک مستحکم بنیاد پر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور بدقسمتی سے یہ بنیاد اس کو ایسے تصور میں حاصل ہوئی جو خود اُس کی ذات کے منافی ہے سند جو کبھی کبھی اپنا اثبات کرتی ہے اس لاوارث لڑکے کو اپنا متبنیٰ کرلیتی ہے اور ماضی، حال و مستقبل کا علم فراہم کرنا چاہتی ہے۔

بدقسمتی سے اس تحریک کو اُس زمانہ کی سیاسیات سے جو تعلق تھا اس کی وجہ سے اکثر علماء کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کو مثلاً (میکڈونلڈ) اس میں صرف یہی نظر آتا ہے کہ ایران سے عربوں کی سیاسی قوت کو مٹانے کی یہ ایک زبردست سازش تھی۔ انھوں نے اسماعیلیہ مذہب پر جس کے پیرؤں میں بعض اچھے دماغ اور مخلص دل کے لوگ بھی تھے یہ الزام لگایا ہے کہ یہ سنگدل قاتلوں کی ایک جماعت تھی جو ہمیشہ اپنے شکار کی تاک میں رہتی تھی ان لوگوں کی سیرت کا اندازہ کرتے وقت ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انھوں نے نہایت ہی وحشیانہ ظلم و تعدی سے مجبور ہو کر اس خوں ریز تعصب کا انتقام لیا۔ مذہبی اغراض کے لئے قتل و خون ناقابل اعتراض سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ کل سامی نسل میں یہ جائز قرار دیا گیا تھا۔ سولھویں صدی کے نصف آخر تک پاپائے روا سینٹ بارتھولومیو کے وحشت ناک قتل کو بھی روا رکھتا تھا یہ ایک بالکل جدید تصور ہے کہ ایسا قتل و خون خواہ وہ مذہبی جوش کے تحت ہی کیوں نہ سرزد ہوا ہو پھر بھی ایک جرم ہی اور انصاف کا اقتضا یہ ہے کہ قدیم اقوام کو ہم اپنے معیار خطا و صواب سے نہ جانچیں۔ ایک زبردست مذہبی تحریک جس نے ایک عظیم الشان سلطنت کی عمارت کی بنیادوں کو ہلا دیا ہو اور جو ظلم و تعدی، کذب و بہتان، ملامت و سرزنش کے سخت امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر چکی ہو اور علم و حکمت کی صدیوں علمبردار رہی ہو وہ ایک سیاسی سازش کی کمزور بنیاد پر جس کی نوعیت بالکل مقامی

و عارضی بھی کلیتہً انحصار نہیں کر سکتی۔ اسماعیلیت، باوجودیکہ اس کی ابتدائی قوت مٹ چکی ہے پھر بھی وہ ہندوستان، ایران، وسط ایشیا شام اور افریقیہ کے کثیر التعداد افراد کے اخلاقی نصب العین پر حکمراں ہے ایرانی فکر کے آخری مظہر یعنے بابی مذہب کی نوعیت بھی دراصل اسماعیلی ہے۔

اب ہم اس فرقہ کے فلسفہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اس نے مابعد کے عقلئین سے الوہیت کا تصور مستعار لیا اور یہ تعلیم دی کہ خدا یا انتہائی ہستی اعراض سے معرا ہے اس کی فطرت میں کسی محمول کو دخل نہیں۔ جب ہم اس پر قوت کی صفت کو محمول کرتے ہیں تو ہمارا مفہوم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ (خدا) قوت عطا کرنے والی ہستی ہے۔ جب ہم اس کو ازلیت سے متصف کرتے ہیں تو ہم اس چیز کی ازلیت کو ظاہر کرتے ہیں جس کو قرآن نے "امر" (کلام الٰہی) سے تعبیر کیا ہے جو "خلق" سے بالکل متاثر ہے۔ اس کی فطرت میں تمام مناقضات معدوم ہوجاتے ہیں اور اسی سے تمام متخالفات صادر ہوتے ہیں۔ پس انھوں نے خیال کیا کہ وہ مسئلہ جس نے زرتشت اور اس کے پیروؤں کو پریشان کر رکھا تھا اُن سے حل ہوگیا۔

اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ کثرت کیا ہے؟ اسماعیلیہ اس مابعد الطبیعی اصول موضوعہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں کہ "ایک سے صرف ایک ہی پیدا ہو سکتا ہے" لیکن یہ ایک اُس چیز سے بالکل مختلف نہیں ہے جس سے یہ پیدا ہوا ہے یہ دراصل ہستی اولی ہی ہے جو متبدل ہوگئی ہے لہذا وحدت اولی نے اپنے آپ کو عقل اول (عالمگیر عقل) میں متبدل کر دیا اور اپنی اس تبدیلی سے عالمگیر روح کو پیدا کیا اور اس روح نے اپنے اصلی مبدا سے کامل مماثلت پیدا کرنے کے لئے حرکت کی ضرورت محسوس کی اور اسی وجہ سے ایک ایسا جسم درکار ہوا جس میں حرکت کی قوت ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے روح نے افلاک کو پیدا کیا جو اسکی ہدایت کے مطابق حرکت دوری میں ہیں اس نے عناصر کو بھی پیدا کیا جن کے باہمی امتزاج سے عالم مرئی نے تکمیل پائی۔ یہ گویا کثرت و تعدد کا ایک منظر ہے جس میں سے گزر کر روح اپنے اصلی ماخذ کی طرف واپس جاتی ہے۔ انفرادی روح کل کائنات کا خلاصہ ہے جو محض اس کی تربیت کے لئے وجود میں آئی ہے۔ عالمگیر روح وقتاً فوقتاً امام کی شخصیت میں حلول کر جاتی ہے اور امام روح کو اس کے تجربے و فہم کی مناسبت سے اُس کو روشن کر دیتا ہے اور کثرت و تعدد کے منظر سے بتدریج اس کی رہنمائی وحدت ازلی کے عالم کی طرف کرتا ہے۔ جب عالمگیر روح اپنی منزل مقصود کو پہنچ جاتی ہے یا اپنی ہستی کی طرف واپس آجاتی ہے تو عمل انہدام شروع ہوجاتا ہے "وہ ذرات جن سے

عالم تشکیل پاتا ہے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ نیکی کے ذرات حق (خدا) کی طرف جو وحدت کو متمثل کرتا ہے اور بدی کے ذرات باطل (شیطان) کی طرف جو تعدد کو متمثل کرتا ہے چلے جاتے ہیں"
یہ اسماعیلی فلسفہ کا ایک اجمال ہے بقول شہرستانی کے یہ فلسفیانہ اور رمانوی تصورات کا ایک مرکب تھے ارتیابیت کی خوابیدہ روح کو بیدار کر کے انھوں نے مبتدیوں کو اس فلسفے کے جرعے نوش کرائے اور بالآخر ان کو روحانی آزادی کے اس زینہ تک لے گئے جہاں مذہبی رسوم مٹ جاتے ہیں اور تحکمانہ مذہب کا آخر دروغ بافیوں کا ایک منضبط و مرتب مجموعہ نظر آتا ہے۔

اسماعیلیوں کا نظریہ اس امر کی سب سے پہلی کوشش تھی کہ مروجہ فلسفہ کو ایرانیوں کے اصلی تصور کائنات سے ملا کر اسلام کو اسکی روشنی میں پیش کیا جائے اور قرآن کی تمثیلی تفسیر کی جائے یہ وہ طریقہ تھا جس کو تصوف نے بعد میں اختیار کیا۔ ان کے نزدیک زرتشتیوں کا اہرمن (شیطان) اشیاء خبیثہ کا خالق نہیں بلکہ یہ ایسی قوت ہے جو وحدت ازلی میں خلل انداز ہوتی ہے اور اس کو کثرت و تعدد میں منقسم کر دیتی ہے۔ اس خیال میں کہ انتہائی ہستی کی ماہیت میں کسی تفریقی قوت کو فرض کرنا چاہئے تاکہ تجربی کثرت و تعدد کی توجیہ ہو سکے۔ مزید تغیرات ہوئے یہاں تک کہ چودھویں صدی میں حروفی فرقہ (جو اسماعیلیہ ہی کی ایک شاخ تھا) نمودار ہوا جس کے بعد اس خیال کی سرحد ایک طرف تو ہمعصری تصوف سے مل گئی اور دوسری طرف مسیحی تثلیث سے۔ حروفیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ "کن" ازلی کلام الٰہی ہے یہ بذات خود تو غیر مخلوق ہے لیکن مزید تخلیق کا باعث ہوا ہے گویا یہ کلام خارجیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کلام کے بغیر الوہیت کی حقیقت کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ الوہیت حواس یا ادراک کی دسترس سے ماوراء ہے۔ یہ کلام رحم مریم میں آکر جسمانی صورت اختیار کر لیتا ہے تاکہ باپ کو آشکار کرے۔ کل کائنات کلام الٰہی کا مظہر ہے جس میں خدا پوشیدہ ہے۔ کائنات کی ہر ایک آواز خدا ہی کے اندر ہے ہر ایک ذرہ ازلیت کا گیت گا رہا ہے۔ سب کچھ حیات ہے۔ جو لوگ اشیا کی انتہائی حقیقت کو منکشف کرنا چاہتے ہیں ان کو "اسم" سے "مسمٰی" کی تلاش کرنی چاہئے جس میں اس کی ذات ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی۔

سلہ جاودان کبیر ورق ۱۴۹ الف
سلہ جاودان کبیر ورق ۱۴۹ الف
سلہ ایضاً ۳۶۶ ب
سلہ ایضاً ۱۵۵ ب
سلہ " ۳۸۲ ب

(۳)
عقلیت کے خلاف ردِ عمل

اشاعرہ

خاندان عباسیہ کے ابتدائی خلفا کی سرپرستی میں عقلیت اسلامی دنیا کے عقلی مراکز میں پھولتی پھلتی رہی لیکن نویں صدی کے نصف اول میں اس کو ایک زبردست ردعمل سے دوچار ہونا پڑا جس کا پُرجوش سرخیل الاشعری تھا (تاریخ ولادت ۲۶۰ھ)[1] اس نے علمائے عقلیت (معتزلہ) سے تعلیم پاکر خود انہی کے طریقوں سے ان کی اس عظیم الشان عمارت کو منہدم کرنے کی کوشش کی جو بڑی محنت سے تعمیر کی گئی تھی۔ یہ بصرہ کے ایک مکتب اعتزال کے نمائندہ الجبائی کا شاگرد تھا جس کے ساتھ اس نے کئی مناظرے کئے[2] اور بالآخران مناظروں کی وجہ سے ان کے دوستانہ تعلقات منقطع ہو گئے اور شاگرد نے مسلک معتزلہ کو خیرباد کہہ دیا۔ اسپٹا کہتا ہے کہ "یہ واقعہ کہ الاشعری بالکل اپنے زمانہ کی پیداوار تھے اور زمانہ کی رَو اُن کو کامیابی کے ساتھ بہالے گئی ایک ایسا واقعہ ہے جو ایک دوسری حیثیت سے ان کی شخصیت کو ہمارے لئے اہم بنا دیتا ہے۔ ان میں اس دور کے تمام میلانات بین طور پر نمایاں تھے جو سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر سے بہت ہی دلچسپ ہیں"[3]۔ اس شخص کی زندگی میں جو کہ بچپن میں راسخ العقیدہ اور جوانی میں معتزلہ تھا ایک کی طفلانہ بیچارگی اور دوسرے کی خامی ونقص ساتھ ساتھ موجود تھے اور ہم شاید ہی اس قابل ہو سکتے ہیں کہ عقیدۂ راسخ اور اعتزال کی قوت کا توازن کر سکیں فلسفہ اعتزال (یعنی الجاحظ) کلیتاً آزادی کی طرف مائل تھا اور بعض صورتوں میں تو فکر کے سلبی پہلو کی طرف رہنمائی کرتا تھا اس تحریک کا جس کی بنیاد الاشعری نے رکھی تھی یہ مقصد تھا کہ اسلام کو اُن تمام غیر اسلامی عناصر سے پاک کردے جو خاموشی کے ساتھ اس میں داخل ہو گئے تھے اور وہ یہ چاہتی تھی کہ مذہبی شعور اور اسلام کے مذہبی فلسفہ میں توافق پیدا کیا جائے۔ عقلیت ایک کوشش تھی حقیقت کو عقل کے معیار پر جانچنے کی۔ یہ تحریک مذہب اور فلسفہ کی مماثلت کو مستلزم تھی اور اس نے ایمان کو تصورات کی صورت یا فکر خالص کی اصطلاحات میں پیش کرنے کی کوشش کی

---

[1] اقتباسات از ابن عساکر (مہرین) [2] اسپٹا ZUR GESCHICHTE ABUL HASAN AL ASH'ARI صفحہ ۴۱، ۴۲-۴۳ ابن خلکان (گوٹنجن ۱۸۳۹ء) الجبا جہاں ان کے مناظرہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے [3] اسپٹا VORWORT P. XIII

اس نے فطرت انسانی کو نظر انداز کر دیا اور مذہب اسلام کی اصابت میں انتشار پیدا کر دیا اسی لئے اس پر رد عمل ہوا۔

اشاعرہ کی سرگرمی میں راسخ العقیدہ لوگوں نے جو رد عمل کیا اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جدلیاتی طریقے کو الہام ربانی کی سند کی حمایت کے لئے استعمال کیا جائے عقلیین کے مقابلہ میں یہ لوگ صفات باری کے قائل تھے اور آزادی ارادہ کے مسئلہ میں انھوں نے قدیم مکتب کی انتہائی جبریت اور عقلیین کی انتہائی قدرئیت کے مابین ایک درمیانی راستہ اختیار کیا۔ ان کی یہ تعلیم ہے کہ قوت امتیازی اور دیگر افعال انسانی کا خالق خدا ہے اور انسان میں یہ قوت ودیعت ہے کہ وہ افعال کے مختلف طریقے سیکھ سکے لیکن فخر الدین رازی نے "اکتاب" کے تصور کو رد کر دیا اور اپنی تفسیر قرآن میں علی الاعلان جبر کا نظریہ پیش کیا۔ جس وقت رازی نے فلسفہ پر زبردست حملہ کیا تھا۔ طوسی اور قطب الدین نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔

ماتریدیہ ایک دوسرا فرقہ ہے جو عقلی علم الکلام کے خلاف پیدا ہو گیا تھا اس کا بانی ابو منصور ماتریدی ماترد کا باشندہ تھا جو سمرقند کے نواح میں واقع ہے اس فرقہ نے قدیم عقلیین کا نقطۂ نظر اختیار کر کے اشاعرہ کے خلاف یہ تعلیم دی کہ انسان کو اپنے افعال پر پورا اختیار حاصل ہے اور یہ کہ اس کی قوت اس کے افعال کی نوعیت پر اثر ڈالتی ہے۔ الاشعری کی دلچسپی خالص کلامی تھی لیکن یہ ناممکن تھا کہ حقیقت کی انتہائی ماہیت کو نظر انداز کر کے عقل والہام میں توافق پیدا کیا جا سکے۔ اسی لئے باقلانی نے اپنی علم الکلامی تحقیقات میں چند مابعد الطبعی قضایا کو استعمال کیا (جیسے جوہر ایک وحدت انفرادی ہے صفت دوسری صفت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ خلا محال ہے) اور اس طریقہ سے اپنے مکتب کو مابعد الطبعی بنیاد پر قائم کر دیا۔ ہمارا اصل مقصد اسی پر روشنی ڈالنا ہے۔ لہذا ہم اس سے بحث نہیں کریں گے کہ اس نے عقاید راسخ کی کس طرح حمایت کی (جیسے قرآن غیر مخلوق ہے۔ خدا کی رویت ممکن ہے) بلکہ ہم ان کے کلامی مناقشات میں سے مابعد الطبعی تفکر کے عنصر کو علیحدہ کریں گے۔ اپنے زمانہ کے فلاسفہ سے خود انہی کے ہتھیار اور اسلحہ سے مقابلہ کرنے کے لئے ان کے لئے فلسفہ کا سیکھنا ناگزیر تھا۔ لہذا ان کو یہ رضا یا بلا رضا ایک مخصوص نظریہ علم کو موڑ دینا پڑا۔

اشاعرہ کے نزدیک خدا انتہائی واجب الوجود ہستی ہے" جو اپنی صفات کو اپنی ہی ہستی

۵۱۔ شہرستانی مرتبہ کیورٹن صفحہ ۶۹

میں رکھتا ہے[1] اور اس کا وجود اور ماہیت ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ اس استدلال کے علاوہ کہ حرکت "ممکن" ہے انھوں نے ہستی اولیٰ کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے حسب ذیل دلائل استعمال کئے

(۱) ان کا یہ استدلال ہے کہ تمام اجسام جس حد تک کہ اُن کے وجود کے مظاہر کا تعلق ہے ایک ہی ہیں لیکن باوجود اس وحدت کے ان کی صفات ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متخالف ہیں لہذا ہم ایک انتہائی علت کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں تاکہ اجسام کے تجربی تخالف وتباین کی توجیہ ہوسکے

(۲) ہر ہستی ممکن کے لئے ایک علت کی ضرورت ہے تاکہ اس کے وجود کی توجیہ ہوسکے۔ کائنات ممکن ہے اس لئے اس کی ایک علت ہونی چاہئے اور یہ علت خدا ہے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل طریقہ سے یہ ثابت کیا کہ کائنات ممکن ہے۔ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ یا تو جوہر ہے یا عرض عرض یا صفت کا ممکن ہونا تو ایک بدیہی امر ہے اور جوہر کا ممکن ہونا اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی جوہر اعراض سے علیحدہ موجود نہیں رہ سکتا۔ عرض کا ممکن ہونا جوہر کے ممکن ہونے کو مستلزم ہے ورنہ جوہر کی ازلیت عرض کی ازلیت کو متلزم ہوگی۔ اس استدلال کی قیمت کا پوری طرح اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشاعرہ کے نظریہ علم کو پہلے سمجھ لیا جائے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ شئے کیا ہے انھوں نے ارسطو کے مقولات فکر پر تنقیدی نظر ڈالی اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اجسام کی ذات[2] میں کوئی خواص نہیں ہیں۔ اجسام کی صفات ثانویہ اور صفات اولیہ میں انھوں نے کوئی امتیاز نہیں کیا بلکہ ان سب کو ذہنی علائق میں تحویل کردیا۔ صفت بھی ان کے نزدیک محض ایک عارضہ ہے جس کے بغیر جوہر موجود نہیں رہ سکتا۔ ان کے جوہر یا سالمہ کے لفظ میں خارجیت کا ایک مبہم سا مفہوم پایا جاتا ہے۔ تخلیق ربانی کے تصور کی حمایت کرنے کی مقدس خواہش سے متاثر ہوکر انھوں نے جو تنقید کی ہے وہ کائنات کو بار کلے کی طرح منضبط ذہنیات میں تحویل کردیتی ہے اس کی توجیہ وہ ارادہ الٰہیہ سے کرتے ہیں۔ علم انسانی کی تحقیق میں کانٹ "شئی بذات خود" کے تصور تک پہنچکر رک جاتا ہے لیکن اشاعرہ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور اپنے زمانہ کی لاادری حقیقت کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ اس نام نہاد پوشیدہ جوہر کا وجود محض اس حد تک ہے جس حد تک کہ ذہن سے اس کو کوئی نسبت ہوسکتی ہے۔ لہذا ان کی سالمیت لوٹزے[3] سے قریب ہوجاتی ہے جس نے خارجی حقیقت کو

---

[1] (MARTIN SCHRCINER) [2] میکڈونلڈ نے اشاعرہ کی مابعد الطبیعیات کا دلچسپ بیان پیش کیا ہے "مسلمانوں کا علم الکلام" صفحہ ۲۰۱ [2] دیکھو مولانا شبلی کی علم الکلام صفحہ ۷۰ تا ۷۲۔ [3] لوٹزے سالمہ ہے لیکن وہ خود سالمات کو مادی نہیں سمجھتا کیونکہ امتداد کی

برقرار رکھنے کی خواہش کے باوجود اس کی تحویل کلیتہً تصوریت میں کردی۔ لیکن لوٹزے کی طرح وہ سالمات کو لامحدود ہستی اولیٰ کا باطنی عمل نہ سمجھ سکے۔ ان کو توحید خالص سے بہت ہی شدید دلچسپی تھی۔ مادہ کی انھوں نے جو تحلیل کی ہے اس کا لازمی نتیجہ ایسی مکمل تصوریت ہے جیسی کہ بارکلے نے پیش کی تھی لیکن شاید ان کی جبلی حقیقت سالماتی روایات کی قوت سے متحد ہو کر ان کو سالمہ کا لفظ استعمال کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے انھوں نے یہ کوشش کی تھی کہ تصوریت کو حقیقت کے رنگ میں پیش کریں۔ حکمائے علم الکلام کے اثرات سے وہ فلسفہ پر تنقیدی نظر ڈالنے پر مجبور تھے۔ اس تنقید نے ان میں فلسفیانہ مذاق پیدا کر دیا اور انھوں نے خود اپنی ایک مابعد الطبعیات علیحدہ تیار کر لی۔

لیکن اشاعرہ کی مابعد الطبعیات کا بہت ہی اہم اور فلسفیانہ حیثیت سے بہت ہی معنی خیز پہلو وہ نقطۂ نظر ہے جو انھوں نے قانون تعلیل کے متعلق اختیار کیا تھا۔ جس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خدا باوجود غیر ممتد ہونے کے پھر بھی دکھائی دے سکتا ہے۔ عقلیین کے خلاف علم مناظر و مرایا کے اصول کی تردید کی تھی اسی طرح امکان معجزات کو ثابت کرنے کے لئے وہ تعلیل کے تصور کو مسترد کر دیتے ہیں۔ راسخ العقیدہ لوگ معجزات اور نیز عالمگیر قانون تعلیل پر اعتقاد رکھتے تھے لیکن انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ معجزات کے ظہور کے وقت خدا اس قانون کے عمل کو معطل کر دیتا ہے۔ بہر صورت اشاعرہ اس مفروضہ سے شروع کر کے کہ علت و معلول کو ایک دوسرے کے مماثل ہونا چاہئے۔ راسخ العقیدہ لوگوں کے ہم خیال نہ بن سکے۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ قوت کا تصور بے معنیٰ ہے اور یہ کہ ہم کو صرف گریز یا ارتسامات کے سوا جنکی ترتیب کو خدا متعین کرتا ہے اور کسی چیز کا علم نہیں۔

اگر ہم الغزالی (المتوفی سنہ ۱۱۱۱ء) کے کارناموں کو نظر انداز کر دیں تو اشاعرہ کی مابعد الطبعیات کا ذکر بالکل نامکمل رہ جائے گا۔ غزالی کے متعلق اکثر راسخ العقیدہ متکلمین کو غلط فہمی ہوئی ہے لیکن ان کا شمار ہمیشہ اسلام کی عظیم الشان شخصیتوں میں ہوگا۔ اس متشکک نے جنکی قابلیت نہایت

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) تھیں چیدہ دوسری جیسی صفات کی طرح سالمات کے متلازم عمل و اثر سے کیجائی ہے لہذا وہ خود اس صفت کے حامل نہیں ہو سکتے۔ حیات اور دیگر بجز نہی صفات کی طرح امتداد کا حسّی واقعہ بھی تقاطع قوت کے اشتراک عمل کا نتیجہ ہے جنکو لامحدود ہستی اولیٰ کے باطنی عمل کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہئے۔ ہوفڈنگ جلد دوم صفحہ ۱۵ ؎ مولانا شبلی "علم الکلام" صفحہ ۲۰ تا ۲۱۔

زبردست تھی اپنے فلسفیانہ اسلوب میں ڈیکارٹ[1] کی پیش بینی کی تھی۔ ہیوم نے علیت کی گرہ کو جدلیات[2] کی دھار سے کاٹ دیا تھا لیکن غزالی اس سے بھی پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ کا ایک باضابطہ رد لکھا اور راسخ العقیدہ لوگوں پر عقلیت کا جو رعب چھا گیا تھا اس کو کامل طور پر زایل کر دیا۔ انہی کا یہ خاص اثر تھا کہ لوگ تحکمی عقاید کے ساتھ ساتھ مابعد الطبعیات کا مطالعہ کرتے تھے اور اس سے ایک ایسا نظام تعلیم وجود میں آ گیا جس سے شہرستانی، الرازی، اور الاشراقی جیسے مفکرین پیدا ہوئے حسب ذیل عبارت سے واضح ہو جائے گا کہ بہ حیثیت ایک مفکر کے ان کا نقطۂ نظر کیا ہے۔

"میں اپنے بچپن ہی سے اشیا پر بطور خود غور و فکر کرنے کی طرف مائل تھا۔ اس میلان کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے سند کے خلاف بغاوت کی اور اُن تمام عقاید کی ابتدائی اہمیت زایل ہو گئی جو لڑکپن ہی سے میرے ذہن میں راسخ ہو گئے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ ایسے عقاید جو محض سند پر مبنی ہوں یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے پیروئین میں بھی پائے جاتے ہیں۔ حقیقی علم کا فرض ہے کہ تمام شکوک کی بیخ کنی کردے مثلاً یہ بالکل بدیہی ہے کہ دس تین سے بڑا عدد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف ثابت کرنا چاہے اور اس کی تائید میں ایک لاٹھی کو سانپ بنا دے تو یہ فعل محیر العقول ضرور ہوگا۔ لیکن اس سے زیر بحث قضیہ کے متعلق ذرہ بھر بھی تیقن پیدا نہ ہوگا۔"[3] اس کے بعد انھوں نے علم الیقین کے تمام دعویداروں کا امتحان لیا اور بالآخر تصوف میں اس (علم الیقین) کو پا لیا۔

اشاعرہ جو توحید کے زبردست حامی تھے ماہیت جوہر کے اس تخیل کے ساتھ روح انسانی کی ماہیت پر محفوظ طریقے سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ صرف الغزالی نے سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کو اٹھایا اور صحت کے ساتھ یہ بیان کرنا آج تک دشوار ہے کہ ماہیت خدا کے متعلق ان کا کیا خیال ہے جرمنی کے بوزنگر اور سول گر کی طرح ان میں بھی صوفیانہ وحدت الوجود اور اشاعرہ کا عقیدۂ شخصیت گھل مل گیا ہے۔ یہ ایسا امتزاج ہے کہ اس کی وجہ سے یہ بتلانا نہایت دشوار ہے کہ یہ محض وحدت الوجو

---

[1] الغزالی کی تصنیف "احیاء علوم الدین" ڈیکارٹ کی "ڈسکورس آن میتھڈ" سے ایسی عجیب و غریب مشابہت رکھتی ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں اس کا کوئی ترجمہ موجود ہوتا تو ہر شخص اس پر سرقہ کا الزام لگاتا (لیویس "تاریخ فلسفہ جلد دوم صفحہ ۵۰")

[2]

[3] المنقد صفحہ ۳

کے قائل ہیں یا لوٹزے کی طرح شخصی وحدت الوجود کو مانتے ہیں۔ الغزالی کے خیال کے مطابق روح اشیاء کا ادراک کرتی ہے۔ لیکن ادراک بہ حیثیت ایک عرض کے صرف ایسے جوہر یا ذات میں قائم رہ سکتا ہے جو جسمانی صفات سے کلیتہً پاک ہو اپنی کتاب "المضنون"[1] میں وہ تصریح کرتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے ماہیت روح کو ظاہر کرنے سے کیوں انکار کیا تھا وہ کہتے ہیں کہ آدمیوں کی دو قسمیں ہیں۔ عوام اور منکرین اول الذکر جو مادیت کو وجود کی ایک شرط سمجھتے ہیں وہ غیر مادی جوہر کا تعقل کرنے سے قاصر ہیں اور آخر الذکر اپنی منطق کے ذریعہ سے روح کا ایسا تصور قایم کرتے ہیں جو خدا اور انفرادی روح کے باہمی فرق کو بالکل مٹا دیتا ہے۔ الغزالی نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی تحقیقات کا رُخ وحدت الوجود کی طرف ہے اور اس وجہ سے روح کی انتہائی ماہیت کے بارے میں انھوں نے خاموشی اختیار کی۔

انکا شمار بھی عموماً اشاعرہ میں کیا جاتا ہے۔ گو انھوں نے یہ تسلیم کیا تھا کہ اشاعرہ کا طریقہ فکر عوام کے لئے بہتر ہے پھر بھی صحیح معنوں میں یہ اشاعرہ نہیں ہیں۔ مولانا شبلی (علم الکلام صفحہ ۶۹) کہتے ہیں کہ "ان کا یہ خیال تھا کہ مذہب کا راز افشا نہیں کیا جا سکتا اور اس وجہ سے انھوں نے اشاعرہ کے علم الکلام کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا حصہ لیا۔ لیکن اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت کی کہ وہ ان کے نتائج فکر کو شائع نہ کریں" اشاعرہ کے علم الکلام کی نسبت ایسا نقطۂ نظر اختیار کرنا اور ہمیشہ فلسفیانہ زبان کا استعمال ہم میں ایک شبہ پیدا کر دیتا ہے۔ ابن جوزی، قاضی عیاض، اور راسخ العقیدہ مکتب کے متکلمین نے ان کو علی الاعلان ملحد کا لقب دیا تھا اور عیاض نے تو یہاں تک حکم دیدیا کہ ان کی تمام فلسفہ و کلام کی تصانیف جو اسپین میں موجود تھیں ضائع کر دی جائیں۔

لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ عقلیت کی منطق نے خدا کی شخصیت کے تصور کو منہدم کر دیا اور الوہیت کو ایک ناقابل تحدید کلیہ میں تحویل کر دیا۔ لیکن عقلیت کے خلاف جو تحریک شروع ہوی تھی اس نے شخصیت کے عقیدہ کو تو برقرار رکھا لیکن فطرت کی خارجی حقیقت کے تصور کو مٹا دیا۔ نظام نے "خارجیت سالمات" کا نظریہ پیش کیا تھا اس کے باوجود عقلیین کے ہاں سالمہ ایک مستقل اور خارجی حقیقت[2] رکھتا ہے اور اشاعرہ کے نزدیک اس کو ارادۂ الٰہی کے ایک گزرتے ہوئے لمحہ کی حیثیت دی گئی ہے۔ یہاں میں

---

[1] الغزالی کے نظریہ روح پر سرسید احمد خاں کی تنقید ملاحظہ ہو الغزالی ص۳ مطبوعہ آگرہ ۱۲

[2] ابن حزم جلد پنجم ص ۹۲ و ۹۳ جہاں مصنف نے اس نظریہ کو بیان کر کے اس پر تنقید کی ہے ۱۲۔

ایک تو فطرت کی حمایت میں علم الکلام کے تصور سے خدا کا ابطال کرنا چاہتا ہے اور دوسرا خدا کے مذہبی تصور کی تائید میں فطرت کو قربان کر دیتا ہے۔ لیکن ایک صوفی جو خدا کی محبت میں سرشار ہے اور اپنے زمانہ کے کلامی مناقشوں سے اپنے آپ کو الگ رکھتا ہے، وہ ہستی کے دونوں پہلوؤں کی تائید کرتا، ان پر روحانی رنگ چڑھا دیتا اور کل کائنات کو خدا ہی کی جلوہ آرائی خیال کرتا ہے یہ ایسا اعلیٰ ترین تصور ہے جو اوپر کے تصورات کے متخالف اطراف کو ملا دیتا ہے۔ عقلیت جس کو صوفیا نے "پائے چوبین" سے تعبیر کیا ہے وہ آخری مرتبہ الغزالی میں رونما ہوتی ہے جن کی بے چین روح نے عقلیت کے سنسان ریگ زار میں ایک مدت تک بھٹکنے کے بعد جذبات انسانی کی گہرائیوں میں سکون پایا۔ ان کی ارتیابیت کا مطمح نظر یہ تھا کہ ایک اعلیٰ مبدأ علم کی ضرورت کو ثابت کیا جائے نہ کہ محض اسلامی علم الکلام کے عقاید کی حمایت۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے تمام تفکری میلانات پر تصوف کو فتح حاصل ہوئی۔

الغزالی نے اپنے ملک فلسفہ میں جو کچھ اضافہ کیا ہے اس کا پتہ ان کی چھوٹی سی کتاب "مشکوٰۃ الانوار"[1] سے چل سکتا ہے جس میں وہ قرآن کی اس آیت سے اللہ نور السمٰوات والارض (خدا آسمان وزمین کا نور ہے) بحث کو شروع کر کے جبلی طور پر ایرانی تصور کی طرف رجوع ہو گئے جس کے زبردست شارح الاشراقی گزرے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی یہ تعلیم ہے کہ حقیقی وجود صرف نور ہی ہے اور عدم سے بڑھ کر کوئی ظلمت نہیں لیکن نور کی حقیقت یا اقتضا ظہور ہے" نور ظہور کی صفت سے متصف ہے" جو ایک نسبت[2] ہے۔ کائنات ظلمت سے خلق کی گئی ہے جس پر خدا نے خود اپنا نور ڈالا ہے اس کے مختلف حصے کم یا زیادہ مرئی اس لئے ہیں کہ ان پر کم یا زیادہ روشنی پڑی ہے جس طرح اجسام تاریک، مبہم یا منور ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی فرق واختلاف ہے بعض ایسے لوگ ہیں جو دوسری انسانی ہستیوں پر اپنی روشنی ڈالتے ہیں اور اسی لئے قرآن میں پیغمبر کو شمع منور کہا گیا ہے۔

مادی آنکھ ہستی مطلق یا نور حقیقی کے صرف خارجی مظہر کو دیکھ سکتی ہے۔ انسان کے دل میں ایک باطنی آنکھ بھی ہے جو برخلاف مادی آنکھ کے اپنے آپ کو بھی اسی طرح دیکھ سکتی ہے جس طرح کہ

---

[1] مشکوٰۃ الانوار ورق ۳۔ الف

[2] اس خیال کی تائید میں الغزالی ایک حدیث پیش کرتے ہیں (مشکوٰۃ الانوار)

دوسری اشیاء کو۔ یہ ایسی آنکھ ہے جو محدود سے آگے بڑھ کر مظاہر کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ یہ خیالات محض جراثیم تھے جو الاشراقی کے فلسفہ اشراق یا "حکمت اشراق" میں نشو ونما پا کر بار آور ہوئے۔ اشاعرہ کے فلسفہ کا یہ ماحصل تھا۔

اس ردعمل کا ایک کلامی نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اُس آزاد خیالی کے نشو ونما کو روک دیا جو مذہب اصابت کو منہدم کرنے کی طرف مائل تھا۔ ہم کو زیادہ تر اشاعرہ کے طریقۂ فکر کے خالص عقلی نتائج سے سروکار ہے اور یہ خاص طور پر دو ہیں ۔

دسویں صدی کے آغاز میں جبکہ اشاعرہ نے عقلیت کی عمارت کو کلیتہً منہدم کر دیا تھا ہم کو ایک ایسے میلان کا پتہ چلتا ہے جس کو ہم ایجابیت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ البیرونی[1] (المتوفی ۱۰۴۸ء) اور ابن ہیثم[2] نے عمل اور ردعمل کے درمیان ایک وقفہ کو تسلیم کرکے جدید تجربی نفسیات کی پیش بینی کی تھی۔ اور فوق الحس اشیاء کی ماہیت کی تحقیق سے دست بردار ہو گئے تھے انھوں نے مذہبی امور میں دانشمندانہ سکوت اختیار کیا تھا۔ الاشعری کے نزدیک ایسی چیزوں (فوق الحس) کا وجود تو ممکن تھا۔ لیکن ان کا منطقی جواز ناممکن تھا۔

---

[1] البیرونی نے آریہ بھٹا کے پیروؤں کی حسب ذیل تعلیم کو پسند کرکے ان کی تشریح کی ہے۔ ہمارے لئے صرف انہی چیزوں کا جاننا کافی ہے جو آفتاب کی شعاعوں سے روشن ہو جاتی ہیں اس کے آگے جو کچھ بھی ہے خواہ اس کی وسعت کتنی ہی بڑی ہو۔ ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جن چیزوں تک آفتاب کی شعاعیں نہیں پہونچتیں حواس ان کا ادراک نہیں کرسکتے۔ حواس جن چیزوں کا ادراک نہیں کرسکتے ہم ان کو جان بھی نہیں سکتے۔ اس سے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ البیرونی کا فلسفہ کیا تھا صرف حسی ادراکات سے جن میں عقل ناطق ترتیب وتنظیم پیدا کرتی ہے، علم حاصل ہو سکتا ہے۔

[2] اس کے علاوہ ابن ہیثم کے نزدیک صداقت صرف وہی ہے جو بطور مواد کے ادراک کرنے والے حواس کے آگے پیش ہو اور اس کو فہم حاصل کرتی ہو۔ پس منطقی حیثیت سے صداقت ایک تنظیم یافتہ ادراک ہے۔

(دبوئر کی "فلسفہ اسلام" صفحہ ۱۵۰)

بابِ دکن

نوابِ درگاہ قلی خاں درگاہ

کا

ایک اُردو قصیدہ

شیخ عبدالحمید مولف "شاہ جہاں نامہ" رقم طراز ہے کہ غرہ جمادی الآخر (۱۰۴۸) ہجری کو علی مردان خاں نے شاہ صفی کی نا قدردانی کے باعث قندھار سے ترک ملازمت کرکے خاندان قلی خاں کے ہاتھ عرضداشت ملازمت روانہ کی تھی دربار شاہ جہانی سے خاندان قلی خاں کو خلعت اور ایک ہزار روپے نقد مرحمت ہونے کے علاوہ ان کے ساتھ جو بارہ آدمی رومی تھے انھیں بھی چار ہزار روپے مرحمت ہوے اور علی مردان خاں کو خلعت خاصہ پالکی، عاج، براق طلا سے عزت بخشی گئی۔ ۱۵ رجب سنہ مذکور کو علی مردان خاں نے لاہور میں شرف باریابی حاصل کیا۔ بارگاہ شاہ جہانی نے صوبہ داری کشمیر سے ممتاز فرمایا۔ خاندان قلی خاں بھی انھیں کے ہمراہ نہایت آبرو کے ساتھ بسر کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد علی مردان خاں نے ان کے بیٹے درگاہ قلی خاں کو دربار شاہ جہانی سے منصب و جاگیر سرفراز کرانے کے علاوہ اپنے دولت کدہ کی میر سامانی کی خدمت بھی سپرد کردی۔ علی مردان خاں کے انتقال کے بعد منصب داران متعینہ اورنگ زیب کے ہمراہ یہ دکن آگئے۔ پھر ہندوستان جانے کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے بیٹے نوروز قلی خاں بیجاپور میں قلعہ دار تھے جہاں ان کا انتقال ہوگیا اور ان کے بیٹے خاندان قلی خاں منصب و جاگیر رکھنے کے سوا منصب داران حراست اورنگ آباد کے منتظم تھے، شاہ عالم (خلد منزل) کے عہد میں سنگمیر کی وقائع نگاری اور اس کے محالات کی فوجداری خدمت بھی تھی، اب یہ خاندان لوائے آصفی میں آجاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عنوان کی تحت نواب درگاہ قلی خاں کا حال بھی، حال سے پہلے ان کے خاندان کی اصل معلوم کرلینا ضروری ہے ترک مانان "بوربور" قبیلے سے خاندان قلی خاں کا خاندان ملتا ہے جو اوشان خانان سیاہ خیمہ نواحی مشہد مقدس سے متعلق ہے۔

خاندان قلی خاں اول سے لے کر خاندان قلی خاں دوم تک مسلسل سلسلہ صاف ہو گیا۔ خاندان قلی خاں کے بیٹے نواب درگاہ قلی خاں (دوم) ہیں ان کے دو لڑکے ایک امام قلی خاں، موتمن الدولہ، سالار جنگ۔ جاگیردار برار و خجستہ بنیاد، دوسرے وصی قلی خاں مخاطب بہ درگاہ قلی خاں، جاگیردار برار و خجستہ بنیاد اور ایک دختر بلند اختر جو محمد صفدر خاں غیور جنگ بن شیر جنگ کی حرم محترم، انھیں سے نواب مختار الملک اولی کا ننھیالی سلسلہ منسلک ہوتا ہے، حضرت آصف جاہ اول کے عہد میں نظام آباد (اورنگ آباد) کی تعمیر خاندان قلی خاں دوم ہی کے اہتمام سے سرانجام کو پہنچی۔ ۲۹ رجب (۱۱۲۲) ہجری کو جب کہ خاندان قلی خاں سنگمیر میں تھے یہیں نواب درگاہ قلی خاں (دوم) کی ولادت ہوئی اپنی تاریخ ولادت خود ہی کہی ہے

شد سال ولادتش ز روئے الہام   درگاہ قلی ز خاندان والا

حضرت آصف جاہ اول نے انھیں چودہ سال کی عمر ہی میں جاگیر و منصب سے سرفراز فرما کر بتیس سال کی عمر میں ہمراہی رکاب سعادت کی عزت بخشی اور وقت بوقت عنایات شاہی سے سرفراز فرمایا۔ درگاہ قلی خاں (دوم) بھی اپنے دم واپسیں تک برابر حق نمک ادا کرتے رہے نواب ناصر جنگ "شہید" کے زمانہ میں بھی انھوں نے اعلیٰ خدمات کا امتیاز حاصل کیا اور نواب امیر الممالک صلابت جنگ نے تو اتنا عروج کو پہنچایا تھا کہ شش ہزاری منصب خطاب موتمن الدولہ کے علاوہ اورنگ آباد کی صوبہ داری سے سرفراز فرمایا اور جب نواب آصف جاہ ثانی کا دور دورہ شروع ہوا تو ترقی مدارج میں اور چار چاند لگ گئے، ہفت ہزاری منصب ماہی و مراتب، خطاب موتمن الملک سے سرفراز ہوئے۔

درگاہ قلی خاں نام، درگاہ تخلص، سالار جنگ موتمن الدولہ، موتمن الملک، خاندوراں خطاب، علم و فضل کے لئے حضرت آصف جاہ کی تربیت کافی دلیل، چودہ سال تک صوبہ داری کی خدمت کو انجام دینے کے بعد غرۂ رجب ۱۱۷۹ھ کو معزول ہو گئے۔ ۵ ذی حجہ سنہ مذکور کو اورنگ آباد سے نکل کر نظام آباد آئے جہاں ان کی جاگیر تھی، بحالی صوبہ داری کے اسباب ہو ہی رہے تھے کہ ۸ جمادی الاول ۱۱۸۰ھ کو مرض سرسام سے انتقال ہو گیا، نظام آباد سے لاش اورنگ آباد لا کر انکے والد کے مقبرہ (جانب جنوب بلدہ) میں دفن کی گئی۔ دفن کے وقت ایک عجیب حشر برپا تھا، میر غلام علی ارشد اورنگ آبادی کا تاریخی مصرع ہے کہ:-

اہل عالم سینہ چاک از ماتم سالار جنگ   اور "خدایش بیامرزد" بھی ایک تاریخی فقرہ ہے۔

کسی شاعر نے ایک ہی مصرع میں تاریخ صوری و معنوی لکھی ہے ع "یک ہزار و یکصد و ہشتاد سال"
مرزا افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی اپنے تذکرہ تحفۃ الشعرا (۱۱۶۵) قلمی میں لکھتے ہیں
ان کے والد اجد نے اپنی تمام عمر حضرت آصف جاہ اول کی خدمت گزاری میں بسر کردی نظام آباد
کی سرا جس کا عرف "اجنٹہ" ہے ان ہی کے اعتماد کے بھروسہ پر تیار ہوی اس کے دروازہ پر :-
رب اجعل ھذا البلد امنا تاریخ کندہ ہے۔ ایک دن حضرت آصف جاہ اول نے دریافت فرمایا
"لفظ "خاندان"، جو تمہارے نام پر ہے یہ کس خاندان کا ہی ؟"
درگاہ قلی خاں نے عرض کی :-
"خاندان اہل بیت" !
اس پر نواب آصف جاہ نے ارشاد فرمایا کہ :-
"پھر تو تم "شیعہ" ہوں گے ؟"
چونکہ درگاہ قلی خاں بڑے دانشمند اور مدبر تھے۔ انہوں نے پھر عرض کی کہ :-
"بندہ ہراتی الاصل ہے اور یہاں کے رہنے والے اکثر سنی ہیں" (اقتباسی ترجمہ)
نواب درگاہ قلی خاں (دوم) تعمیر عمارت و آبادی قصبات و دیہات کے بڑے شائق تھے۔ اکثر
عمارات آپ ہی کی یادگار ہیں اورنگ آباد میں جنوبی جانب "باغ دل کشا" مشہور ہے ۱۱۶۹ھ میں
ایک کشادہ حوض بنوایا تھا جس کی تاریخ بھی خود ہی کہی ہے ؎

در جہاں ہر چند گشتم کو بکو	ایں چنیں حوضے ندیدم ہیچ سو
فیض عامش ہست جاری صبح و شام	می برد ہر تشنہ لب مشک و سبو

خواستم سال بنا آمد ندا
می دہد ساقی کوثر آبرو

اور ۱۱۷۰ھ میں باغ دل کشا کی سیرابی کے لئے نہر کھدوائی تھی، نہر کی تاریخ مولانا آزاد بلگرامی نے کہی ہے ؎

خاندوراں میر عالی جاہ	مورد التفات ربانی
نہر آب حیات جاری کرد	خضر آں را کند نگہبانی
کامیاب زلال احسانش	مردم شہری و بیابانی

کرد این نہر را روان در باغ — تازہ شد آب و رنگ بستانی
کند حوض وسیع در بستاں — کہ تواں گفت کوثر ثانی
ایں عمل امتیاز خاص بیافت — از قبول جناب سبحانی
سال تاریخ او طلب کردم — گفت دل: "نہر خاند درانی"
۱۱۸۱ھ

نواب درگاہ قلی خاں (دوم) کی شعر و شاعری[69] کے متعلق شفیق اورنگ آبادی کا بیان ہمعصری کے علاوہ ایک بزمی حیثیت بھی رکھتا ہے چنانچہ وہ اپنے تذکرہ "گل رعنا" (۱۱۸۱ھ) قلمی میں لکھتے ہیں کہ

جناب آزاد مدظلہ العالی کی سفارش پر دو سال سے بندہ کو رفاقت کی عزت حاصل ہے اور ایسا امتیاز قرب کہ جس کا تصور اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا رات میں دو بجے تک حاضری رہتی تھی ہر مہینہ اپنے باغ دل کشا میں دو تین عام مجلسیں بھی کرتے جن میں بڑے لایق و قابل لوگوں کو دعوت دیجاتی تھی اور ہر روز ایک مجلس خاص دولت کدہ پر ہوا کرتی یہ محفلیں کیا ہوتیں گویا اچھی خاصی تربیت گاہیں ہوتی تھیں، ایک دن حضرت آزاد نے خواجہ حافظ کی غزل :-

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را" پر طرح دے کر خود بھی غزل کہی تھی ؎ (آزاد)

صبا پیام رساں آں بہار رعنا را — کہ داد بوئے تو سرمایۂ جنوں ما را

نواب نے بھی غزل فرمائی اور یہ مطلع بدیہی پڑھا ؎

صبا پیام رساں آں جنوں تمنا را — بہار آمد و سرسبز کرد صحرا را

مولف بھی اُس وقت حاضر تھا نواب کے ارشاد پر فکر کی اور یہ مطلع موزوں ہوا۔

فروز جلوۂ او سیل گریۂ ما را — طلوع ماہ کند پیش آب دریا را

نواب بے حد محظوظ ہوے اور بڑی تعریف کی۔ (مفہومی ترجمہ)

ان کے بعض لطائف و ظرائف بھی مشہور ہیں۔ شفیق بعض کی نقل کرتے ہیں

(۱) مولوی شاہ علی صاحب اورنگ آبادی کے صاحبزادے کی شادی کی مجلس میں شہر کے تمام امرا اور مشائخ شریک تھے، اس محفل میں مولانا آزاد بلگرامی، نواب اشجع الدولہ، مولوی شاہ محمود صاحب بھی تھے۔ حسب دستور دلہن کی جانب سے قاضی صاحب کے سامنے وکیل و گواہ مجلس میں آئے

خواجہ دکھو نامی بنات فروش دُلہن کی جانب سے وکالت کر رہے تھے، نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ :۔

ہمیں آج معلوم ہوا کہ آپ بنات فروش ہیں؟"۔

حاضرین مجلس اس لطیفہ سے بہت ہی محظوظ ہوئے کیونکہ بنات پارچہ ریشم کو بھی کہتے ہیں اور "بنت" کی جمع بھی ہے۔

(۲) ایک دن مولوی شاہ علی صاحب نے نواب صاحب سے کہا کہ ہم غیروں کے لیے فقط "دنیا" کی دُعا کرتے ہیں مگر آپ کے لئے تو "دین و دنیا" دونوں کی دُعا چاہتے ہیں، دینی دعا کا محل مسجد اور دنیوی دعا کا مقام بیت الخلا، کیوں کہ یہ مقام قضائے حاجت ہے نواب صاحب نے فرمایا کہ "آپ مسجد میں کتنی مرتبہ جاتے ہیں"؟

"شاہ صاحب نے کہا کہ پانچ وقت"!

(ن) "اور بیت الخلا میں کتنی بار"؟

(ش) "ایک یا دو مرتبہ!"

تو پھر نواب صاحب نے فرمایا کہ :۔

میں جناب الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ حضرت کو پیچش ہو تاکہ آپ بار بار بیت الخلا جائیں اور دنیا کی دعا بہت کریں"۔

شاہ صاحب اور حاضرین قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

(۳) چند نوملازموں کی درخواستیں نواب صاحب کے ملاحظہ میں پیش ہوئیں نواب صاحب ہر ایک شخص کو سامنے بلا کر اس کی حیثیت کے مطابق تنخواہ مقرر کر کے دستخط فرماتے تھے ان میں دو لڑکے کم سن بھی تھے، نواب صاحب نے ایک درخواست پر "بیاموزد" لکھدیا اور دوسرے کی درخواست پر لفظ "دیگر" یہ دونوں لڑکے لچھمی نارائن (شفیق) پیش کار کے پاس گئے۔ شفیق نے ان دونوں درخواستوں کے شقے لکھوائے اور نواب صاحب کے ملاحظہ میں دونوں کو پیش کیا نواب صاحب نے شفیق سے فرمایا :۔ کل یہ دونوں منظور ہو چکے۔"

شفیق نے عرض کی کہ جس کی فرد پر "بیاموزد" تحریر تھا وہ آج سیکھ کر آیا ہے۔ اور جس دیگر فرد پر

"دیگر" ہے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ "دیگر" سے وقت مراد ہے۔ یا کوئی دوسرا شخص؟
نواب صاحب نے شفیق کی اس تقریر پر مسکرا دیا۔ اور دونوں کو نوکر رکھ لیا۔

(۴) درگاہ قلی خاں (دوم) حضرت آصف جاہ اول کے سفر دلی میں ہم رکاب سعادت تھے۔ دربار میں نادر شاہ نے محمد شاہ سے کہا کہ ہم "کل جائیں گے"

درگاہ قلی خاں (دوم) نے آہستہ سے حضرت آصف جاہ کے کان میں کہا کہ "النادر کالمعدوم"
حضرت آصف جاہ ان کے اس لطیفہ نادرسے بہت خوش ہوئے"

نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کی شاعری کے سلسلہ میں تحفۃ الشعرا، بے نظیر، خزانہ عامرہ، گل رعنا، تذکرہ تمنا، شعرائے دکن، پیش نظر ہے لیکن ان تذکروں میں تحفۃ الشعرا گل رعنا اور تذکرہ تمنا ہی سے ان کی اردو شاعری کا کھوج لگ سکتا ہے اور ان میں بھی ایک "تذکرہ تمنا" ہی ایسا تذکرہ ہے جس میں اردو کے دو شعر مل سکتے ہیں۔ شفیق سے بڑی حیرت ہے کہ وہ گل رعنا میں باوجود یہ لکھنے کے کہ۔
"ہندی زبان میں مرثیے خوب کہتے تھے"؛ اپنے مشہور تذکرہ اردو گو "چمنستان شعرا" میں ان کا ذکر نہیں کرتے درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کے حالات ان تذکروں سے جو جمع ہو سکتے تھے وہ خلاصتہً اس میں آگئے ہیں ان کا ایک سفرنامہ میری نظر سے مدت ہوئی کہ گذرا تھا افسوس ہے کہ اب پیش نظر نہیں ورنہ ممکن تھا کہ اس کے مطالعہ سے کچھ مدد مل جاتی۔ ان کی فارسی شاعری کی عظمت تو ان تذکروں سے معلوم ہو جاتی ہے مگر ان کی اردو شاعری کا درجہ بغیر کسی نمونہ کے معلوم کرنا ذرا مشکل ہے صرف اس وقت تک یہی ایک قصیدہ ملا ہے جس سے ان کی اردو شاعری کی نسبت رائے قائم کرنی پڑے گی اردو شاعری پر غور کرنے سے پہلے ان کی فارسی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہئے اور اس سے بھی پہلے مولف "بے نظیر" (۲،۱۱) کا ایک تواردی لطیفہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں جو درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کے حال میں لکھا ہے کہ:۔
آزاد بلگرامی نے یہ نقل بیان کی کہ ان کے قیام سندھ کے زمانہ میں ایک شخص کی شادی ہوئی جس کی انھوں نے تاریخ کہی تھی:۔
"مبارک باشد و باشد مبارک"
تاریخی مصرع ہے جب آزاد سندھ سے ہندوستان آئے اور پھر ۱۱۵۰ھ میں حج کی غرض سے

سورت پہنچے تو یہاں محمد حسین بیخود کو بھی ایک شادی کی تقریب میں یہی مادۂ تاریخ ہاتھ آیا تھا جسے بیخود نے آزاد کو سنایا، سورت سے حج کو جانے کے لئے آزاد دکن چلے اور اورنگ آباد آئے۔ نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کی یہاں ایک رات شعرا کی مجلس تھی۔ جس میں شعرا نے اپنے مختلف کلام کے نمونے سنائے ان میں درگاہ قلی خاں درگاہ نے ایک تولد کی تاریخ سنائی جس کا مصرع بھی یہی تھا اور مولود کا نام مبارک علی یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک ہی مصرع کا تین شاعروں میں توارد ہو گیا ایک سندھ میں دوسرا گجرات میں، تیسرا دکن میں، لیکن مولود کا نام "مبارک علی" ہونے کی وجہ سے تاریخ میں زیادہ لطف پیدا ہو گیا (خلاصۂ ترجمہ)

سنہ ۱۱۴۶ھ میں حضرت آصف جاہ اول نے وزارت خاں اورنگ آبادی کو دوبارہ خدمت دیوانی سرفراز فرمایا تو "یاران مجلس وزارت خانی" نے درگاہ قلی خاں درگاہ سے آزمایشی تاریخ لکھوائی، انھوں نے تاریخ کے چاروں مصرع تاریخ وار لکھدیے ہے ؎

شد بحکم تو بزم نورانی ۔۔۔ با مصابیح فضل یزدانی
از برائے صلاح خلق اللہ ۔۔۔ باز رونق گرفت دیوانی

لیکن چوتھے مصرع میں ایک عدد کی زیادتی ہو جاتی ہے فارسی کا رنگ تغزل بہت صاف ہے دیکھئے بعض اشعار میں کیسی برجستگی اور شستگی پائی جاتی ہے ؎

بآغوشش آید آں دل دار او اے چنیں باشد ۔۔۔ خدا اگر راست آرد دولت و جاہے چنیں باشد

ہلاک کشتن مجنوں ہزار سال گذشت ۔۔۔ ہنوز در کفنش بوے سوختن باقیست
رسید تیر نگاہت بدل مشبک شد ۔۔۔ ہزار بخیہ بکردند و دوختن باقیست

نگاہش دیدہ صہبا آفریدند ۔۔۔ قدش دیدند، طوبی آفریدند

دلم را فرقت آں نا مسلماں ساخت سیپارہ ۔۔۔ نمود از ہم جدا اجزائے قرآنی کہ من دارم
کردیم نثار ہجر طاقت ۔۔۔ اے صبر بیا چہ کار کردی

حکم آصف این غزل را آوازہ کرد　　کار ہا را کار فرما می کند

شرک محض است گمان من و تو　　من و تو نیست میان من و تو

رباعی

نوروز کہ روز سعد عشرت افزاست　　مولائے جہاں تخت خلافت آراست
از مقدم گل نماند آثار خزاں　　سالے کہ نکو است از بہارش پیداست

تذکرۂ تمنا میں اردو کے دو شعر "در مرثیہ گوید" کہہ کر لکھے ہیں

پکھراج غم سے زرد، زمرد ہے زہر نوش　　موتی کے دل میں چھید ہے نیلم سیاہ پوش
اس دکھ سے آتش دل یاقوت ہے خموش　　مرجاں لہو و لعل بدخشاں لہو لہو

علی نقی خاں بہادر، المخاطب یاورالدولہ یاور تخلص نے (۱۲۰۵) ہجری میں محبوب شاہ مجوب کے ہاتھ سے شعرائے اردو اور فارسی کے کلام کی ایک "بیاض" لکھوائی تھی۔ اسی بیاض میں نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کا قصیدہ بھی ہے اس کے سوا اور ان کے اردو کلام کا مجھے کہیں پتہ نہیں لگا، اردو شاعری کا تو بارھویں صدی کا نصف آخر شمالی ہند میں خصوصیت کے ساتھ مرزا سودا کی قصیدہ گوئی کی وجہ سے ایک درخشاں باب قرار پاتا ہے نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کے اس قصیدہ کے طرز بیان اور زبان سے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ایک دکنی شاعر کی شاعری شمالی ہند کی اردو شاعری سے کیسے ٹکرا رہی ہے؟ قصیدہ میں قصیدہ گوئی کے آداب کے ساتھ بیان کی روانی اور زبان کی صفائی انصاف پسندوں سے داد لیے بغیر نہیں رہ سکتی قصیدہ کے یہ دو مصرعے تو ایسے ہیں کہ گویا کسی نے سانچے میں ڈھال دیئے:-

(۱) بقر کو جوع شتر، آدمی کو جوع بقر
(۲) خدا نے سیف دیا اور رسول نے دختر

دوسرے مصرع کا پہلا مصرع یہ ہے کہ
سوائے اس کے کہو کون شاہ مرداں ہے؟"
اسی مضمون کو نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ نے فارسی میں بھی ادا کیا ہے ؎
سوائے حیدر کرار شاہ مرداں کیست — کہ ذوالفقار باو داد حق، نبی دختر

قصیدہ کل ترتالیس[۴۳] شعر کا ہے جس میں تین مطلعے ہیں۔ قصیدہ کی پیداوار کوئی جنگی مہم معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اپنی امکانی کوشش کی کہ اس مہم کا حال معلوم ہو جائے لیکن صاف طور پر کچھ معلوم نہ ہو سکا میرا گمان غالب یہ ہے کہ حضرت آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد تخت و تاج کے لیے جو خانہ جنگیاں ہوتی رہیں ان میں کی کسی جنگ کی یہ یادگار ضرور ہے۔ (عمر یافعی)

قصیدہ

پڑی ہے آکے گلے ناگہاں بلائے سفر — سفر نہیں ہے سفر[۱] سفر سے ہے بدتر
زبان خامہ ہے اُس کے بیان میں عاجز — ہے جس کا شمہ کلفت حساب صد دفتر
اسیر پنجۂ تعذیب، صامت و ناطق — غریق لجۂ تخریب ہے گا سب لشکر
نہیں ہے تختۂ بازار پر اناج کی جنس — نہ غلہ بلکہ سبھی نقد و جنس ہے کمتر
گیہوں کہ جنس ہے نایاب مثل آدم خوب — مثال اُن بھی نہیں دیکھتے ہیں اب تو، ر
مگر ذخیرہ کیا ہووے ماش خوروں نے — ہے دال اُن کی رکاکت پہ باکمال ہنر
ہوا ہے قحط سے دیکھو دو باجرا عالم — نہیں ہے ہمت اک جو کسی میں بل کمتر
نظر بچا کے نکلتے نہ ہوویں قرب و جوار — فقیر و سائل و محتاج۔ نوکر و چاکر

---

[۱] نوٹ: دربہ سے بلکہ ۱۲

جوار رحمت حق میں ہوے ہیں کل غربا ۔۔۔ کہیں جوار جوار از رجوع جوع بقر
غنی، فقیر سبھی مبتلا برنج برنج ۔۔۔ دھیان ہوش نہیں ہی کسی میں سب مضطر
نکل گیا ہی غریبوں کا اب پلیتھن سب ۔۔۔ تلاش ڈال اُڑاتے ہیں ڈوڑتے گھر گھر
خراب حال ہوا ہی دواب بیجا سب ۔۔۔ زبون (و) خستہ و مجروح لنگ اور لاغر
ہوا ہی تلی والسی (کا) تیل گھی کی عوض ۔۔۔ بجائے روغن بادام ہیگا تیل کرر
نہ دیکھی خواب میں ہرگز کسی نے ترکاری ۔۔۔ چنے کا ساگ کبھو اور کرڑ رہ کبھو گاجر
ہوا ہی قحط سے سب ذی حیات کو ہوکا ۔۔۔ بقر کو جوع شتر آدمی کو جوع بقر
غرض کہ سخت مصیبت میں سب وضیع و شریف ۔۔۔ غنی، فقیر سبھی احتیاج سیں مضطر
تمام روز کمر بستہ سب غنی و دنی ۔۔۔ ہی زیر بار دواب غریب شام و سحر
علاوہ گولہ توپ و تفنگ و زنبورک ۔۔۔ صدائے بان سے سب کان ہو گئے ہیں کر
ہوا ہی حیف عجب زور نحس قایم جنگ ۔۔۔ نہ فتح ہی نہ ہزیمت چو بازی ششدر
رئیس وقت ہی قائم نفیر در ہمہ وقت ۔۔۔ بسانِ طوطی بے نطق و طائر بے پر
ہوی ہی خلق پہ کیا شاق مرجعیت غیر ۔۔۔ ہزار حیف مسیحا صفت ہی تابع خر
اسی تردد و افکار میں لگی تھی نیند ۔۔۔ کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر
کھڑا ہے آکے سرھانے پہ پیر نورانی ۔۔۔ لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر
کہا: کمال عنایت سے کیا ہی فکر تجھے؟ ۔۔۔ ہی تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
شہ سریر کرامت، امیر، کل امیر ۔۔۔ ولی حضرت مولیٰ وصیٔ پیغمبر

فٹ نوٹ : سہ کرڑ رہ ۱۲

امام جن و ملک تا جدار ملک و ملک کہا ہے "لحمک لحمی" جسے شہِ سرور
اگرچہ حدِ بشر میں ہی منقبت اُس کی ہوا ہے مشرق خاطر سے مطلعِ دیگر

جنابِ اقدسِ حیدر ہے وصف سے برتر
بیانِ وصف سے عاجز لب و دہانِ بشر

نہیں سنا ہے مخالف مگر حدیث صحیح بنی مدینہ علم و علی ہے اُس کا در
نہ ہر کسی نے قدم دوش پر نبی کے رکھا نہ ہر کدام کو مولد ہوا خدا کا گھر
شریک کون ہے روز مباہلہ میں دیکھ! کہا ہے انفسکم حق میں کس کے خیر بشر
کہا ہی کس کو نبی وقت جنگ کے "کرار" کیا ہے کس نے کہو فتح (خندق خیبر)
ہی کس کے حق میں نزول حدیث قدسی کا ہی آفتاب سے نادِ علی منور تر
رفیق کون تھا معراج میں نہ رکھ پردہ سنا ہے قصۂ شیر و برنج و انگشتر
سوائے اس کے کہو کون شاہ مرداں ہے؟ خدا نے سیف دیا اور رسول نے دختر
خدا رسول کی سوگند کھا کے کہتا ہوں بجز خدا و رسول اُس سے کون ہے برتر
ہوا ہے پھر کے میرے مشرق طبیعت سے طلوع مطلع شفاف روشن و انور

ہزار شکر بہ امداد ساقئ کوثر
جمال شاہد مقصود پر پڑی ہے نظر

ہوی ہے طرح آقامت بہ شکل خاطر خواہ ہوئی ہی دفع یکایک سبھی بلائے سفر
گرے نظر سے وہ ہامون (و) جنگل و صحرا (سیاہ و شہرا و عمارت ہوا ہے نو بصیر)

[۱] کرم خوردہ ۱۲

بحق پنجتن پاک و چہاردہ معصوم
خدا ہمیشہ رکھے شہر میں یہ فتح و ظفر
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے
کمینہ بندۂ درگاہِ صاحبِ قمبر
مراد بندۂ درگاہ زود ہے کہ کرے
ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر

غزل

(از جناب صفی اورنگ آبادی)

خیال آپ کا جب ذرا آگیا
تڑپنے میں ہم کو مزا آگیا

اُنھیں ہم سے ملنے کی فرصت کہاں
گیا ایک تو دوسرا آگیا

نہ آنا ہی اُن کا بہت ٹھیک ہی
خیالِ دلِ مبتلا آگیا

خدا کی قسم کھاکے وہ چپ ہوے
خدا کی قسم ہے مزا آگیا

کوئی جھوٹ کی حد بھی؟ ای نامہ بر
ابھی کی ابھی ہیں گیا ہے آگیا

مرے دل میں آنے کو تھی ایک بات
کہ اتنے میں وہ بے وفا آگیا

نہ ہم دوسرے ہیں نہ وہ دوسرے
زمانہ مگر دوسرا آگیا

ابھی ذکر تھا جس کا "یادش بخیر"
وہی آگیا، آگیا، آگیا!

سمجھتا ہوں سب کچھ۔ مگر دوستو
یہ دل ہی۔ جدھر آگیا آگیا

صفی کو بھی اچھا سمجھنے لگے
زمانہ اب ایسا بُرا آگیا

خوداعانتی

(ازجناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے)

(مُسلسل)

سرا برٹ پیل نے جملہ جدید اختراعات اور کاروبار کے جدید طریقوں کی قدر کی۔ مثال کے طور پر ہم پیل کے اس طرز عمل کا ذکر کر سکتے ہیں جو اس نے چھینٹ کی چھپائی میں ([illegible]) کے ایجاد کی غرض سے اختیار کیا تھا یہ کام ایک لئی ([illegible]) کے استعمال سے تکمیل کو پہنچایا گیا کیونکہ پارچہ کے جن حصوں کو سفید رکھنا مقصود ہوتا تھا ان پر یہ لئی لگادی جاتی تھی اس لئی کا محقق لندن کا ایک سیاح تھا جس نے اس کو مسٹر پیل کے ہاتھوں تھوڑی سی قیمت میں فروخت کر ڈالا اس طریقے کو مکمل کرنے اور عملی طور پر کارآمد بنانے کے لئے ایک یا دو سال کے تجربہ کی ضرورت تھی لیکن کام کی نفاست اور تیار شدہ نمونہ کی انتہائی خوبی نے بیوری کے کارخانہ کو فوراً ملک کے تمام چھینٹ چھاپنے والے کارخانوں میں افضل و اعلیٰ بنادیا۔ خاندان کے دیگر ارکان بھی لنکا شائر میں مختلف مقامات پر جدید کارخانے قائم کیے یہ کارخانے صرف مالکوں ہی کے لیے توفیر دولت کا باعث ثابت نہیں ہوے بلکہ اُن سے کیا اس کے تاجروں کے سامنے ایک نظیر قایم ہوگئی اور لنکا شائر کے اکثر کامیاب طباع اور صناعوں کی ان کے ذریعہ تعلیم بھی ہوگئی۔ شعبہ صنعت کے دیگر نامی گرامی بانیوں میں پاتابہ بُننے کی مشن کے موجد ولیم لی اور جالی بننے کی مشن کے موجد جان ہیت کوٹ قابل ذکر ہیں یہ لوگ زبردست صنعتی قابلیت اور حوصلے والے تھے جن کی کوشش سے ناٹھنگم اور اس کے متصلہ اضلاع کی مزدور پیشہ آبادی کے لیے روزگار کا ایک اچھا خاصہ ذریعہ پیدا ہو گیا۔ پاتابہ بُننے کی ایجاد سے متعلق جو واقعات محفوظ ہیں وہ (اگرچیکہ موجد کے نام کے متعلق کوئی شبہ نہیں) بالکل منتشر بلکہ کئی لحاظ سے متضاد ہیں موجد کا نام ولیم لی ہے جس کی ولادت ۱۵۶۳ء میں ناٹھنگم سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر قصبہ وڈبرو میں ہوی بعض روایات یہ ہیں کہ وہ ایک چھوٹی سی جائداد کا وارث تھا لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ وہ ایک غریب طالب علم تھا اور ابتدا ہی سے اس کو مفلسی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لی ۱۵۷۹ء میں جامعہ کیمبرج کے کرائسٹ کالج میں ایک نادار طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اور بعد میں سنٹ جانس کالج میں چلا گیا۔ اور ۱۵۸۲ء میں بی اے کی

ڈگری حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایم اے کی تعلیم ۱۵۸۶ء میں شروع کی۔ لیکن اس واقعہ کے نسبت یونیورسٹی کے یادداشت (Records) میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ خلاف قانون شادی کرنے کی وجہ وہ جامعہ سے خارج کر دیا گیا تھا لیکن یہ غلط ہے کیونکہ کسی وقت وہ رفیق جامعہ (Fellow) نہیں رہا۔

پاتابہ کی مشن کی ایجاد کے موقعہ پر لی ناٹھنگم کے قریب کالورٹن نامی گرجا میں بہ حیثیت منصرم نائب پادری کارگزار تھا اور بعض مصنفین کا بیان ہے کہ اس ایجاد کی ابتدا نا کام محبت سے ہوی۔ کہا جاتا ہے کہ لی قصبہ کی ایک جوان عورت پر عاشق ہو گیا تھا اور جب کبھی لی کو اس کے پاس جانے کا اتفاق ہوتا اُس وقت اس کی معشوقہ عاشق کی گفتگو کی نسبت پاتابہ کی صنعت اور شاگردوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ کیا کرتی تھی۔ باور کیا جاتا ہے کہ اس ادنٰی واقعہ سے اس کے ذہن میں دستی پاتابہ بافی میں تبدیلی پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ اس نے ایک ایسی کل ایجاد کرنے کا مصمم ارادہ کیا جو دستی صنعت پر غالب آکر اس کو ایک غیر سود مند پیشہ بنا دے۔ تین سال کے لئے اس نے خود کو اس کل کی تکمیل کے واسطے وقف کر دیا اور اس نئی دھن میں ہر بات کو ترک کر دیا۔ جب کامیابی کی کچھ توقع نظر آئی تو اس نے ملازمت ترک کر کے خود کو مشن کی پاتابہ بافی کے فن کے لیے وقف کر دیا۔ یہ واقعات ہن سن کی بیان کردہ روایت کا ترجمہ یا خلاصہ ہیں جس کو ہن سن نے ایک ضعیف العمر پاتابہ باف سے سنا تھا جس نے ناٹھنگم کے کالنس نامی شفاخانہ میں ۹۲ سال کی عمر میں انتقال کیا اور بلکہ این کے عہد میں شہر میں بہ حیثیت کارآموز کام کرتا تھا اس واقعہ کو ڈیرنگ اور بلاکر نے بھی بطور روایت بیان کیا ہے۔

پاتابہ کی مشن کی ایجاد کے اصلی واقعات خواہ کچھ ہی ہوں اس کے موجد کی غیر معمولی مکانکی قابلیت کے متعلق کوئی شبہ نہیں۔ ایک دیہاتی پادری کا جس کی زندگی کا زیادہ حصہ کتب بینی میں گذرا ایک نازک اور پیچیدہ حرکت والی کل ایجاد کرنا اور جالی کی بافت کے فن کو ترقی دینا حقیقت میں ایک ایسا حیرت انگیز کارنامہ تھا جو کلوں کی ایجاد کی تاریخ میں عدیم النظیر کہا جا سکتا ہے اس کوشش سے ولیم لی کی قدر بہت بڑھ گئی کیونکہ اس وقت دستی فنون حالت طفولیت میں تھے اور صنعتی کاموں میں کلوں کی ایجاد کے مسئلہ پر اس وقت تک بہت کم توجہ ہوی تھی۔ لی کو ہر ممکنہ کوشش سے اپنی مشن کے اجزا کو ٹھیک کرنے اور موجودہ دشواریوں پر غالب آنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ لی کے اوزار

اور خام پیداوار نامکمل حالت میں تھی اور اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے کوئی ماہر کاریگر بھی نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے پہلے ایک چوبی ڈھانچہ تیار کیا۔ سوئیوں میں سوراخ نہ ہونے سے بخیہ یا سیون میں دقت واقع ہوی لیکن سوئیوں میں ایک برمے سے سوراخ کر کے لی اس دشواری پر بھی غالب آگیا اور آخر کار اس کو تمام دشواریوں پر یکے بعد دیگرے کامیابی کے ساتھ غلبہ حاصل ہوا اور تین سالہ مسلسل محنت کے بعد مشن قابل استعمال اور نہایت مکمل ہوگئی۔ پر جوش ولیم لی جو کسی زمانہ میں نائب پادری رہ چکا تھا اب موضع کالورٹن میں پاتابہ کی بافت کا کام شروع کیا کئی سال اس کا کاروبار جاری رہا جس کے دوران میں اس نے اپنے بھائی اور کئی رشتہ داروں کو بھی اس فن کی تعلیم دی۔

اپنی مشن کو بالکل مکمل کرنے کے بعد لی کو ملکہ الزبت کی سرپرستی حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوی۔ کیونکہ اس زمانہ میں ملکہ کو ریشمی پاتابوں کا بہت شوق تھا۔ کل ملکہ کے روبرو پیش کرنے کی غرض سے لی لندن روانہ ہوا لندن پہنچکر اس نے پہلے کل کو دربار کے کئی ارکان کو دکھایا نیز منجملہ دیگر اشخاص کے سر ولیم ہنس ڈن کو بھی دکھایا اور اس کا چلانا بھی اسے سکھایا۔ ولیم کے توسط سے لی کو ملکہ کا شرف ملاقات حاصل ہوا اور وہ ملکہ کے روبرو کل پر کام کر دکھایا جس قسم کی حوصلہ افزائی کی وہ توقع رکھتا تھا ملکہ نے ویسی حوصلہ افزائی نہیں کی اور کہا جاتا ہے کہ ملکہ نے اس ایجاد کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اس کی وجہ غریب مزدوروں کی ایک کثیر تعداد اپنی دستکاری سے لاچار ہو کر بے روزگار ہو جائے گی۔ لی کو کوئی اور سرپرست حاصل نہیں ہوا اس لئے اس نے یہ خیال کر کے کہ میری کوشش اکارت ہوی اور ایجاد کی تحقیر ہوی۔ ہنری چہارم کے دانا اور قابل وزیر سلی کی اس درخواست کو قبول کر لیا کہ وہ روُن جا کر جو اس زمانہ میں فرانس کا ایک مشہور صنعتی مرکز شمار کیا جاتا تھا۔ شہر کے تمام کاریگروں کو پاتابہ کی مشن کی ساخت اور اس کا استعمال سکھائے۔ چنانچہ لی ۱۶۰۵ء میں مع اپنی کلوں کے فرانس پہونچا اس کے ہمراہ اس کا بھائی اور سات دیگر کاریگر بھی تھے وہاں میں اس کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا ایک اعلیٰ پیمانہ پر پاتابوں کی صنعت جاری ہوگئی اور سات کلیں پوری طرح کام کر رہی تھیں کہ بدقسمتی سے اس پر پھر مصیبت آن پڑی۔ اس کا مربی ہنری چہارم جسکے انعام و اکرام اعزاز و مناصب کے مواعید پر لی کو اعتماد تھا اور جن کی وجہ لی نے فرانس میں سکونت اختیار کی تھی Fanatic Ravaillac کے ہاتھوں قتل ہوا اور اس طرح اب تک لی کی جو سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہو رہی تھی اس کا فوراً خاتمہ ہوگیا۔ عدالت میں اپنے حقوق جتانے کی غرض سے لی پیرس پہنچا لیکن پروٹسٹنٹ اور اجنبی ہونے کی

وجہ سے اس کے نمایندوں کے ساتھ لاپروائی کا برتاو کیا گیا اور اس طرح یہ مشہور موجد اس واقعہ کے چند روز
بعد ہی انتہائی مفلسی اور مصیبت کی حالت میں بہ مقام پیرس راہی ملک عدم ہوا۔
ولیم لی کا بھائی معہ سات کاریگروں کے اپنی کلوں کو لیکر خفیہ طور پر فرانس سے ناٹنگھم بھاگ آیا
جیمس لی ناٹنگھم واپس آیا تو تھاروٹن کا ایشٹن نامی ایک پنسارا جس کو ولیم لی نے اپنے انگلستان سے
روانہ ہونے سے قبل کل کے ذریعہ پاتابہ بننے کا کام سکھا چکا تھا اس کا شریک کار بنا اور دونوں کی شرکت
میں کاریگروں اور کلوں کا ذریعہ تھاروٹن میں پاتابہ بافی کا کام آغاز کیا گیا اور بڑی کامیابی سے
چلتا رہا۔ موقع محل بھی اس کام کے لیے نہایت موزوں تھا کیونکہ شروڈ کے قرب وجوار کے اضلاع میں بکریاں چرانے
والے بھیڑوں سے انھیں ایک لمبے ریشے والی اون دستیاب ہوتی تھی کہا جاتا ہے کہ ایشٹن نے سیسے
کلوں کے ڈھانچے تیار کیے جس سے اس فن میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہوگیا۔ انگلستان کے مختلف
حصوں میں جس قدر کلیں زیر استعمال تھیں انکی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوا اور بالآخر کل کی پاتابہ بافی
قومی صنعت کی ایک ضروری شاخ بن گئی۔
منجملہ دیگر تبدیلیوں کے پاتابہ کی مشن میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوی کہ قور (Lace) کی صنعت
میں بھی اس سے وسیع پیمانے پر کام لیا جاسکتا تھا فراسٹ اور ہاسن نامی دو کاریگر ۱۷۷۸ء میں مشن میں
اضافہ کردہ تبدیلیوں کے ذریعہ Point net کے بنانے میں مشغول تھے اور تقریباً بیس سال کے
عرصہ میں صنعت کی اس شاخ کو اس قدر جلد ترقی ہوی کہ پندرہ سو Point net frames
استعمال ہونے لگے اور پندرہ ہزار سے زاید آدمی برسر روزگار ہوگئے۔ خاک وضعداری کے تغیر اور دیگر وجوہات
کے سبب ناٹنگھم کی قور کی صنعت کو فوراً زوال ہوگیا اور جان ہیت کوٹ کی جالی بننے کی
Bobbinnet machine ایجاد ہونے تک یہ صنعت زوال کی حالت میں رہی۔
لیکن ہیت کوٹ کی ایجاد سے وہ دوبارہ ٹھوس بنیاد پر قایم ہوگئی۔
جان ہیت کوٹ ڈفیلڈ (ڈربی شائر) کے ایک معمولی اور معزز کسان کا سب سے چھوٹا بیٹا
تھا جو ۱۷۸۳ء میں بہ مقام ڈفیلڈ پیدا ہوا۔ جب تک وہ مدرسہ میں تعلیم پاتا رہا اس نے جلد ترقی کی لیکن
اس کا باپ اس کو موبرو کے ایک سانچے بنانے والے کے پاس بہ حیثیت کارآموزہ رکھوانا چاہتا تھا۔
اس لئے وہ جلد مدرسہ سے نکال لیا گیا۔ چالاکی سے وہ بہت جلد اوزاروں کا استعمال سیکھ گیا اور پاتابہ کی

مشن کے پرزوں اور تانے کی پیچیدہ مشن کے متعلق مفصل معلومات حاصل کر لیئے۔ فرصت کے وقت وہ یہ
سونچا کرتا تھا کہ مشن میں جدید اصلاحات کس طرح کیے جائیں اس کے دوست مسٹر بیزنی کا بیان ہے
کہ سولہ سال کی عمر میں جان کے ذہن میں ایک ایسی مشن ایجاد کرنے کا خیال پیدا ہوا جس سے بکھنگم
یا فرانس کی دستی فور کی مانند فور تیار ہو سکے۔ پہلی عملی اصلاح جس میں اسے کامیابی حاصل ہوی وہ تانے کی
مشن میں تھی کیونکہ عمدہ اوزار کے ذریعہ فور کی شکل کے دستانے (MITTS.) ایجاد کرنے میں اس کو کامیابی
ہوی اور اسی کامیابی نے اس کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ مشن کی گوٹہ سازی کی تعلیم جاری رکھے۔ پاتابہ
کی مشن میں تبدیلی کیجا کر اس سے (POINT NET.) فور کی صنعت کا کام لیا جا رہا تھا لیکن یہ کام اطمینان بخش
ثابت نہیں ہوا اس لئے ناٹنگہم کے کئی چالاک دستکار اور صناع ایک نئی طرز کی مشن ایجاد کرنے کی فکر میں
مسلسل کئی سال تک لگے رہے ان میں سے بعض تو حالت مفلسی میں فوت ہو گئے اور بعض دیوانے ہو گئے
اس طرح سب کو تحقیق میں ناکامی ہوی اور تانے کی قدیم مشن ہی حسب حال قایم رہی۔

اکیس سال کی عمر میں ہیت کوٹ ناٹنگہم پہونچا جہاں اس کو فوراً ملازمت مل گئی اور تانے کے
ڈھانچے اور موزے سازی کے کام سے اعلیٰ اجرت ملنے لگی اور اس کی قابلیت ہوشیاری اوضاع واطوار
اور پاکیزہ اصول کی وجہ اس کی بڑی وقعت ہونے لگی اب اس نے اس مضمون کا مطالعہ بھی شروع کر دیا
جس کی جانب اس کا دماغ پہلے ہی متوجہ ہو چکا تھا اور اس طرح ایک جدید کل ایجاد کرنے کی کوشش
شروع کی پہلے اس نے تکیوں کی جھالر بافی کے فن کا مطالعہ کیا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک مشن
کے ذریعہ اس کام کو انجام دیا جائے یہ سخت جانفشانی کا کام تھا جس کے لیے کافی استقلال مہارت اور
قابلیت درکار تھی۔ ہیت کوٹ کے استاد ایلیٹ کا بیان ہے کہ ہیت کوٹ کی طبیعت اس وقت بدرجۂ شدید
متحمل اور نفس کش واقع ہوی تھی اور وہ کم سخن بھی تھا۔ ناکامیوں اور غلطیوں سے وہ کبھی ہراساں نہ ہوا
مشن کی تکمیل کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیے اس کو کامل یقین تھا کہ اس کی محنت کبھی رایگاں نہ جائیگی
بلکہ ضرور ٹھکانے لگے گی۔

(BOBBIN NET MACHINE.) جیسی پیچیدہ کل کی ایجاد کا حال حیطۂ بیان
یا ضبط تحریر میں نہیں آسکتا حقیقت میں وہ فور بنانے کا ایک میکانیکی آلہ تھا جس میں فور سازوں کی انگلیوں
کی حرکت کا کام پرزوں سے لیا گیا تھا دستی ساخت کی جھالر کے ایک ٹکڑے کو پھاڑنے سے ہیت کوٹ

کو معلوم ہو گیا کہ دھاگوں کو طول اور عرض میں جمایا جا سکتا ہے اس نے اپنے تجربات اس طرح شروع کئے
کہ معمولی ڈوریاں ایک قسم کے تانے کے ڈھانچے پر لمبے تان دیئے اور معمولی mreze ہلا کے ذریعہ بانے کے تاروں
کو ان میں سے نکال کر دوسری طرف کے mrezhe phe میں داخل کئے پھر باز دے ان تاروں کو مروڑ کر
حرکت دینے سے تاگے پھر متصلہ ریوں میں واپس جا گرتے تھے اور اس طرح کل کی سی بافت ہوتی تھی
اب ہیت کوٹ کو ایک ایسی کل کی ایجاد کی ضرورت داعی ہوئی جس سے یہ سب کام پورا ہو سکے۔ نیز
اس کی تکمیل کے لئے بڑی دماغی محنت کی ضرورت تھی کئی روز بعد اس نے کہا کہ "جوڑیے (عریض تارو
کو منقسمہ مقام پر مروڑنا ایک ایسی واحد اور زبردست دشواری ہے کہ اس وقت اس کی تکمیل مجھ سے بالکل
ناممکن ہے" اس کے بعد اس نے پتلے دھاتی (DISIS) فراہم کرنا شروع کیا جن کو وہ دھاگوں کو آگے پیچھے کرنے کی
غرض سے بطور سوئیوں کے استعمال کرنا چاہتا تھا ان Dioea کو تانے ہر سد W کے ہر جانب کے
Carrienkramen میں جما کر موزوں مشن سے انھیں حرکت دی گئی جس سے قور کی تیاری میں
دھاگے ایک طرف سے دوسری طرف جا پڑتے تھے۔ بالآخر ہیت کوٹ اپنے اصول کو قابلیت اور ہوشیاری
سے کارآمد بنانے میں کامیاب ہوا اور ۴۳ سال کی عمر میں اس کو مشن کا حق ایجاد حاصل ہو گیا۔

اس مشن کی ایجاد کے زمانہ میں اس کی بیوی کو شوہر کے برابر فکر دامن گیر رہا کرتی تھی کیونکہ جس وقت
ہیت کوٹ مشن کو مکمل کرنے میں مصروف تھا اس کے مشکلات سے وہ بخوبی واقف تھی کئی سال کی محنت کے
بعد ہیت کوٹ کو ان مشکلات پر قابو حاصل ہوا۔ دوران ایجاد میں ایک روز میاں بیوی میں جو گفتگو ہوئی
وہ درج ذیل ہے:-

فکرمند بیوی نے کہا "کیا یہ مشن چل سکتی ہے"؟ اس پر شوہر نے مایوس اور غمگین لہجہ میں جواب دیا کہ
"مشن نہیں چل سکتی۔ مجھے پھر اس کو توڑنا پڑے گا" اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے باوجود بھی ہیت کوٹ
کو کامیابی کی توقع تھی اور وہ نہایت بشاش رہا کرتا تھا لیکن اس کی غریب بیوی اپنے جذبات کو روک
نہ سکی بلکہ رویا کرتی تھی۔ بیوی کو صرف چند ہی ہفتے اور انتظار کرنا پڑا کیونکہ ایک عرصہ دراز کی کوشش کے
بعد ہیت کوٹ کو وہ کامیابی نصیب ہوئی جس کا کہ وہ مستحق تھا اس نے اپنی مشن کی تیار شدہ
سلمہ Bobbin net کا پہلا ٹکڑا بڑے فخر سے بیوی کو دکھایا اُس وقت اس کو جو مسرت حاصل ہوئی اس کا
اندازہ ناممکن ہے۔

دیگر مفید ایجادات کی طرح جن میں کہ اکثر ہوا کرتا ہے ہیت کوٹ کے حق ایجاد کی نسبت لوگ معترض ہوئے۔ حق ایجاد کے مفروضہ عدم جواز کی بنا پر جھالر سازوں نے (BOBBIN NET) مشن کو اختیار کرکے موجد کو مقابلہ کا چیالنج دیا۔ لیکن ہیت کوٹ کی مشن میں خاصی اصلاح ہونے سے جن لوگوں کو حق ایجاد دیا گیا تھا وہ واپس لے لیا گیا اور جب یہ لوگ اپنی کوشش میں ناکام رہے اور باہمی تنازع کی وجہ عدالت میں رجوع ہوئے تو عدالت نے ہرٹ کوٹ کے حقوق تسلیم کیے۔ ہر صناع نے دوسرے کے مقابلہ میں اپنے حق ایجاد کی مداخلت کی نالش کی اس پر جوری نے مدعی علیہ کے موافق فیصلہ کیا اور منصف نے بتلایا کہ ہر دو متدعویہ کلوں سے ہیت کوٹ کے حق ایجاد کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ دوسرا مقدمہ میں سر جان کوپلے جو (جو بعد میں لارڈ لنڈ ہرسٹ کے نام سے موسوم ہوئے) اور جو مسٹر ہٹ کوٹ کی جانب سے وکیل مقرر ہوئے تھے ایجاد زیر بحث کے جملہ تفصیلی واقعات سے وقفیت حاصل کرنے کی غرض سے Bobbin net machine کو چلانا سیکھا۔ خلاصہ مثل پڑھنے کے بعد انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مقدمہ کی اصلیت ان کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن مقدمہ چونکہ ان کی رائے میں نہایت اہم تھا اسلئے انھوں نے بانٹنگھم جا کر مشین کو بالمشافہ معائنہ کا ارادہ ظاہر کیا اور جب انھوں نے مشن کا معائنہ کرکے اس کی ساخت وغیرہ کو اچھی طرح سمجھ لیا تو کہا کہ ”میں تمہاری جانب سے حتی الامکان جواب دہی کروں گا“ چنانچہ وہ اسی شب میل میں سوار ہو کر ناٹنگھم پہونچے۔ لائق وکیل نے کل کا معائنہ شروع کیا اور جب تک خود اپنے ہاتھوں سے Bobbin net کا ایک ٹکڑا تیار نہ کیا اور مشن کے تمام پرزوں اور انکی ساخت کے اصول سے پوری طرح وقفیت حاصل نہ کی وہاں سے واپس نہ ہوئے جس وقت مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو لائق وکیل نے عدالت کے روبرو نہایت آسانی اور عمدگی سے Bobbin net کا ایک نمونہ تیار کر دکھایا اور اس ایجاد کی اصلیت کو اس خوش اسلوبی اور ایسے عمدگی سے بیان کیا کہ منصف جوری اور تمام تماشائی محو حیرت ہو گئے نیز جس کامل دیانت داری اور راستبازی اس نے مقدمہ میں بحث کی اس کا عدالت کے فیصلہ پر خوب اثر پڑا۔

(باقی)

وجہی

مرثیہ گو کی حیثیت سے

از جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب ۔ ام ۔ آر ۔ اے ۔ اس ۔ اف آر ۔ اس اے (لنڈن)

ہاشمی صاحب دکن میں اردو کے مصنف اور مضمون نگار کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ کچھ ہی روز ہوئے کہ آپ لنڈن سے واپس ہوئے ہیں جہاں اردو مخطوطات کے مطالعہ کے لیے گئے ہوئے تھے وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' پر ایک طویل مضمون اس سے پہلے ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری کا مکتبہ میں شایع ہو چکا ہے ہاشمی صاحب کو اس کے کچھ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں جس سے متعلق یہ مختصر مگر ایک حد تک مفید مضمون مکتبہ کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ (مکتبہ)

وجہی کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں رہی اس کی تصانیف میں سب سے پہلے "سب رس" کا پتہ چلا جس پر رسالہ اردو میں مولوی عبدالحق صاحب نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد یورپ کے ذخیرہ سے مثنوی "قطب مشتری" دستیاب ہوی اس کے نام اور مصنف کے متعلق بلوم ہارٹ مصنف کیٹلاگ نے کوئی صراحت نہیں کی تھی اس کے متعلق میں نے رسالہ معارف میں صراحت کی ہے میرے دوست ڈاکٹر مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری نے تفصیل سے اس پر مضمون لکھا ہے جو مکتبہ میں شایع ہوا ہے۔

وجہی کا نام اس کا سنہ پیدایش اور وفات سب تاریکی میں ہیں ہم کو نہیں معلوم اس کا کیا نام تھا؟ وہ کب پیدا ہوا؟ اور کب فوت ہوا؟ مگر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں موجود تھا اور شاعر کی حیثیت سے نامور ہو چکا تھا۔ محمد قلی (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد میں اپنی مثنوی قطب مشتری کی ۱۰۱۸ھ میں تکمیل کی۔ اس میں اس نے ابراہیم قطب شاہ کی اس طرح مدح کی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان کے زمانہ میں موجود تھا اور اپنی مثنوی کی ابتدا کر دی تھی۔

آتا قطب کی مدح کر اختیار	جو رہے یو قیامت تلک یادگار
ابراہیم قطب شاہ راجہ دہراج	شہنشاہ ہے شاہ شاہاں میں آج
عدل بخشش ہور داد اس تے اچھے	سدا خلق سب شاد اس تے اچھے

جتنے پادشاہاں ہیں سینا (ر) کے ‏ ‏ بھکاری ہیں سب اس کے دربار کے
سلیماں تے فاضل ہے اس بخت بل ‏ ‏ پڑے دیو جن سب ہیں اس حکم تل
اسی شاہ عادل کے غصہ تے ڈر ‏ ‏ لیا ہے گگن کوں پون پیٹ پر
تنابل ہے اس عدل کے فن منے ‏ ‏ کہ بجلیاں کھڑیاں کا پتیاں پن منے

وجہی کی دوسری تصنیف سب رس سنہ ۱۰۴۵ھ میں مرتب ہوی ہے اس سے واضح ہوسکتا ہے وہ ۱۰۴۵ھ تک نہ صرف زندہ تھا بلکہ تصنیف کرسکتا تھا اگرچہ خیال ہوسکتا ہے کہ ۱۰۰۹ھ کا شاعر ۱۰۴۵ھ تک کس طرح زندہ رہا مگر یہ کوئی طویل عمر نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر سنہ ۹۸۸ھ میں اس کو پچیس سال کا فرض کیا جائے تو ۱۰۴۵ھ میں (۸۲) سال کی عمر ہوگی جو ناقابل یقین نہیں ہوسکتی اس کے علاوہ بعض دیگر شہادتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ دونوں کا مصنف ایک ہی وجہی ہے۔

(الف) قطب مشتری کا وجہی غواصی کا ہمعصر تھا جس کے ثبوت میں اشعار ذیل پیش کیے جاتے ہیں:

اگر غوطے لک برس غواص کہائے ‏ ‏ تو یک گوہر اس دھات امولک نہ پائے
یو موتی نہیں وو جو غواص پائیں ‏ ‏ یو موتی نہیں وہ جو کس ہات آئیں

(ب) سنہ ۱۰۵۱ھ میں ایک وجہی دکھنی شاعر زندہ تھا جس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرزند کی تاریخ تولد کہی تھی "آفتاب از آفتاب آمد پدید" اس کے بعد غواصی کی تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے۔

(تاریخ نظام الدین احمد مخطوطہ انڈیا آفس)

اس سے واضح ہے کہ سنہ ۱۰۵۱ھ میں وجہی جو دکنی شاعر تھا زندہ تھا اور نہ صرف زندہ تھا بلکہ نظم بھی کہا کرتا تھا اور اس کو سلطان کا تقرب حاصل تھا اور وہ غواصی سے کسی بات میں فوقیت رکھتا تھا کیونکہ نظام الدین احمد اگرچہ غواصی کا بڑا مداح اور اس کے کمال کا معترف ہے لیکن وجہی کا ذکر مقدم کرنا ضروری تصور کرتا ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہے اسی قدر قریب زمانہ میں ایک ہی تخلص کے دو شاعر ایک ہی مقام میں موجود ہوں اور پھر وہ بلحاظ فن مشہور اور معروف ہونے کے علاوہ بادشاہ کا تقرب بھی رکھتے ہوں۔ دربار شاہی میں بار یاب ہوں غرضکہ قطب مشتری اور سب رس کا مصنف ایک ہی شخص کو قرار دینا ضروری ہے۔

وجہی کب فوت ہوا؟ یہ بھی معلوم نہیں مگر سنہ ۱۰۸۱ھ میں موجود نہیں تھا اس کو مرے عرصہ گذر چکا تھا کیونکہ [illegible]جہی نے اپنی مثنوی "بہرام و گل اندام" میں اس طرح ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے اس کو مرے عرصہ ہوگیا

جیسا کہ بیان کیا گیا وجہی ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا شاعر ہے غالباً اس نے کم عمری سے شاعری شروع کر دی تھی۔ کیونکہ قطب مشتری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کہنہ مشق شاعر ہے۔

وجہی کے زمانہ میں گولکنڈہ میں ہر طرف علمی فضا تھی شعر اور شاعری کا چرچا تھا کئی ایک مشہور شعرا مثلاً محمود۔ فیروز۔ احمد وغیرہ کے کارنامے موجود تھے مگر وجہی نے خاص وقعت اور امتیاز حاصل کر لیا تھا۔ اور اس کا اعزاز اس قدر بلند تھا کہ وہ سلطان قلی کو بہ حیثیت ہیرو پیش کرتا ہے اور اپنے ہمعصروں کو حقارت سے دیکھتا ہے اس کی نظر میں کسی شاعر کی کوئی وقعت نہیں ہے وہ اپنے عزت و مرتبے اپنی قابلیت و لیاقت اپنے شعر و شاعری کا کسی کو مد مقابل تصور نہیں کرتا دوسرے شعرا اس کے مقابل ہیچ ہیں۔

وجہی جس طرح شعر گوئی میں یکتائے زمانہ تھا اسی طرح نثر نویسی کا ملکہ رکھتا تھا سب رس اسکی بین شاہد ہے اگرچہ اس زمانہ (۱۰۴۵ھ) میں غواصی کا طوطی بول رہا تھا اور وہ دربار قطب شاہی میں ملک الشعرا کے درجہ تک پہونچ چکا تھا وجہی کی وہ عزت نہیں تھی جو سلطان قلی کے دربار میں تھی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ملا نظام الدین احمد اپنی تاریخ میں غواصی کی تو بڑی تعریف و توصیف کرتا ہے اور وجہی کا ذکر یوں ہی کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے ...... وجہی کو غواصی کے مقابل شکست ہو چکی تھی مگر وہ دربار سے ممنوع نہیں ہوا تھا قصائد اور تاریخیں کہہ کر پیش کرتا تھا۔

وجہی بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کی تصنیف سے نظم و نثر دونوں کے نمونے موجود ہیں۔ اس کے قصائد کا پتہ چلتا ہے گو وہ اب ناپید ہیں۔

ہم آج وجہی کو بہ حیثیت مرثیہ گو پیش کرتے اور مرثیہ کا نمونہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے علمی کارناموں سے ہم ناواقف نہیں ہیں انکی علمی قدردانی اور علم پروری کی زندہ یادگاریں تحریری صورت میں صدہا موجود ہیں جنکی صراحت موجب طوالت ہے چونکہ دونوں سلطنتوں کا شاہی مذہب امامیہ تھا اس لیے ان کے یہاں مجالس عزا کا خاص دستور تھا اور عام طور پر مرثیہ گوئی ہوتی تھی اس ماحول کا نتیجہ تھا کہ اکثر نامور شعرا ضرور مرثیہ کہا کرتے تھے اور پھر کئی ایک شعرا نے خاص مرثیہ گوئی کو اپنا پیشہ کر لیا سوائے مرثیہ کے کچھ کہا ہی نہیں کرتے۔

عادل شاہی عہد کے مرثیہ گویوں میں نوری اور مرزا خاص طور پر قابل ذکر ہیں اسی طرح قطب شاہی شعرا میں شاہی۔ کاظم اور مرزا کا نام یادگار رہے گا ان خاص مرثیہ گویوں کے علاوہ دیگر شعرا بھی مرثیہ

کہا کرتے چنانچہ قطب شاہی شعرا سے احمد، وجہی اور غواصی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کے مرثیے آج تک موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے زمانۂ سلف میں اکثر بیاضوں میں ان مرثیوں کو جمع کرتے تھے تاکہ مجالس عزا میں ان کو سنایا جائے اس قسم کے متعدد بیاض ہماری نظر سے گذرے ہیں ان میں سے دو اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں ایک میں تو تقریباً کل ہاشم علی برہان پوری کے مرثیے ہیں اور دوسری میں انتی شعرا کے مرثیے جمع کیے گئے ہیں۔ ان پر ہمارے مکرم دوست مسٹر زور روشنی ڈال چکے ہیں۔

ایک اور بیاض کنگ کالج کیمبرج کے کتب خانہ میں ہے جس میں پچیس شعرا کے مرثیے ہیں ان میں رضا۔ ندیم۔ روحی۔ نظر۔ قادر۔ رمضانی احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ہمارے خاندانی کتب خانوں میں متعدد بیاضوں کا پتہ چلا ہے جن پر کبھی روشنی ڈالی جائے گی ان میں سے آج کل ایک بیاض ہمارے پیش نظر ہے یہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کے کتب خانہ کی ہے اس میں تقریباً (۳۵) شعرا کے (۱۱۲) مرثیے ہیں اس میں وجہی غواصی۔ عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ مرزا (گولکنڈہ) مرزا (بیجاپور) شاہی۔ قادر۔ احمد وغیرہ مشہور ہیں اس پر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ اس بیاض میں وجہی کا ایک مرثیہ دس شعر کا موجود ہے اس کے متعلق صراحت کے پہلے اصل مرثیہ پیش کیا جاتا ہے۔

مرثیہ حضرت حسین

حسین کا غم کرو عزیزاں	انجونیں سوں جھرو عزیزاں
بنا جو اول ہوا ہے غم کا	عرش گگن ہور دھرت ہلایا
قضا میں جوں جوں لکھیا الٰہی	کریا حسین پر ادھی سمایا
نبیاں ولیاں کے انجوانسوں بھرے	یو غم حسین کا جنم دھولایا
دلاں میں وو لگی جھوتے چکیاں	یو غم نے سلگا دھرک لگایا
یو کیا بلا تھا یو کیا جفا تھا	مگر قضا تھا سو حق دکھایا
محب دلاں کوں اجل کا ساقی	پیالہ غم کے سو بھر پلایا
یو کیا اندیشہ اندیش کیتا	فلک شہاں پر ستم خدایا
حسین پہ یاراں درود بھیجو	کہ دین کا یو دیوا جگایا

تمارے وجہی کوں یا اماماں
نہیں تمن بن یو اس کوں سایا

یہ کوئی طویل مرثیہ نہیں ہے اور نہ اس میں مبالغہ اور قوت بیان کا اظہار کیا گیا ہے جھوٹے قصے تلوار کی تعریف گھوڑے کا وصف۔ صبح کا سما۔ جنگل دھوپ کا منظر کچھ نہیں ہے اس وقت کی روزمرہ زبان میں غم حسین کا اظہار مقصود ہے۔ دوستوں کو مخاطب کرتا ہے لے دوستو حسین کا غم کرو آنکھوں سے آنسوں بہاؤ۔ یہی سب سے پہلا غم ہے قسمت میں جو جو لکھا وہی ہوتا ہے اور تم تو کیا غم حسین نے انبیا اور اولیا کو بھی رولایا ہے۔ غم نے دلوں کو زخمی کر دیا اور جگر میں آگ لگا دی۔ یہ بلا یہ ستم یہ جفا خدا کو دکھانی بھی دکھائی۔ ساقی اجل نے غم کے پیالے پلائے افسوس فلک نے شہنشاہ ہی پر ظلم و ستم ڈھایا دوستو حسین پر سلام کہو درود بھیجو جو دین کا ستون ہے۔ آخر پر دعا کرتا ہے کہ وجہی کو آپ کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔

اس سے بہتر اس سے جامع اس سے واضح اس سے صاف کوئی مرثیہ نہیں ہو سکتا جس طرح سادہ الفاظ میں وجہی نے غم حسین کو بیان کیا ہے وہ تعریف کا محتاج نہیں ہے۔

وجہی کی شاعری کا نمونہ قطب مشتری اور نثر نویسی کا کمال سب رس سے بخوبی واضح ہوتا ہے اگرچہ ہمارے پاس مرثیوں کا کوئی کافی ذخیرہ نہیں ہے جس سے وجہی کی مرثیہ گوئی پر اظہار خیال کیا جا سکے مگر یہ بلا خوف کہا جا سکتا ہے وہ مرثیہ بھی کہا کرتا اور اچھے مرثیے لکھ سکتا تھا ممکن ہے دوسری بیاضوں سے اس کے مزید مرثیے دستیاب ہوں۔ ایسی صورت میں ہم مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

برسات

(از جناب احمد علی اکبر صاحب سراتس قاسمی)

ناطق، مطلق، ذی روح، غیر ذی روح تمام مخلوقات کی زندگی کا دار و مدار پانی پر ہے۔ موسم گرما میں پانی کی سخت ضرورت ہوتی ہے گویا تشنگی گرمی کا لوازمہ ہے۔ جتنی گرمی بڑھے گی اتنا ہی پیاس کا غلبہ زیادہ ہوگا۔

انسان اشرف المخلوقات ہے اس نے گرمی اور حبس سے محفوظ رہنے کے لئے کئی ذریعے پیدا کرلئے جنگل کی ننھی ننھی آزاد خوشبودار گھانس کو ڈوروں کے شکنجے میں مقید کرکے خس خانے بنائے۔ پانی کی صورت بگاڑ کر برف ایجاد کی۔ میوؤں کی ہستی فنا کرکے شربت تیار کیا اور جو غریب تھے انھوں نے بھی حسب مقدور گرمی سے بچنے کے تھوڑے بہت سے اسباب فراہم کر ہی لئے لیکن پیاسی زمین۔ تپتے پہاڑ۔ سوکھے درخت بے زبان جانور اور دیگر مخلوق کی ابتر حالت مخلوق سے دیکھی نہ جاسکتی تھی اس لیے گرمی کے بعد برسات کا موسم رکھا گیا۔

تشنہ کامی کا دور دورہ ختم ہوچکا۔ سیرابی کا زمانہ آگیا۔ گرمی گئی۔ برسات آگئی۔ بادل گرجے۔ بجلیاں چمکیں۔ تمام آسمان پر گھنگھور گھٹاؤں کا تسلط ہوگیا۔ موروں کی بن آئی۔ بن میں بولنے لگے۔ کوئل کے دن پھرے۔ اپنی کوک سے دلوں میں ہوک پیدا کرنے لگی پانی کی بوند پڑتے ہی پروانوں کے دلوں میں محبت کی آگ بھڑک اٹھی۔ چراغوں اور برقی لیمپوں پر جان قربان کرنے لگے۔ مینڈکوں نے اپنے جلسے جا بجا منعقد کرکے خوشی کا راگ الاپنا شروع کردیا۔ سفید وردی پوش بگلے باقاعدہ صفیں جما کر فرماں روائے بہار یعنی برسات کی سلامی کے لیے حاضر ہوگئے۔ چوڑی چکلی زمین اور بھاری بھرکم پہاڑوں پر سبز مخمل کا فرش بچھ گیا۔ درختوں نے پانی نہا نہا کر دھانی جوڑے پہن لئے۔ جب سارا عالم ہرا بھرا ہوگیا اور سبزی کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تو مکانوں کی چھتوں اور پانی کی سطح پر کائی بن کر جم گئی۔ وابستگان برسات کی یہ سرگرمیاں دیکھ کر گرمی کی گرم بازاری سرد پڑگئی اور جب کچھ زور نہ چل سکا تو غریب آفتاب نے خفت اور شرمندگی مٹانے کے لیے ابر کی چادر سے منہ ڈھک لیا۔

غزل

(از جناب مودود احمد صاحب تشنہ)

لطف آغوشِ یار کو دیکھو ۔۔۔ چاندنی کی بہار کو دیکھو
گل کے پہلو میں خار کو دیکھو ۔۔۔ غیر کے ساتھ یار کو دیکھو
دل سے کیا کام ہے نہیں معلوم؟ ۔۔۔ نگہ شرمسار کو دیکھو
ایک دم عیش عمر بھر ہے عیش ۔۔۔ زندگی کی بہار کو دیکھو
وعدہ پوچھا جو وصل کا تو کہا ۔۔۔ "ابھی روز شمار کو دیکھو!"
دیکھتے دیکھتے گزرتی ہے ۔۔۔ عمر ناپائدار کو دیکھو

تشنہ۔ گر چاہتے ہو لطف سخن
داغ کے "یادگار" کو دیکھو

افکار آزاد

چمن ہے، بہاریں ہیں گلباریاں ہیں ۔۔۔ گھٹا ہے، پھواریں ہیں، میخواریاں ہیں
ستم کوشیاں ہیں جفا کاریاں ہیں ۔۔۔ یہ کس کے مٹانے کی تیاریاں ہیں؟
وہ آنکھیں نہیں خاص سرشاریاں ہیں ۔۔۔ وہ نظریں نہیں۔ عام میخواریاں ہیں
بتو! تم خدا جانے کیسے خدا ہو ۔۔۔ کہ ستاریاں ہیں نہ غفاریاں ہیں
جواب کوئی پرساں نہیں ہو تو کیا غم ۔۔۔ غمِ دوست ہے اور غم خواریاں ہیں
بس اب حالِ اہل وفا کچھ نہ پوچھو ۔۔۔ کہ ذکر وفا ہی سے بیزاریاں ہیں
حیاتِ جہاں منقطع ہو نہ جائے ۔۔۔ تری تیغ ہے اور خوں باریاں ہیں
اگر تم خداوند عالم نہیں ہو ۔۔۔ تو عالم میں کس کی پرستاریاں ہیں
اب آنکھیں نہیں جاگتی تو نہ جاگیں ۔۔۔ کہ اب روح ہے اور بیداریاں ہیں
محبت کے پیرو! محبت کے شکوے؟ ۔۔۔ محبت کے مذہب سے غداریاں ہیں

جو آزاد قطع ہر امید کر دو
تو پھر صبر میں کون دشواریاں ہیں

حکیم آزاد انصاری

دُھن کا پکّا

ڈرامہ معہ کانک

(از جناب شیدا محمد صاحب)

جناب شیدا محمد صاحب کو انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے میں ایک خاص سلیقہ ہے۔ "ایمرسن" جیسے دقت پسند انشا پرداز کے بعض مضامین کا صاف و سلیس ترجمہ کرکے ملک میں خاصی شہرت حاصل کرلی ہے آپ کا طبعی میلان زیادہ تر فسانوں اور ڈراموں پر ہے یہ ڈرامہ بالکل طبع زاد ہے جو ایک واقعہ کے اثر کے طور پر لکھا گیا، اس کو وہ خود اسٹیج پر لانے کی تیاری میں ہیں ڈراما خود کہہ رہا ہے کہ انھیں بڑی کامیابی ہوگی۔ ڈرامے کے تین باب ہیں اور کانک کے بھی تین اس کے حقوق طبع محفوظ ہیں اور کسی کو اسٹیج پر بھی کرنے کی اجازت نہیں۔ "مجلہ مکتبہ" کا ایک عرصہ سے ان پر تقاضا تھا جس کو وہ اس ڈرامے کے ذریعہ پورا کررہے ہیں اس کی داد ہم کیا دیں خود قارئین پڑھنے کے بعد داد دینے پر مجبور ہوں گے! (مجلہ مکتبہ)

باب پہلا

سین پہلا - مقام استامبول

جمیل (تنہا اپنے کمرے میں گا رہا ہے)

اک قیامت کی مصیبت عشق کی منزل میں ہے
میں ادھر مشکل میں ہوں اور وہ اُدھر مشکل میں ہے

بول! لا حق کا ہوگا اور باطل کو شکست
سخت لیکن آزمایش اب حق و باطل میں ہے

ہوگیا ہوں بے خبر دنیا و مافیہا سے میں
آرزو تیری ہی تیرا ہی تصور دل میں ہے

دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست
آکہ میری جاں بڑی آفت بڑی مشکل میں ہے

زندگی کا بھی مزا شیدا اسی کے ساتھ ہے
اس نگاہ ناز کی پیہم خلش جو دل میں ہے

آہ محبت۔ تو نے اپنے مظلوموں پر کیا کیا ظلم نہیں کیے اور کیا کیا ستم ان پر نہیں توڑے مجنوں کو صحرا و بیاباں میں مارے مارے پھرایا تو فرہاد کو تیشہ سے اڑایا۔ رام کو سیتا سے چھڑایا تو نل کو دمن کے لیے کنویں جھکایا آہ۔ آہ۔ میرا گناہ یہی ہے کہ میں زبیدہ کو محبت کرتا ہوں اور اس کی الفت کا دم بھرتا ہوں - یہ اگر جرم ہوسکتا ہے تو ایسا جرم نہیں جس کی وجہ سے میں اپنے والد کے گھر سے

اس بے بسی کے ساتھ نکالا جاؤں۔ آوارہ و بے خانماں پھرایا جاؤں مگر

(آغاز بیدہ کا)

کون سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری

زبیدہ۔ پیارے جمیل۔ میں نے سنا ہے کہ چچا جان تم سے ناراض ہو گئے اور تم کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔

جمیل۔ ہاں پیاری شاہزادی۔

زبیدہ۔ اس کی وجہ؟

جمیل۔ اس کی وجہ؟ اس کی وجہ تو یہ ہے۔۔۔۔۔ نہیں میں نہیں کہہ سکتا۔

زبیدہ۔ نہیں تم کو ضرور کہنا ہو گا۔ جو کچھ واقعہ تم میں اور چچا جان میں گزرا وہ مجھ سے بیان کرنا ہو گا۔ تم اور میں جدا نہیں چھپانے کا یہ موقعہ نہیں۔ تم اپنے وعدہ کو بھول گئے کہ کوئی بات تم مجھ سے نہ چھپاوگے۔

جمیل۔ ہاں شہزادی مجھے یاد ہے مگر اس سے اب کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

زبیدہ دیکھو جمیل اچھا نہ ہو گا۔ تم مجھے اس گفتگو سے بہت پریشان و سرگردان کر رہے ہو۔ للہ بتاؤ کہ واقعہ کیا ہے۔

خدا کے واسطے کہہ دو معاملہ کیا ہے۔ نصیب دشمناں آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

جمیل۔ شہزادی آج ہم ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ چونکہ عشق کے مجرم ہیں اس لئے مورد سزا ہوتے ہیں۔ والد کو معلوم ہو گیا کہ ہم دونوں میں محبت ہے۔ ہماری محبت ان کی نظر میں پیش خیمۂ آفت ہے اس لئے مجھے حکم ہوا ہے کہ گھر سے چلا جاؤں۔

زبیدہ یہ کس لئے؟

جمیل یہ اس لئے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور میں شاہی خاندان سے نہیں اس لئے ان کے خیال میں ہماری شادی بے جوڑ ہے۔

زبیدہ۔ کیوں بے جوڑ؟ کیا تم ایک امیر خاندان کے نہیں؟ کیا تمہارے باپ کا ملک کے اعلیٰ امرا میں شمار نہیں۔

جمیل۔ مگر وہ آپ کا بیاہ کسی شاہی خاندان کے ممبر سے کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے بھی سنا ہو گا کہ

انھوں نے والی باشا کو آپ کے لئے انتخاب کیا ہے۔

زبیدہ۔ نہیں یہ ہرگز نہ ہوگا پیارے جمیل میں تمہارے ہمراہ چلوں گی اور اپنے ننگ و ناموس کو الوداع کہوں گی۔

مصیبت نہ فرقت کی میں سہہ سکوں گی جہاں تم رہوگے وہاں میں رہوں گی

جمیل۔ افسوس شاہزادی۔ میں آپ کو کہاں لے چلوں؟ میں خود نہیں جانتا کہ میں کہاں جاؤنگا اور کہاں رہوں گا۔ خود گرفتار مصیبت ہوں اب آپ کو بھی گرفتار مصیبت کروں۔ یہ مجھے گوارا نہیں یہی میرے لئے کچھ کم نہیں کہ آپ جیسی شاہزادی اپنی عنایت سے میری عزت افزائی فرمایئں یہی میرے لئے باعث افتخار ہے۔ جب کہیں کچھ ٹھکانا ہو جائے گا تو فرقت کا مداوا ہو جائے گا۔ میں آؤنگا اور آپ کو لیجاؤں گا۔

زبیدہ۔ پیارے جمیل میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے چلو ؂

زندگی کیونکر کٹے گی ہجر میں یارب مری دور کب ہوگی مصیبت اور آفت کی گھڑی

ایک تھی امید سو وہ بھی کنارہ کر گئی نا امیدی قلب مضطر پر مسلط ہو گئی

اے فلک کب تک ہمیں تو یوں ستائے جائے گا

اور کب تک ہم غریبوں کو رلائے جائے گا

پیارے جمیل! مجھ سے ہجر کی مصیبت کبھی نہ سہے جائے گی۔ یہ بندی اسی غم میں اپنی جان سے چلی جائے گی۔ اچھا تم کہاں جاؤ گے۔

جمیل۔ میرا ارادہ کہستان جانے اور وہاں قسمت آزمائی کرنے کا ہے۔

زبیدہ۔ جاؤ مگر یہ یاد رکھو کہ میں بھی وہاں پہنچونگی اور تمہارا سراغ لگاؤں گی (گانا زبیدہ کا)

دردمند آپ کا اچھا نہ ہوا درد کا اس کے مداوا نہ ہوا

کس جگہ نام یہ رسوا نہ ہوا کس جگہ عام یہ چرچا نہ ہوا

اف کبھی ہم نے مصیبت پہ نہ کی بیکسی میں کبھی شکوہ نہ ہوا

(آنا جمیل کے باپ خالد کا)

خالد۔ (جمیل کو ایک منٹ تک گھور کر دیکھ کے) ابھی تم نہیں گئے۔ جاؤ اور میرے گھر کو ہمیشہ

کے لئے اپنی بدبخت ہستی سے پاک کرو۔

زبیدہ۔ چچا جان یہ تو فرمایئے کہ یہ ظلم کس لئے ہو رہا ہے۔

خالد۔ شہزادی تم ابھی لڑکی اور دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف ہو۔ جمیل میں تم سے پھر ایکبار کہتا ہوں کہ جاؤ۔

جمیل۔ اباجان سلام۔ شہزادی خدا حافظ

شہزادی زبیدہ۔ پیارے جمیل! خدا حافظ۔ انشاء اللہ ہم پھر ملیں گے۔

زبیدہ۔ چچا جان آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس دل میں سوائے ایک شخص کے دوسرے کا گزر نہیں ہو سکتا۔ کسی کا اس معاملہ میں مجھ پر اثر نہیں ہو سکتا۔ آپ خوب سمجھ لیجئے کہ میں جان دیدونگی مگر جمیل کا خیال کبھی نہ چھوڑوں گی۔

خالد۔ (غصے سے) شہزادی میں تمہاری اس لایعنی گفتگو کو سننا نہیں چاہتا۔ (جاتا ہے)

زبیدہ۔ آہ آہ جمیل! میری زندگی کے آفتاب۔ میرے دل کے مالک تم گئے۔ اور مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ کس سے رازِ دل بیان کروں۔ کس طرح ضبط فغاں کروں۔ کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ سہ

کجا روم چہ کنم حال دل کرا گویم ‌‌‌ ‌ ‌ کہ دادِ من بستاند ز ہجر اے فراق

کیوں مجھ کو اکیلا چھوڑ گئے ‌ ‌ ‌ کیوں اپنی منتا چھوڑ گئے

اک اشک کا دریا چھوڑ گئے ‌ ‌ ‌ قسمت میں مری کیا چھوڑ گئے

جینے کا مزا باقی نہ رہا ‌ ‌ ‌ جو آسرا تھا باقی نہ رہا

وہ لطف ادا باقی نہ رہا ‌ ‌ ‌ کیوں مجھ کو سسکتا چھوڑ گئے

شوخی و شرارت کس سے کروں ‌ ‌ ‌ پر لطف محبت کس سے کروں

وہ پیار کی الفت کس سے کروں ‌ ‌ ‌ کیوں تم مجھے شیدا چھوڑ گئے

آہ۔ آہ۔ پیارے جمیل۔ (جانا زبیدہ کا)

باب پہلا (سین دوسرا)

(ایک جنگل)

(نارمن و عمران و ربیعہ اور ان کے ملازمین)

عمران (بڈھا یہودی) بہادر سردار۔ کس قصور اور کس جرم میں ہم بے گناہوں کو آپ زبردستی کھینچ لئے جارہے ہیں۔ لتد ہم پر رحم کیجئے اور چھوڑ دیجئے۔

جلد ل جاتی ہے ظالم کو سزا   ظلم کرنے سے نہیں کچھ فائدہ
ظلم کا انجام کب اچھا ہوا   ظلم سے سرسبز کوئی کب رہا

نارمن ۔ تو خود اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھ کہ تو نے عیسائیوں پر کتنے ظلم نہیں کئے۔ کتنے گھر تو نے عدالتی ڈگریوں سے تباہ و برباد نہیں کئے۔ کتنوں کو تو نے بے خانماں نہیں کیا۔ کتنوں کو تو نے زندان نہیں بھجوایا۔ کیا وہ تیرے ستائے ہوئے نہیں ؟ کیا وہ تیرے مٹائے ہوئے نہیں؟ ان مظالم کا بدلہ اگر آج میں تجھ سے لے رہا ہوں تو کیا بُرا کر رہا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے مذہب کا بھلا کر رہا ہوں۔ اور اپنے لئے ثواب کما رہا ہوں۔ پھر کہتا ہوں کہ تیری رہائی کی شرط ایک لاکھ دینار میں ایک لاکھ دینار یہاں ہاں یہاں اس جنگل میں مجھے گن دے اور فی الفور رہا ہو جا۔

عمران ۔ اے بیت المقدس کے پاک پروردگار۔ ایک لاکھ دینار ! ایک لاکھ دینار تو درکنار ایک ہزار دینار بھی میں نہیں رکھتا۔ ایک غریب یہودی کے پاس اتنی کثیر رقم کہاں سے آئی۔ بھلا ایک مفلس و قلاش یہودی اس قدر رقم ادا بھی کر سکتا ہے !۔ اے عیسائی سردار۔ رحم رحم ! غریب عمران پر رحم ! مفلس و پریشان پر رحم ! ایک بے سروساماں پر رحم ! میں اس قدر تاوان نہیں ادا کر سکتا۔

نارمن ۔ بس بس تو کس کو سکھاتا ہے۔ کیا میں تجھے نہیں جانتا۔ تو کون ہے۔ وہی عمران تاجر جس کے گھر میں بڑی بڑی تجوریاں اور بڑے بڑے صندوق تہ خانوں میں پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں کیا تو وہی اسرائیلی نہیں جس کے قرضدار آج امیر نجدان و امیر لہستان ہیں ؟ میں نے ایک لاکھ دینار بہت کم لنگے۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو ایک لاکھ دینار بلا کسی شک و وہم کے دھر دے ورنہ تیری ایک ایک بوٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں گا اور اپنے عیسائی بھائیوں کا بدلہ لوں گا۔ پھر اس وقت پچھتانے اور کف افسوس ملنے سے فایدہ نہ ہوگا۔ دیکھ عمران ایک لاکھ دینار زیادہ نہیں۔

عمران ۔ اے ہارون و موسیٰ کے خدا میری مدد کیجیو۔ ایک غریب بڈھے یہودی کی مدد کیجیو۔ ایک لاکھ دینار ! ایک ہزار نہیں دو ہزار نہیں ! ایک لاکھ دینار ! یہ میری بساط سے باہر ہے۔ عیسائی سردار رحم رحم ! اپنے یسوع مسیح کے لئے رحم ! (پاؤں پر گر پڑتا ہے)

نارمن ۔ (ٹھوکر مار کر) دور ہٹ ۔ مجھے اپنے نجس ہاتھ نہ لگا۔ ایک آخری موقع تجھے اور دیتا ہوں جو کچھ فیصلہ ہو کر لے۔ چیل کوؤں کو اپنی بوٹیاں کھلائے گا۔ یا ایک لاکھ دینار دے گا۔
عمران ۔ بہادر سردار پچیس ہزار دینار مجھ سے لے لیجئے ۔ میں ابھی آپ کو خط لکھ دیتا ہوں
نارمن ۔ نہیں میں تجھ سے ایک لاکھ دینار یہیں نقد لوں گا۔ نامہ و پیام میں نہیں جانتا۔ اپنے آدمی کو رقم کے لئے بھیج ۔ وہ آئے تک تو یہیں رہے گا۔ اگر میرے ساتھ کچھ مکر و فریب کرے گا تو یاد رکھ تیرا سر بھٹے کی طرح اڑے گا۔
عمران ۔ اچھا میں خط لکھتا ہوں ۔ میری بیٹی ربیعہ بھی ان کے ہمراہ چلی جائے گی۔
نارمن ۔ یہ ہماری شرط نہیں ہے ۔ ربیعہ کو میں نے خاص اپنے لئے رکھ لیا ہے!
عمران (حیرت سے) ربیعہ کو میری پیاری بیٹی کو اپنے لئے رکھ لیا ہے نہیں نارمن ایسا نہ کر۔ میری پیاری بیٹی کی میں نے اپنی جان سے بڑھ کر نگہداشت کی ہے اُس کی ماں مرنے کے بعد بڑی ہی مصیبتیں جھیل کر اس کو پالا پوسا اور اس کی پرداخت کی ہے ۔ غیر محرم نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ اس کو چھوڑ دے ۔
نارمن ۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تو خود جانتا ہے کہ ہم لوگ اپنے قبضے میں آئی ہوی چیز کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے۔
عمران نارمن ایک لاکھ کے اوپر اور پچیس ہزار دینار لے لے۔ مگر میری بیٹی کو مجھے بخش دے۔
نارمن ۔ کیا سٹری اور سودائی تو نہیں ہو گیا۔ یہی کیا کم ہے کہ ایک لاکھ کے معاوضہ میں اپنی جان سلامت لے جا رہا ہے اب بیٹی کی طرف سے کیوں غم کھا رہا ہے ۔ لے بس اب جلد خط لکھ۔
عمران ۔ مجھ سے دو لاکھ دینار لے لے ۔ میری بیٹی کو چھوڑ دے۔
نارمن ۔ نہیں۔
عمران ۔ تین لاکھ۔
نارمن ۔ نہیں۔
عمران ۔ دس لاکھ۔
نارمن ۔ نہیں۔
عمران ۔ پچاس لاکھ۔

نارمن۔ نہیں۔

عمران ۔ بس تو مجھے بھی لے لے ۔ اور میری بوٹیاں چیل کوؤں کو دیدے ۔

نارمن ۔ تو تو اپنی جان بچانا نہیں چاہتا۔

عمران ۔ ہرگز نہیں ۔ ہرگز نہیں ۔

نارمن ۔ کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں۔ تیرا ایسا ہی ارادہ ہے تو مجھے بھی کچھ پس وپیش نہیں ۔ جب ایک ایک ٹکڑا کاٹا اور چیل کوؤں کو تیرے ہی سامنے کھلایا جائے گا تو سب حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

عمران۔ جاتی ہے اگر جان تو پروا نہیں مجھ کو ۔ بیٹی سے مری جان زیادہ نہیں مجھ کو
اولاد سے بچھڑوں یہ گوارا نہیں مجھ کو ۔ بیٹی کوئی ملنے کی دوبارہ نہیں مجھ کو

سر میرا اڑا دے کہ مجھے زندہ جلا دے
جو دل میں ترے آئے وہ منظور ہے کر لے

نارمن ۔ دیکھ یہی بات۔

عمران ۔ ہاں ہاں ظالم کتنے یہی بات ۔ لے یہ میرا جسم حاضر ہے ۔ مگر یاد رکھ عمران مر بھی جائیگا تو روح اسکی اپنی بیٹی کے لئے بے قرار رہے گی اور تجھ کو بھی بے قرار رکھے گی ۔ ؎

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن ۔ اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

اے بنی اسرائیل کے خدا ۔ اپنے بیکس بندے کی مدد کیجیو ۔ عمران ایک شقی القلب کے پنجے میں گرفتار ہے ۔ ایک جلاد عیسائی اس کی بیٹی کی عصمت دری کو آمادہ و تیار ہے ۔ اے بیت المقدس کے مالک ۔ تو ہی ہم بیکسوں کا بچانے والا اور تو ہی ہم بیکسوں کی فریاد سننے والا ہے بچا اس موذی کے پنجۂ ظلم سے بچا ۔ (عمران کا بیہوش ہو کر گرنا)

نارمن ۔ (اپنے سپاہیوں سے) اس یہودی کتے کو اٹھاؤ اور اس کے کپڑے اتارو اور اسکی بوٹیاں کاٹ کے اڑا دو ۔

(سپاہی عمران کو اٹھاتے اور اس کے کپڑے اتارتے ہیں ۔ عمران ہوش میں آتا اور ان کے ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے)

ربیعہ (نارمن کے قدموں پہ گر کے) اے عیسائی سردار رحم کیجئے۔ میرے غریب باپ پر رحم کیجئے۔ ہماری تمام دولت لے لیجئے اور ہمیں چھوڑ دیجئے

نارمن (ربیعہ کو گود میں اٹھا کے) آ میری پیاری آ۔ اور نارمن کے کھولتے ہوئے خون کو اپنے بوسے سے ٹھنڈا کر (بوسہ لیتا ہے)

ربیعہ (چیخ مار کے) چھوڑ او ظالم سردار مجھے چھوڑ۔ (جمیل ایک دم آتا ہے)

جمیل ۔ او ظالم ۔ کیوں تو اس لڑکی پر ناجائز حملہ کر رہا ہے (گھونسہ لگا کے) بس چھوڑ اور مجھ سے مقابلہ کر۔

نارمن ۔ ارے تو کون اس معاملہ میں دخل دینے والا؟

جمیل ۔ میں ہوں مظلوموں کی مدد کرنے اور تیرا سر کھولنے والا۔

نارمن (تلوار کھینچ کر) تو لے یہ میرا وار۔

جمیل (وار کو بچا کر) لے اب میرے پستول کا فائر۔ (فیر کرنا)

(گولی کا نارمن کے شانے پر لگنا۔ نارمن کا درد سے تڑپنا۔ ربیعہ کا جمیل کے قدموں کے سامنے دوزانو ہونا۔ پردے کا آہستہ آہستہ گرنا۔

باب پہلا ۔ سین تیسرا

[باغ ۔ زبیدہ کا گانا سہیلیوں کے ساتھ]

زبیدہ

تم جب سے گئے پردیس پیا تن من کی خبر مجھ کو نہ رہی
کیا مجھ پہ ستم یہ ٹوٹ پڑا تن من کی خبر مجھکو نہ رہی

اب ضبط کی طاقت تا بکجا ہے دل کا لگانا سخت بُرا
ہوں یاد میں تیری صبح و مسا تن من کی خبر مجھکو نہ رہی

کیا لوٹ پڑی ہے گھر میں مرے طالع میں ہیں بہت چکر میرے
سودا ہے تمھارا سر میں مرے تن من کی خبر مجھکو نہ رہی

آہ نگار ۔ اس جدائی سے میری جان لبوں پر آ گئی ہے ۔ زندگی اگر اسی طرح گزرے تو اُمید نہیں کہ جان اس کالبد خاکی میں اور بسر کرے۔ آہ معلوم نہیں وہ غریب الوطن کہاں اور کس مصیبت میں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔ کون مجھے اس کی خبر لائے گا۔

نگار ۔ شہزادی آپ اپنی جان کو اس طرح ہلکان نہ کیجئے! ور خدارا ان فکروں میں

پڑکے خود کو حیران اور دوسروں کو پریشان نہ کیجئے۔ آپ نے خود کہا تھا کہ وہ کہستان گئے ہیں۔ اور یقین ہے کہ وہ وہیں گئے ہیں۔

زبیدہ۔ ہاں ہاں وہ کہستان جانے کے متعلق کہہ رہے تھے ہماری خالہ بھی وہیں رہتی ہیں۔ سنتی ہوں کہ چچا جان بھی نئے شاہ کی تخت نشینی کی تقریب میں سلطان کی طرف سے بھیجے جانے والے ہیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ چلنے کے لئے کہوں گی مگر شاید وہ مجھے لیجانا پسند نہ کریں۔

نگار۔ آپ انھیں مجبور کیجئے تو وہ مان جائینگے کیونکہ انھوں نے آج تک آپ کی کسی بات کو سوائے ایک بات کے نہیں ٹالا ہے۔

زبیدہ۔ کسی کے پاؤں کی آہٹ آرہی ہے۔ لے لو خود چچا جان آگئے۔

(آنا خالد کا جانا سہیلیوں کا)

خالد۔ شہزادی میں آج شام کوہستان شاہ کی تخت نشینی کی تقریب میں روانہ ہوں گا۔

زبیدہ۔ چچا جان میں بھی آپ کے ہمراہ چلتی ہوں۔

خالد۔ کس لئے۔

شاہزادی۔ یہاں میری طبیعت نہیں لگ رہی ہے۔ خالہ جان سے مل کر بہت روز ہوئے۔ ایسے بھی جی دیکھنے کو چاہتا ہے۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلئے۔

خالد۔ تم یہیں رہتیں تو اچھا تھا۔

شاہزادی۔ نہیں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔

خالد۔ اچھا تو چلنے کی تیاری کرو۔ (جانا خالد کا آنا سہیلیوں کا۔ گانا زبیدہ کا)

دل میں تری لو لگی ہوئی ہے ۔۔۔ صورت بھی نظر میں پھر رہی ہے
دنیا کا نہیں ہے حال یکساں ۔۔۔ شادی ہے کبھی کبھی غمی ہے
آوارہ وطن ملے خدایا ۔۔۔ بس آرزو دل میں اب یہی ہے
مجبوری یار میں ہماری ۔۔۔ دمساز و رفیق بے کسی ہے

کا مٹ ۔ سین چوتھا

رستم اور اس کا ملازم چمن

رستم ۔ بس کچھ تسلی دل کا سامان ہیں تو شاعروں کے بلند خیالات ہیں ۔ جواہرات کی کان ہیں تو اُن کے عالی افکارات ہیں ۔ فلاکت اور ناداری میں وہ ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور اپنے زرین خیالات سے دنیا کی بھلائی کرتے ہیں بس میں بھی شاعر بنوں گا اور اشعار لکھوں گا۔

جھمن ۔ حضور شاعری اور بلند خیالات اور عالی افکارات سے پیٹ کا ایندھن بھر جاتا تو دنیا کا انجن شاعری اور صرف شاعری پر ہی چلنے لگتا۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک غریب سے لے کر امیر تک دماغ کی مشن سے اشعار ڈھال ڈھال کر نکالتے اور دن عید اور رات شب برات مناتے ۔ میرے بچپن میں ایک شاعر تھے اپنے فن کے بڑے ماہر تھے مگر دنیا کی نشیب و فراز سمجھنے میں ان کا ٹٹو نہیں چلتا تھا۔ ایک ایک دن ان کے گھر میں چولہا نہیں سلگتا تھا رات دن سوائے شاعری کے کوئی کام نہ تھا۔ ہونق ہونے میں ان کے کوئی کلام نہ تھا۔ شاعری کا کلمہ پڑھتے تھے اور لیلی ومجنون اور گل وبلبل کی حکایت نئے نئے طریقہ سے گھڑتے تھے اللہ بخشے بڑے مزے کے آدمی تھے آپ ہی شعر لکھتے اور آپ ہی سر دھنتے تھے۔ جو کوئی شعر اچھا موزوں ہو جاتا پھر تو چولی کود اچھلوں کا مضمون ہو جاتا۔ ایک وقت کا واقعہ سنئے اور لوٹ لوٹ کر ہنسئے۔ حضرت تہمد باندھے ہوئے اشعار کے خیالات میں محو کہیں جارہے تھے مگر شعر کی دھن میں منزل مقصود غتربود ہوگئی تھی۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ حضرت کو عقل چھو نہ گئی تھی۔ اتفاق سے تہمد جو پہلے ہی ڈھیلی بنی ہوی تھی تو ندپر سے پھسل کے زمین پر گرگئی مگر ان کے کانوں کان بھی خبر نہ ہوی لوگ جو راستہ چل رہے تھے وہ حیران کہ یا الٰہی یہ شخص کیسا بے حیا ہے جو ننگا جارہا ہے۔ اتنے میں ایک شعر جو کچھ مرضی کے موافق بن گیا تو حضرت کا دل اچھل گیا۔ ایکدم راستہ پر ہی لگے اچھلنے کودنے ۔ انکی اس بے حیائی پر مرد تو لگے بگڑنے اور عورتیں لگیں کوسنے اور ہنٹر مارنے پھر تو یکایک آپ شاعری کے خواب خرگوش سے بیدار اور اپنی حالت پر شرمار ہوے تہمد باندہ کر راستہ لیا۔ (آنا رستم کے دوست قلندر کا)

قلندر ۔ کیا ہورہا ہے۔

جھمن ۔ ایک شاعر کا ذکر ہورہا ہے۔ ہمارے میاں کی فضول خرچیوں سے جو کچھ درگت ہوی ہے وہ بے لت ہوی ہے۔ قرضداروں کی خاطر گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا ہے جسکی وجہ سے

پریشان دل اور دماغ مضمحل ہو گیا ہے۔ اب حضور کا ارادہ اشعار لکھنے کا ہو رہا ہے۔

قلندر۔ ارے یار یہ کیا تمھیں خبط سوجھا ہے۔ شاعری اور مدک ان کے شغل میں پڑنے سے آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ کوڑی کی آمدنی نہیں۔ واہ واکی تعریفوں کے سوا اور کچھ کھاتا کھانی نہیں واہ وا سنتے جاؤ اور گھر میں بھوکوں مرتے جاؤ۔ ایک برس پہلے ایک جگہ مشاعرہ ہوا تھا۔ بندہ بھی اس میں گیا تھا طرح مصرع تھا۔ کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے ہم نے اس میں نئے نئے قافیے اور نئے نئے مضامین باندھے مگر واہ رے شاعری کی نحوست رات کو آ کر گھر میں بھوکے سوئے۔ غزل کے کچھ اشعار یاد ہیں۔ سنو

رستم فرمائے۔

قلندر۔ قدر دانی عالم بالا معلوم شد۔ خیر سناتا ہوں اور اپنا مغز پکاتا ہوں۔ مگر وہی جاہے گدھے کو زعفران کی کیا قدر۔ دیکھنا کیا لاجواب مطلع کہا ہے۔

بتاؤ عندیہ کیا ایسی چھیڑ چھاڑ میں ہے رقیب روسیہ پوشیدہ کیوں کواڑ میں ہے

چھمن۔ جب یہ مشاعرہ کی غزل ہے تو مشاعرہ کی جیسی اودھم بھی چاہئے۔ اس لئے بآواز بلند واہ وا واہ کا نعرہ لگاتا ہوں برا نہ مانئے واہ وا واہ۔ رقیب کو کواڑ میں لیجا کے بٹھا دیا اب یہ بھڑوا ہیں مرگیا تو پرواہیں۔ ایک سارنگی کا کانٹا نکل گیا تو راستہ صاف ہو گیا میں ہوتا تو کواڑ کی جگہ بھڑوے کو بھاڑ میں ہی جھونک دیتا۔

قلندر۔ دوسرا شعر ہے۔

رسید اس کو چپت کی تو اس کو اک چانٹا گزرتی یار کی ہر لحظہ مار دھاڑ میں ہے

چھمن۔ پھر مشاعرہ کی تعریف۔ واہ وا۔ واہ پھر فرمائیے۔

رسید اس کو چپت کی تو اس کو اک چانٹا گزرتی یار کی ہر لحظہ مار دھاڑ میں ہے

واہ وا واہ وا (خود کو شاباشی دیتا ہے)

رسید اس کو چپت کی تو اس کو اک چانٹا۔ کیوں حضور۔ معشوق کوئی پہلوان یا رستم ہے جب ہی اتنا طاقتور ہے کہ بیچارے کو مار دھاڑ کے سوا کچھ کام نہیں۔ چوہے کی مرن بلی کا کھیل شاید اسی موقع پر کسی مسخرے نے کہا ہے۔

رستم۔ کیوں بے تو بہت بڑھ چلا۔ پہلوان اور رستم کی پھبتی ہمیں پر کس رہا ہے۔
چھمن۔ سرکار میں نے کیا برا کہا۔ گزرتی یار کی ہر لحظہ مار دھاڑ میں ہے۔ اس سے کوئی اور دوسرا مطلب نکلتا ہو تو مجھے پانچ جوتے ماریئے اور وہ بھی بازار کے بھاؤ سے۔
قلندر۔ ہاں بھئی۔ تیرا شعر سنا۔ بھیڑ بھاڑ کا قافیہ باندھا ہے اور بالکل انوکھے پیرائے سے باندھا ہے۔
چھمن۔ جی ہاں اپنے منہ میاں مٹھو بننا اسی کو کہتے ہیں
قلندر۔ سنو بھئی کس قدر اچھا شعر کہا ہے۔

انار ایک تو بیمار سو ہے ضرب مثل خدا ہی خیر کرے یار بھیڑ بھاڑ میں ہے

چھمن۔ شاعرہ کی تعریف۔ واہ وا وا۔ پھر فرمائیے۔

انار ایک تو بیمار سو ہے ضرب مثل خدا ہی خیر کرے یار بھیڑ بھاڑ میں ہے

واہ واہ وا۔ ایک نہیں دو نہیں بلکہ ایک دم سو کے نرغے سے نکلنا بڑی آفت ہو گئی ہے جس پر آپ کو خدا ہی خیر کرے بولنے کی ضرورت ہو گئی ہے۔ یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ سو نفوس کو دیکھ کے گھبرا گئے۔ اجی اگر میں ہوتا تو ان سوؤں کا قلیہ کر دیتا اور کبھی خدا ہی خیر کرے کا ٹھنڈا لفظ زبان سے نہ نکالتا مگر آپ کیا کرینگے۔ تمام شاعر ایسے ہی ٹھنڈے سیلے ہوتے ہیں۔
قلندر (چھمن کو ایک چپت رسید کر کے)

نہیں ہے ہاتھ میں پیسہ وگرنہ جاتے ہم بڑا مزہ گرمی کا نلگری پہاڑ میں ہے

چھمن شاباش۔ خوب کہا

نہیں ہے ہاتھ میں پیسہ وگرنہ جاتے ہم بڑا مزہ گرمی کا نلگری پہاڑ میں ہے

شاعرہ کی تعریف۔ واہ وا۔ حضور یہ تو میرے دل کی بات کہی۔ میرا رونا ہی جب سے پیسے ہی کے واسطے تھا۔ تمام شاعر پیسے ہی کا رونا زندگی بھر روتے روتے لیٹ گئے۔ خالی ہاتھ آئے اور خالی پیٹ گئے۔ اس کے اوپر والا شعر تو برف کے جیسا ٹھنڈا تھا۔ یہ شعر گرم بھبکا ہے اس کے لئے نلگری کے برف کی ضرورت ہے۔ (باہر سے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

(باقی)

تنقیدیں

خمکدۂ سرور مرتبہ جناب قاضی محمد غوث صاحب فضا حیدرآبادی چھوٹی تقطیع ضخامت (۲۹۷) صفحات سید عبدالقادر صاحب ناشر و تاجر کتب چار مینار اور مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے (عہ/) میں مل سکتی ہے۔

جدید اردو شاعری کے بڑے نقیبوں میں منشی درگا سہائے صاحب سرور آنجہانی بڑی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ مبدء فیاض سے انھیں بڑی حساس طبیعت اور شاعرانہ دل و دماغ عطا ہوا تھا۔ طبیعت کی تیز حسی اور دردمندی نے انکے کلام میں وہ سوز و گداز پیدا کر دیا ہے جو شاعری کی جان ہے۔ ان کا کلام پڑھکر ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ بلاشبہ قدرت نے انھیں شاعری کے لئے پیدا کیا تھا اپنی (۳۷) برس کی مختصر سی پُر مصائب زندگی میں انھوں نے اپنا مقصد حیات پورا کر دیا اور جو کلام ان سے یادگار ہے وہ اپنی اعلیٰ خصوصیات کے اعتبار سے جدید اردو شاعری کا ایک بہترین جز ہے۔ انکی شاعری انکی حیات کی بالخصوص اور اپنے عہد کی بالعموم زندگی کی صحیح ترجمان ہے اور اس کے ساتھ تڑپ اور تاثیر سے بھی بھری ہوئی ہے۔ ان ہی چیزوں نے شاعر اور اُس کی شاعری دونو کو لافانی بنا دیا ہے۔

سرور کا کلام ان کی زندگی ہی میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا اور کم و بیش سارے ہندوستان میں مقبول ہو چکا تھا۔ وہ "جام سرور" کے نام سے مجموعہ کلام شائع کر رہے تھے کہ انکا انتقال ہو گیا اور یہ دیوان کئی دن بعد شائع ہوا۔ اس کے علاوہ زمانہ پریس سے بھی ایک چھوٹا سا مجموعہ شائع ہوا ہو لیکن ان کا تمام کلام یکجا جمع نہ ہو سکا۔ قاضی محمد غوث صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے کم و بیش پورا کلام خمکدۂ سرور کے نام سے شائع کر کے اردو ادب کی لائق ستائش کوشش کی ہے۔ اس مجموعہ میں مصنف کا ایک مضمون نثر بھی شامل ہے۔ نثر میں غالباً یہی ایک ٹکڑا ان سے یادگار باقی رہا ہے۔ خمکدۂ سرور میں کلام کی ترتیب حمد باری تعالیٰ، تلاش حقیقت، مظاہر قدرت، بادۂ حسرت وغیرہ ابواب میں کی گئی ہے۔ اگر اس کی بجائے تاریخی ترتیب سے کلام پیش کیا جاتا تو متعلمین سرور کے لئے انکی شاعری کا ارتقا اور خیالات وغیرہ میں وقتاً فوقتاً تبدیلی، ترقی اور توسیع معلوم کرنے میں بڑی سہولت اور مرتب کی سعی زیادہ مشکور ہوتی۔ موجودہ ترتیب سے کلام ٹھیک طور پر تقسیم نہیں ہوا ہے اور

بہت کم ایسی تقسیم کلام کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ مرتب نے چار صفحوں پر شاعر کے حالات لکھدیئے ہیں اور سرور کی نسبت دیگر دور قدیم کے ایک ممتاز مجلہ کی جدید صحیح ترجمانی" کے مبہم عنوان سے کسی اور کے قلم کی رائے پیش کی ہے۔ مولوی سید سجاد صاحب مددگار پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ اور جوش صاحب ملیح آبادی سے بھی تعارف اور تمہید لکھوائی گئی ہے۔ ان چند سطری تعارف و تمہید میں بھی کلام سرور کی نسبت ایک دو لفظی رائے درج ہے مگر ایک میں نکتہ آفرینی ہے تو دوسرے میں نکتہ چینی۔ حیدرآباد میں طباعت کی جو مشکلات ہیں وہ اس کتاب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ اگرچہ کلام کا بیشتر حصہ صحیح ہو لیکن طباعت بڑی بھونڈی ہے۔

آرنسٹ مترجمہ مولوی سید تمکین کاظمی صاحب و مولوی عبد المنعم صاحب سعیدی بی۔ اے چھوٹی تقطیع ضخامت ۱۰۹ صفحات قیمت ۸ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

انگریزی ادب میں آسکر وائیلڈ کا جو بلند پایہ ہے اس سے انگریزی ادب کے متعلقین آگاہ ہیں۔ ارنسٹ اس کے مشہور ڈراما "دی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" کا ترجمہ ہے۔ اردو ادب میں انگریزی کے ایسے شہ کاروں کو منتقل کرنے کی جسقدر ضرورت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کاظمی و سعیدی صاحبان کی یہ کوشش مستحق حوصلہ افزائی ہے پر ادب عالیہ کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا جس قدر مفید ہے اسی قدر مشکل اور ہمت شکن کام بھی ہے۔ باریک بینی سے اصل اور ترجمہ کا مقابلہ کیا جائے تو ضرور ایسے مواقع ملینگے جہاں ترجمہ اصل سے بہت دور ہوگیا ہے مگر پہلی کوشش میں اس سے زیادہ بہتری کی امید بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ مترجم نے بھی دفع دخل مقدر کے طور پر تقریب کے عنوان سے یہ معذرت کردی ہے "ہمیں اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہے کہ ہم ترجمہ میں اصل کی سی خوبی نہ پیدا کرسکے اور بعض جگہ بدحواسیاں بھی کردیں"۔ متن سے پہلے مولوی سلطان حیدر صاحب جوش کا پیش لفظ، جوش صاحب ملیح آبادی کا تاثر، مسعود حسن صاحب ذوقی کا تعارف اور انیس مجتبی صاحب کا اعلان اور تمکین صاحب مترجم کی تقریب مستزاد ہیں جن میں اسکر وائیلڈ، ارنسٹ اور مترجمین کو روشناس کرایا گیا ہے۔

الروضۃ البہیہ از جناب ایس ذاکر حسین جعفر صاحب درمیانی لمبی تقطیع ضخامت ۱۴۸ صفحات قیمت ۱۲

ملنے کا پتہ مطبع قادری جبل پور صوبہ متوسطہ۔

یہ سلاطین فاطمیہ مصر کی مدافعانہ تاریخ ہے۔ مشہور مورخ ابن العذاری نے اپنی کتاب تاریخ مغرب میں ان سلاطین کی نسبت جو اعتراض کئے ہیں، اس رسالہ میں ان کا جواب دیا گیا ہے اور آخر میں مسلمانوں کے فرقہ بواہیر کے آغاز وارتقاء پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک مفید کتاب ہے۔ تاریخ اسلام کے اس جزو پر اردو میں سلیس تاریخوں کی کمی جس شدت سے محسوس ہو رہی ہے شکر ہے کہ جناب ذاکر حسین صاحب نے اس کو دور کرنے کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ اگر موصوف جدید اصول تاریخ نویسی کی روشنی میں قدیم اور معتبر تواریخ سے جن کی عربی زبان میں کمی نہیں، مواد لیکر جامع کتاب مرتب کریں تو یہ اردو کی بڑی خدمت ہوگی۔ بواہیر کے متعلق بھی اردو میں بہت کم تاریخی مواد ملتا ہے۔ اس کتاب میں جو حالات ان کے درج کئے گئے ہیں وہ ابتدائی تعارف پر بہت مفید ہیں۔

ہونہار (ماھوار) مدیر جناب فیاض حسین صاحب نسیم ضخامت ۲۰ صفحات عام رسائلی تقطیع سالانہ چندہ ۱ روپے، صدر بازار دہلی اس کا پتہ ہے۔

ہونہار جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کے فائدے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصے، دلچسپ لطیفے، نصیحت آمیز مضامین جن میں اکثر کمسن مضمون نگاروں کے ہیں، اس رسالے میں درج ہوتے ہیں۔ ننھے قارئین کے لحاظ سے خط بھی کھلا اور صاف رکھا گیا ہے۔ تصویریں بھی دلچسپ مگر عام ہیں۔ رسالے کے شروع میں "معاونین خصوصی" کی ایک لمبی چوڑی فہرست دی ہے جس میں ہندوستان کے تمام مشاہیر ادیب اور انشاپردازوں کے نام گنا دئے گئے ہیں۔ اگر یہ سب سال میں دو دو مضمون بھی رسالے کے لئے لکھدیں تو یہ رسالہ ہندوستان میں ایک ہی ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی کم توقع ہے کہ یہ سب حضرات بچوں کے کام کے مضمون لکھ سکتے ہیں۔ بہر حال ہونہار جس کے اس وقت دو نمبر ہمارے پیش نظر ہیں تیسری چوتھی جماعت کے طلباء کے لئے قابل مطالعہ رسالہ ہے۔

قاعدہ فارسی

ہندوستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم ابھی تک قدیم طریق پر ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمانہ تعلیم کی طوالت کو دیکھ کر نوجوان عموماً ان سے محروم رہتے ہیں عربی میں تو ڈائرکٹ میتھڈ کی ایک دو کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں یا مصر کی کتابوں کو مدارس میں مروج کیا گیا تھا لیکن فارسی میں ابھی اسطرف قدم نہ اٹھایا گیا تھا۔ قاعدہ زیر نظر کو جدید اصول تعلیم کے مطابق مرتب کیا گیا ہے جسکے پڑھنے میں طلبا کے ذہن پر فضول بوجھ بھی نہیں پڑتا اور وہ فارسی زبان میں گفتگو وغیرہ بھی کر سکتے ہیں ہمارے خیال میں یہ قاعدہ مدارس کیلئے نہایت مفید ہے

(ریاست دہلی)

یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جسکو انجمن مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود نے مدارس کیلئے راست طریقہ تعلیم پر ابو المحاسن محسن خاں صاحب متین سے تیار کرایا ہے متین صاحب کا نام اردو صحافت کیلئے نیا نہیں ہے۔ وہ سررشتہ تعلیم حیدرآباد دکن کے ایک تجربہ کار مدرس ہیں جنھیں فارسی زبان سے خاص دلچسپی ہونیکے علاوہ متعدد فارسی مقالوں وغیرہ کے ترجمہ کرانیکا اتفاق ہوا ہے۔ اس قاعدہ کی اہم خصوصیات یہ ہیں:۔

الفاظ اور خیالات کی تعبیر و توضیح کیلئے سَو سے زیادہ تصاویر دیگئی ہیں اور طلبہ کو دونوں عہد کی زبانوں سے مانوس کرنیکے لئے فارسی جدید کے ساتھ فارسی قدیم کا بھی امتزاج کیا گیا ہے۔ مکالموں کی

طرز میں جہاں جہاں سلیس جملے استعمال کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر روزمرہ فارسی جدید کو استعمال کیا گیا ہے
ہماری رائے میں اگر یہ قاعدہ بذریعہ بلاک چھپوایا جاتا تو اسکی خوبی اور رونق میں اضافہ ہو جاتا
ہمیں امید ہے کہ مؤلف کے تیار کردہ سلسلوں سے طلبہ کا بہت زیادہ فائدہ ہوگا، اور فارسی کے اس
پرانے نصاب کے پڑھنے پڑھانے سے طلبہ اور اساتذہ کی طبیعتیں جو اکتا گئی ہیں، اس جدید
سلسلے کے رواج پا جانیکے باعث ان میں شوق و دلچسپی پیدا ہوگی ۔

(حیدرآباد ٹیچر)

یہ کتاب جناب ابوالمحاسن صاحب متین کی ایک گراں قدر تالیف ہے اس میں ایسے
طریق اور اسلوب بیان کئے گئے ہیں کہ بچے نسبتاً کم وقت میں معمولی محنت و توجہ سے فارسی سیکھ سکتے
ہیں۔ اس میں گو کتاب مختصر ہے مگر ہے نہایت مفید۔ ہمیں اس کتاب کے پیش کردہ اسلوب اور
طریقے بہت پسند آئے ہیں ۔

ضخامت (۶۴) صفحے ۔ طباعت کتابت پاکیزہ ۔ قیمت (۶/) (منادی دہلی)

مؤلفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔ اے پی۔ ایچ ڈی۔ (لندن)

نگار لکھنؤ کی رائے

ہر زبان کی ترقی کے تین دور ہوا کرتے ہیں پہلا دور تراجم کا، دوسرا تالیفات کا، تیسرا تصانیف کا۔ اس میں کلام نہیں کہ اردو زبان پہلے دور سے گزر کر دوسرے دور میں آگئی ہے اور اگر ہم سرزمین دکن کی علم پرور فضا کے کارناموں پر نگاہ ڈالیں تو کہا جا سکتا ہے کہ شاید اس نے تیسرے دور میں بھی قدم رکھ دیا ہے۔

اس دوران میں اردو کی جو خدمت اپنی بیش بہا تصانیف و تالیفات سے فرزندان دکن نے کی ہے۔ وہ ایسی معمولی نہیں ہے کہ کوئی شخص اسے نظر انداز کر دے۔ یقیناً حیدر آباد اس وقت حالت نہفت (RENAINANES) میں ہے اور اس کے یہ مختلف دلچسپ مناظر ہیں کہ ایک طرف عثمانیہ یونیورسٹی نشر علم میں نمایاں حصہ لے رہی ہے اور دوسری طرف وہاں کے طلبہ عملاً ملک و زبان کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری جو حال میں لسانیات کی تحقیقات سے فارغ ہو کر ولایت سے واپس آئے ہیں معروف و مقتدر نوجوانان دکن میں سے ہیں اور اردو شہ پاروں کی پہلی جلد انھیں کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں اردو ادب کے آغاز سے دلی کے اب تک جتنے مشہور شعرا و نثر نگار ہوئے ہیں انکے حالات اور ان کے کلام نظم و نثر کے بہترین نمونے دئے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اردو ادب کی ابتدائی حالت پر نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں بیجاپور، تیسرے میں گولکنڈہ اور چوتھے میں عہد مغلیہ کے اردو ادب سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد شہ پاروں کا انتخاب ہے۔ اس کتاب کے ضمیمے بعض نہایت بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہیں اس میں علی عادل شاہ، سید شاہ راجو، ابو الحسن تانا شاہ، محمد قلی قطب شاہ، عبد اللہ قطب شاہ، غواصی اور ابن نشاطی کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ کتاب ولایتی کھردرے کاغذ پر مجلد شایع کی گئی ہے اور صوری و معنوی دونوں حیثیت سے عہد حاضر کی بہترین تالیفات میں جگہ پانے کے قابل ہے۔

ضخامت (۳۶۲ صفحے) اعلیٰ درجہ کا کاغذ، کتابت، طباعت، قیمت (۱۲/ ے)

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔

مجلّہ مکتبہ
کی
خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبۂ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہوسکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنیوالے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب اعلانِ بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسید بنام مجلہ مکتبہ پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی آدمی مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔